مجلّہ

ترجمانُ الاسلام

جَامِعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس

مجلہ

ترجمان الاسلام

(۲۸) (۲۹)

اکتوبر ۱۹۹۶ء تا مارچ

مؤرخ اسلام

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نمبر

سرپرست

عالیجناب محترم حافظ عبدالکبیر صاحب

مدیر اعلیٰ
ابوالقاسم نعمانی

مدیر
اسیر ادروی

شعبۂ نشر و اشاعت

جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس ۲۲۱۰۱۰

فون - ۳۲۲۱۸۴

فہرست مضامین

مورخ اسلام نمبر ———— ۳۰/ روپے
زر سالانہ ———— ۶۰/ روپے
معاون خصوصی ———— ۱۰۰/ روپے

کتبہ: شمس الحسن محلہ کوٹ ادری — سرفراز آفسیٹ پریس، مئو

سخنہائے گفتنی

من قماش فروش دلِ صد پارۂ خویشم

خطۂ اعظم گڈھ سے متعدد تاریخ ساز شخصیتیں اٹھیں، ان کی انفرادیت ان کے امتیاز کو علمی دنیا نے تسلیم کیا، وہ آسمان شہرت پر نیر اعظم بن کر چمکے، ان کی روشنی دور دور تک پہونچی مگر طلوع کے ساتھ غروب بھی قانونِ قدرت ہے۔

لم یرقرن الشمس فی شرقہ

فشکت الا نفس فی غربہ

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک سنہری کڑی تھے، جو ۱۴؍جولائی ۱۹۹۶ء کو ۱۰ بجے شب میں ہم سے رخصت ہو گئے اور ۱۵؍جولائی ۲ بجے دن سے ایک باغ کے ایک گھنے پیڑ کے سایہ تلے ابدی نیند سو رہے ہیں۔

اناللہ وانا الیہ راجعون

حضرت انس خادم رسول صلے اللہ علیہ وسلم جب حضورؐ کی تدفین کے بعد واپس آئے تو حضرت فاطمہؓ نے کس درد سے پوچھا، انس! تمہارے دل نے کیسے گوارا کیا کہ حضورؐ کے جسم اطہر پر مٹی ڈالی؟ اس سوال میں درد و کرب کی ایک دنیا پوشیدہ ہے، اس سے حضرت فاطمہؓ کی روح فرسا کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے جب ہم نے اپنے ہاتھوں سے قاضی صاحب کی قبر پر مٹی ڈالی تو عملی طور پر اس وقت اس روایت کا صحیح مفہوم سمجھ میں آیا، اللہ ان کی قبر کو رحمت کے پھولوں سے

بھر دے اور جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے۔

قاضی صاحب دورِ حاضر میں اپنے مخصوص موضوع پر اتھارٹی کی حیثیت رکھتے تھے ان کی ہر بات سند تھی، اہل علم میں فراخدلانہ اعتراف کا جذبہ اگر ہے تو ان میں سے کوئی قاضی صاحب کے اس بلند علمی مقام سے انکار نہیں کر سکتا۔

اب تک ہمارے ملک میں عرب و ہند تعلقات کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ جغرافیائی لحاظ سے دو ملکوں کے درمیان پائے جانے والے تعلقات و روابط کو پیش کرتی ہیں، قاضی صاحب کی کتابوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس موضوع میں تقدس و پاکیزگی کے عنصر کا اضافہ کرتی ہیں، وہ دراصل اسلام کے ہندوستان میں نفوذ کے ابتدائی دور کی علمی، تہذیبی و تمدنی تاریخ ہے ہندوستان کی سرزمین نے کس طرح اپنے ان نئے آنے والے مہمانوں کا استقبال کیا؟ اپنی آغوشِ محبت کھولی اور ان کی پذیرائی کی؟ اور عہد بہ عہد غیر محسوس طور پر اسلامی تہذیب و تمدن سے کس طرح متاثر ہوتی رہی اور خود اسلام کا پیغام لانے والے یہاں کے حالات سے کس حد تک متاثر ہوتے رہے، ذہنی و فکری رجحانات و میلانات کا یہ تبادلہ صدیوں پر محیط ہے یہی تاثیر و تاثر دونوں ملکوں کے درمیان قدیم روابط میں نئے روابط کا اضافہ کرتے رہے، قاضی صاحب نے ان روابط کے مختلف عہد قرار دیئے اور ہر عہد پہ ان کی ایک مستقل کتاب ہے مثلاً عرب و ہند عہد رسالت میں، خلافتِ راشدہ اور ہندوستان، عہد بنو امیہ اور ہندوستان، عہد عباسیہ اور ہندوستان، اس طرح انھوں نے ہر دور میں جن روابط کا اضافہ ہوا اس کی نشاندہی فرمائی، یہ بہت باریک بینی اور دقیقہ رسی کا کام ہے، یہی مشکل کام قاضی صاحب نے انجام دے کر اپنی انفرادیت و امتیاز کو برقرار رکھا۔

اسلامی ہند کی تاریخ میں اپنا بلند مقام بنایا ۔

قاضی صاحب نے اپنے علمی سفر کا آغاز کتنی ذہنی و فکری الجھنوں میں کیا ؟ ان کے پیروں میں فکر معاش و معیشت کی کتنی بیڑیاں تھیں، گھریلو ماحول کی کتنی خارزار وادیاں راہ میں حائل تھیں ؟ پھر کس طرح تیز و تند ہوا میں عزم و عمل کا چراغ جلائے رکھا اور اس کو بجھنے نہیں دیا، پھر ایک ایک کر کے کس طرح ان کے پاؤں کی بیڑیاں کٹتی اور ٹوٹتی گئیں ؟ یہ ایک طویل داستان ہے جو انھوں نے انتہائی اختصار کے ساتھ اپنی خود نوشت آپ بیتی میں لکھی ہے، راہ کی ان مشکلات اور دشواریوں پر نظر جاتی ہے جو قاضی صاحب کو درپیش تھیں اور پھر کس طرح ان پر فتح پائی ؟ جب اس داستان کو پڑھئے تو حیرت ہوتی ہے اور دل میں یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ کہ انسان کسی نصب العین کا عزم بالجزم کرلے اور پوری استقامت کیساتھ جدوجہد کے میدان میں اتر پڑے تو قدرت اس کو کامیابی کی منزل تک پہونچ جانے کی توفیق عطا کرتی ہے، قاضی صاحب کی جدوجہد کی تفصیل اور اس بلند مقام پر پہونچنے کی داستان سبق آموز بھی ہے اور مایوس دلوں میں اُمنگ اور حوصلہ پیدا کرتی ہے ۔

قاضی صاحب نے اپنے علمی سفر میں وہ راہ اختیار کی جسمیں کم سے کم نشانات قدم پائے جائیں، ان کا ذہن نئے نئے موضوعات سوچتا رہتا تھا ان کے آخری دور کی دو کتابیں بھی اچھوتے موضوع پر ہیں۔ خیرالقرون کی درسگاہیں،، اور ،، تدوین سیر و مغازی ،، اپنے اپنے موضوع پر اہم ترین کتابیں ہیں، ان کتابوں کی ترتیب میں جس وسعتِ مطالعہ اور تاریخ و سیر

کی کتابوں پر گہری نظر کی ضرورت ہے اہل علم اس کو سمجھ سکتے ہیں۔

تدوین سیر و مغازی، تو اپنے موضوع پر اردو زبان میں پہلی کتاب ہے، کسی فن کی ایجاد ایک تدریجی عمل ہے، جب اس کی بنیاد پڑتی ہے تو کوئی بھی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ ایک فن کا آغاز ہو رہا ہے، اس فن کے اجزا الگ الگ سیکڑوں کتابوں میں بکھرے ہوئے رہتے ہیں اسلئے فن کی ابتدائی کڑیوں کو تلاش کرنا اور انکو جوڑنا دقت طلب کام ہوتا ہے، فن سیر و مغازی مسلمانوں کا ایجاد کردہ ایک خاص فن ہے اور اساطین امت نے اس فن میں اہم ترین کتابیں لکھی ہیں اسلامی تہذیب و تمدن کی جڑیں اسی فن کی تفصیلات میں پیوست ہیں اس فن کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟ پھر تدریجی طور پر یہ فن باقاعدہ کب مرتب ہوا؟ اس دقیق ترین بحث کو قاضی صاحب نے اٹھایا ہے اور حق یہ ہے کہ اس کا سراغ لگانے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ہے، کتاب کے مطالعہ سے مصنف کی جد و جہد، مشکلات اور ان کی وسعت نظری کا پتہ چلتا ہے، یہ کتاب بھی قاضی صاحب کے شاہکاروں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔

قاضی صاحب نے ۴۰ سالوں تک ایک کنج عزلت میں بیٹھ کر اپنے تمام علمی و تحقیقی کارنامے انجام دیئے، جامع مسجد کی طرف جانے والی ایک تنگ سی ذیلی سڑک پر ایک پرانی خستہ عمارت دلق پوش فقیر کی طرح کھڑی ہے، اس کے داخلے کے دروازے میں قدم رکھئے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہاں دہلیز میں بدو وہیں ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں، لیکن زینہ سے اوپر چلے جائیں تو فضا کچھ بدل جاتی ہے زینہ دوسری منزل پر جہاں ختم ہوتا ہے ٹھیک سامنے ایک دروازہ ہے، یہی قاضی صاحب کے مرکز علمی کا دفتر ہے، اس

کمرے میں چند بوسیدہ اور خستہ چٹائیوں کا فرش ہے اور نشست کی جگہ ایک شکن آلودہ چادر بچھی ہوئی ہے، فرنیچر نام کی کوئی چیز یہاں نہیں تھی، نہ کرسی میز، نہ صوفہ سیٹ نہ الماری نہ فریج نہ کولر نہ ٹیبل فین نہ چائے کا سیٹ، بس ایک طالب علم کا کمرہ جس میں کوئی اہتمام اسلئے نہیں ہوتا ہے کہ یہاں قیام عارضی ہے، یہاں کی زندگی مسافرانہ ہے قاضی صاحب اس ویران اور خستہ کمرے میں ۴۰ سال رہے مگر کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل کی زندہ مثال بن کر رہے، مگر اس تمام بے سروسامانی کے باوجود کبھی احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ ان کی غیرت وخودداری، خودشناسی، عزت نفس کی تلوار کی دھار اور آبدار ہوتی چلی گئی اسی کلبۂ احزاں میں جب ڈاکیہ ہندوستان پاکستان مصر و حجاز کے نامور علماء و مشائخ کے خطوط لے کر آتا تو پتہ چلتا تھا کہ یہاں کوئی عظیم شخصیت مسافرانہ قیام پذیر ہے ان خطوط میں قاضی صاحب کے لئے اعزاز و احترام کے جو الفاظ استعمال ہوتے تھے یہ الفاظ فخر سے سر اونچا رکھنے کے لئے مجبور کرتے تھے احساس کمتری کا کیا سوال؟ خودی خودشناسی اور خودداری کا جذبہ اتنا توانا تھا کہ نئے ملنے والوں کو کبھی کبھی غرور کا دھوکہ ہوجاتا تھا جبکہ اس کا منحوس سایہ آپ پر کبھی نہیں پڑا۔

قاضی صاحب انتہائی وضعدار بزرگ تھے، جن لوگوں سے طالب علمی کے دور میں تعلقات تھے ان تعلقات کو انھوں نے زندگی بھر نبھایا، بہت سے گمنام اور معمولی لیاقت کے لوگ، ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں گذر بسر کرنیوالے خستہ حال جن سے کبھی قاضی صاحب کا تعارف تھا یا دوستانہ مراسم تھے ان کے گھروں پر جانا ملاقات کرنا، خیروعافیت معلوم کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے، وہ جب وطن آتے تو اطراف وجوانب کی بہت سی آبادیوں قصبوں

اور گاؤں میں متعارف لوگ یا احباب بھے ان تمام مقامات پر جاتے۔ گھنٹہ دو گھنٹے ان کے پاس گذارتے، شام ہوتے ہوتے راقم الحروف کے وطن اوری تشریف لاتے، ان کے آنے سے ہمارے گھر عید ہو جاتی تھی، شب میں ہمارے مدرسہ دارالسلام کے صحن میں پلنگوں اور چارپائیوں کی قطار لگ جاتی، اہل علم احباب کی محفل جمتی قاضی صاحب صدر مجلس ہوتے اپنے تجربات، مشاہدات، بیرون ملک کے اسفار کی دلچسپ روداد بیان کرتے، ہنسی مذاق، تفریحی جملے، ظریفانہ واقعات پر قہقہوں کا سلسلہ نصف شب تک چلتا رہتا، یہ مجلس اتنی دلچسپ اور نشاط انگیز ہوتی تھی کہ احباب سال بھر اس کے منتظر رہا کرتے تھے، قاضی صاحب اپنی کتابوں کے صفحات میں جتنے باوقار جتنے عظیم اور مرعوب کن نظر آتے ہیں وہ احباب کی مجلسوں میں ایک بے تکلف دوست سے زیادہ نظر نہیں آتے تھے، یہ ان کی عظمت اور بڑائی کی دلیل ہے، خواہ مخواہ دوسروں پر اپنے فضل و کمال کا رعب ڈالنا، بات بات میں اس کا مظاہرہ کرنا، بھویں چڑھا کر بات کرنی ان تمام لغویات اور مصنوعی زندگی سے وہ بالکل ناآشنا تھے، علمی مجلسوں میں کسی سے وہ مات کھانے والے نہیں تھے لیکن بے تکلف احباب کی محفل میں شرافت و اخلاق کا مجسمہ تعلی اور خودنمائی کا کہیں دور دور پتہ نہیں چلتا تھا۔

---

* پچھلے کئی برسوں سے انھوں نے بمبئی کی سکونت ترک کر دی تھی خیال یہ تھا کہ نصف صدی کی انتھک جدوجہد کے بعد زندگی کے کچھ ایام اپنے وطن میں سکون سے گذاریں گے، لیکن جس کی تقدیر قلم کے بجائے پرکار سے لکھی گئی ہو تو اس کا چکر کیسے ختم ہو سکتا ہے، دارالعلوم دیوبند میں شیخ الہند اکیڈمی

بہت دنوں سے قائم تھی لیکن اس کی سرگرمیاں بہت محدود تھیں ، ارباب دارالعلوم نے قاضی صاحب کو آمادہ کرنا چاہا کہ وہ دیوبند آ جائیں اور اکیڈمی میں اپنے ذوق و مزاج کے مطابق علمی سرگرمیاں پیدا کریں ۔ اور اس کو متحرک اور فعال بنائیں، قاضی صاحب غریب الوطنی اور مسافرت کی زندگی سے تھک چکے تھے اس لئے اکیڈمی سے باقاعدہ وابستہ ہونے سے انکار کردیا البتہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ وہ سال میں ایک دوبار دیوبند جاکر چند ہفتے قیام کریں گے ، مگر تنخواہ نہیں لیں گے ، ارباب دارالعلوم نے اسکو بھی غنیمت سمجھا اور جب تک ان میں سفر کرنے کی ہمت رہی پابندی سے دیوبند کا سال میں ایک دوبار سفر کرتے کچھ کم و بیش ایک ماہ وہاں قیام کرتے رہے ، شاید کچھ طلبہ بھی ان کے زیر تربیت رہتے تھے ، اسی دوران انھوں نے اپنے کئی مسودات مکمل کئے اور ان کی کئی کتابیں اکیڈمی سے شائع ہوئیں ، " تدوین سیر و مغازی " " خیر القرون کی درسگاہیں " اور ان کا نظام تعلیم و تربیت " ائمہ اربعہ " وغیرہ اسی عرصہ میں شائع ہوئیں ، اتفاق سے اکیڈمی ایک فعال کمیٹی کے سپرد کردی گئی جس نے نئی سرگرمیوں کا پورے حوصلے سے آغاز کیا ، نشر و اشاعت کی بڑے پیمانے پر داغ بیل ڈالی ، قاضی صاحب کا تعاون حوصلہ افزا ثابت ہوا اکیڈمی کی نشأۃ ثانیہ میں اور کئی اسباب کے علاوہ قاضی صاحب کی وابستگی کا بھی ایک حصہ تھا ۔

ادھر سال دو سال سے ان کو کئی عوارض لاحق تھے مگر بستر علالت پر کبھی نہیں رہے دوائیں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے اور پابندی سے استعمال کرتے ، عمر کے تقاضے سے اعضاء میں اضمحلال آتا جا رہا تھا ، جس ماہ سفر آخرت اختیار کیا وفات سے پندرہ دن پہلے مجھے لکھا :

"ناک کا آپریشن کرایا ہے، خون کا رستا بند نہیں ہوتا ہے جس کی
وجہ سے کمزوری بڑھتی جا رہی ہے، دوا چل رہی ہے، زندگی کے
دن پورے کر رہا ہوں"

خط کے لفظ لفظ سے یاس و نا اُمیدی، اندرونی کرب و اضطراب کا پتہ
چل رہا تھا، دل تڑپ اٹھا میں نے اسی دن قاضی صاحب کو لکھا :

"ہمارا سفینۂ حیات حالات اور وقت کی ہواؤں کے سہارے
چل رہا ہے، بادبان تار تار ہو چکا ہے، پتوار ہاتھ سے چھوٹ
چکا ہے، اس کا رُخ ان موجوں اور گردابوں کی طرف ہے جو
اس کو نگل جانے کیلئے تیار ہیں، کشتی کا رخ پھیر دینا ہمارے
حدود اختیار سے باہر ہے، جو بات ہمارے اختیار میں نہیں
اس کیلئے اظہار مایوسی کیا معنی؟ رضا بالقضا ہماری زندگی کی معراج
ہے، زندگی قدرت کا ایک انعام ہے اس کے ایک ایک لمحہ کی
شکر گذاری ہم پر واجب ہے خدا کرے آپ جلد صحت یاب ہو جائیں
اور آپ سے ملاقات کی جلد کوئی سبیل نکل جائے"

میرا خط انکو وفات سے تین چار دن قبل ملا، خط پڑھ کر جیب میں رکھ لیا، ابھی وہ شام
کو روزانہ اپنے مکان سے اپنے مستقر پر آتے جاتے تھے لیکن دو تین دنوں کے بعد وہ
بستر علالت پر لیٹے تو پھر اٹھ نہ سکے، اور ایسی گہری نیند آ گئی جس سے جاگنا ممکن
نہ رہا۔ ۸۰ برس کی طویل زندگی کی یہ مختصر سی کہانی ہے میں آج یہ غمناک کہانی
سنا رہا ہوں کل کوئی میری کہانی سنائیگا، یہی زندگی کا انجام ہے۔

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے؟ انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

یہ نمبر بہت مختصر ہے، لیکن ہمیں اس پر ندامت نہیں کیونکہ اس طرح کے نمبروں میں عام طور پر تقسیم موضوعات نہ ہونے کی وجہ سے سوائے تکرار کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا یہ تکرار ذہن پر انتہائی بار ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مشہور شخصیتیں اکثر بایوڈاٹا (مختصر حالات زندگی) لکھ کر رکھ لیتی ہیں کیونکہ کبھی کبھی اسکی ضرورت پیش آتی ہے اور جب اس شخصیت کی وفات ہو جاتی ہے تو اہل قلم اس کے ورثہ سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کے ورثہ وہی بایوڈاٹا کا فوٹو اسٹیٹ کرا کے سب کو بھیج دیتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مضمون نگار کا دائرہ معلومات محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور سب کچھ وہی لکھ کر رسالوں کو بھیج دیتے ہیں، قاضی صاحب کے معاملہ میں بھی صورت حال یہی تھی، مجبوراً ہمیں بہت سے مضامین کو خارج کرنا پڑا۔

پھر بھی قاضی صاحب کے علمی کارناموں، ان کے فکر و فن، ان کے بلند علمی و تحقیقی معیار کو جس شکل میں ہم پیش کرنا چاہتے تھے اس کی پوری جھلک اس مختصر شمارے میں ضرور نظر آجائے گی، یہی ہمارے لئے کافی تھا، آپ کو یہ نمبر کیسا لگا؟ اپنی رائے سے ہمیں ضرور مطلع فرمائیں اس سے ہم کو رہنمائی بھی ملے گی اور حوصلہ بھی۔

اسیر ادروی

حدیثِ یار

ہمہ گیر شہرت کے مالک، پاکستان کے جلیل القدر محقق عالم، انتہائی وسیع المطالعہ اسکالر، درجنوں اہم ترین علمی و تحقیقی کتابوں کے مصنف، جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی نے ایک بار اپنے رسالہ "البلاغ" کراچی میں لکھا تھا کہ:

"عراق کے ایک مشہور عالم پاکستان تشریف لائے اور جب کراچی آئے تو وہ میرے مہمان ہوئے، انھوں نے مجھے بتایا کہ میں متحدہ ہندوستان کی علمی و تہذیبی و اسلامی تاریخ پر تحقیق کر رہا ہوں، اسلامی ہند کی شخصیات، علماء و محدثین اور اعاظم رجال پر ایک کتاب مرتب کرنا چاہتا ہوں آپ اس سلسلے میں میری رہنمائی کریں اور ایسے مآخذ و مراجع کی نشاندہی کریں جو عربی زبان میں ہوں تاکہ میرے لئے استفادہ آسان ہو۔

میں نے ان سے کہا کہ پورے ہندوستان (بھارت پاکستان بنگلہ دیش) میں آپ کے معیاری کام کے لئے صرف دو کتابیں کارآمد ہیں، ایک مولانا عبدالحئی رائے بریلوی کی "نزہۃ الخواطر" دوسری مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کی کتاب "رجال السند والہند"

تیسری اور کوئی کتاب نہیں "

کسی زمانے میں عبد الرحمٰن بجنوری نے " دیوان غالب " کے ایک ایڈیشن پر مقدمہ لکھتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ ہندوستان میں آسمانی کتابیں دو ہیں۔ وید اور " دیوان غالب " مولانا عثمانی نے بھی اس عراقی عالم کو کچھ ایسا ہی جواب دیا کہ موجودہ دور میں علم وتحقیق کا جو بلند معیار قائم کیا گیا ہے اس معیار پر اُترنے والی اپنے موضوع پر یہی دو کتابیں ہیں، یہ بات قاضی صاحب کی زندگی میں کہی گئی، یہ ایک معاصر عالم کا بڑا فراخدلانہ اعتراف ہے جو مولانا عثمانی کی عالی ظرفی کا شاہکار بھی ہے اور قاضی صاحب کیلئے سند افتخار بھی۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس موضوع پر کتابیں نہیں لکھی گئیں، کتابیں لکھی گئیں اور درجنوں کتابیں لکھی گئیں، اولاً تو ان میں بیشتر اُردو زبان میں تھیں اور جو عربی زبان میں تھیں وہ آج کے دور میں علم وتحقیق کے ٹھوس معیار بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھیں ان میں سے کئی ایک کتابوں کے نام میرے ذہن میں ہیں مگر ان کے نام شمار کرانے سے کوئی فائدہ نہیں، قاضی صاحب کی کتاب علم وتحقیق کے کڑے سے کڑے معیار پر کھری اُترنے کی جو نکہ بھر پور صلاحیت رکھتی ہے اسلئے اسکو نظر انداز کرنا کسی بھی اہل علم کیلئے ممکن نہیں۔

فن تاریخ کا موضوع

ہندوستان کی تاریخ اور عرب وہند تعلقات در وابط پر اتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو ان سے کئی الماریاں بھر سکتی ہیں لیکن ان میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں سمجھی گئی جو اس عراقی عالم کے اخذ کردہ موضوع پر بہترین رہنمائی کر سکتی ہو۔

بات یہ ہے کہ تاریخ شاہی وقائع نگاروں کے جمع کردہ واقعات کے انبار ہی کا نام نہیں، بادشاہوں کی لشکرکشی و فتوحات، شکست و پسپائی

کی داستانوں ہی کو تاریخ کا موضوع سمجھنا اس فن کی افادیت کو محدود کر دینا ہے، تاریخ قوموں کی تہذیبی و تمدنی سفر کی روداد بھی ہوتی ہے آج کا مورخ و محقق واقعات کے پس منظر میں ان عوامل کو تلاش کرتا ہے جو قوموں کے عروج و زوال میں سب سے اہم کردار انجام دیتے ہیں ایک محقق مورخ کا سب سے دلچسپ سب سے دقیق اور سب سے اہم موضوع انھیں عوامل کی تلاش ہوتی ہے، داستان سرائی کرنے والے قصہ گو مورخوں کے بس کا یہ کام نہیں یہ مشکل کام سید سلیمان ندوی کر سکتے ہیں یا قاضی اطہر مبارک پوری۔

مولانا عثمانی نے عراقی عالم سے قاضی صاحب کی صرف ایک عربی کتاب کا نام بتایا اگر وہ عراقی عالم اردو زبان سے واقف ہوتے تو قاضی صاحب کی آدھے درجن سے زائد کتابیں ان کی مکمل رہنمائی کے لئے موجود تھیں جن کی مولانا عثمانی نشاندہی فرما سکتے تھے۔

قاضی صاحب کی کتابوں کا امتیازی وصف

اب تک ہندوستان کی تاریخ کے اس پہلو پر جتنی کتابیں لکھی گئیں ان میں صرف جغرافیائی حیثیت سے دو الگ الگ ملک عرب اور ہندوستان کے تعلقات و روابط کو منظر عام پر لایا گیا ہے، قاضی صاحب کی ذہنی اُپج یہ ہے کہ انھوں نے ان روابط میں تقدس و پاکیزگی کے عنصر کا اضافہ کر دیا ہندوستان میں اسلام کے ابتدائی نفوذ کے عہد کی نشاندہی اسلامی تہذیب و تمدن کے اولیں دور کی عکاسی اور منظر کشی، ان کی گم شدہ کڑیوں کی بازیافت کو زیادہ اہمیت دی ہے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ان تعلقات و روابط کے الگ الگ دور قائم کئے ہیں، اور ہر عہد پر انکی ایک مستقل کتاب ہے مثلاً عہد رسالت میں ہندوستان سے تعلقات، خلافتِ

راشدہ کے زمانہ میں روابط پھر بنو اُمیہ کے دورِ حکومت میں اور پھر بنو عباس کے عہد خلافت میں عرب و ہند کے تعلقات و روابط کیا تھے ان پر روشنی ڈالی گئی ہے، ہر عہد پر انکی الگ الگ کتابیں ہیں، اپنے موضوع سے ربط پیدا کرنے کے لئے انھوں نے قبل از اسلام کی تاریخ کو بھی قدیم مآخذ سے پیش کیا ہے اور جب عہد رسالت کا آغاز ہوتا ہے تو ان کا قلم ابر گہربار بن جاتا ہے سرکار رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم سے نسبت رکھنے والی ہر بات کو موتیوں سے زیادہ قیمتی سمجھ کر تاریخ و احادیث کے صفحات سے چن کر سامنے رکھ دیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان باتوں سے پوری ملتِ اسلامیہ کو جذباتی تعلق ہے، جب ان حقائق کو صحیح الفکر ذہن و مزاج کا مسلمان پڑھتا ہے تو اسکی ذہنی فضا میں نورانی کرنوں کی چکاچوند پیدا ہو جاتی ہے اور وہ کیفیت و سرور اور نشاط و انبساط کی گلپوشش اور معطر وادیوں میں پہونچ جاتا ہے، یہ وہ پاکیزہ جذبہ ہے جو ساری دنیا کے مسلمانوں میں مشترک ہے، حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور ان کے جاں نثاروں کی طرف منسوب ہونے والی ہر بات متاعِ ایمان اور سرمایۂ حیات بن جاتی ہے۔

عالمِ اسلام میں مقبولیت

یہی وجہ ہے کہ جب قاضی صاحب کی کتابوں کی شہرت ہندوستان سے چل کر حجاز سے ہوتے ہوئے مصر تک پہونچی تو اختلاف زبان نے جو دشواریاں پیدا کیں اہل علم نے ان پر فتح حاصل کرنے کی کوششوں کا آغاز کر دیا، قاضی صاحب کی شاہکار کتابیں زیادہ تر اُردو میں ہیں لیکن یہ کتابیں جس موضوع اور جن معلومات پر مشتمل ہیں ان کا تعلق عالم اسلام سے ہے اسلئے یہ کتابیں ہندو پاک ہی نہیں عالم اسلام کا ورثہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام کا کوئی محقق عالم جو اُردو زبان سے ذرا بھی واقف ہے اس نے قاضی صاحب کی

کتابوں کا مطالعہ کیا تو اس نے ایسا محسوس کیا کہ اسکو اپنی متاع گم شدہ ہاتھ آگئی، آباء و اجداد کا مدفون خزانہ اس کو مل گیا، اس نے دیکھا کہ عربی زبان کا دامن ان جواہرات سے خالی ہے جن سے یہ کتابیں بھری ہیں تو اس نے پہلی فرصت میں ان کو اردو سے عربی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔

مصری عالم کے ذریعہ عربی میں ترجمہ

مصر اسلامی علوم و فنون کا ہمیشہ ایک قابل اعتماد مرکز رہا، وہاں کے علماء نے پورے عالم اسلام کو متاثر کیا اور حیرتناک علمی کارنامے انجام دیئے ہیں اور آج تک علمی دنیا مصری علماء کے احسانات سے زیربار ہے اور جب تک دنیا قائم رہے گی مصر کے اہل علم کے احسانات سے علمی دنیا سبکدوش نہیں ہوسکتی، اسی مصر کے ایک جلیل القدر عالم شیخ عبدالعزیز عزت نے جب قاضی صاحب کی بعض کتابوں کا مطالعہ کیا تو ان کے حیرت و استعجاب کی حد نہیں رہی کہ آج تک مورخین کی نگاہوں سے یہ جواہر پارے کیوں پوشیدہ رہے جو ان کتابوں میں موجود ہیں، ان کے ذہنی افق پر حقائق و معارف کا ایک نیا آفتاب طلوع ہوگیا، اتنی مختصر کتابیں اور اتنی قیمتی معلومات سے مملو، جیسے کسی ماہر فن نے گراں بہا جواہرات کو پرکھ کر، جانچ کر اور ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کرکے کتاب کے صفحات میں بھر دیئے ہیں، اس شدید تاثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے از خود قاضی صاحب کی دو کتابوں "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" اور "عرب و ہند عہد رسالت میں" کو اردو سے عربی میں منتقل کیا اور اسی وقت پریس میں دیدیا وہ بہت جلد طبع ہوکر مصر و حجاز میں عام ہوگئیں۔

قاضی صاحب کا انداز تحریر

قاضی صاحب کا قلم بڑا محتاط تھا غیر ضروری بسط و تفصیل قاضی صاحب کے مزاج کے خلاف تھی، طول کلام جسکی افادیت بہت محدود ہوتی ہے اس سے وہ ہمیشہ محترز رہے، وہ الفاظ کا انبار جمع کرنے کے بجائے حقائق و معارف کے موتی چننے کے قائل تھے، وہ کوئی ساون بھادوں کی گھٹا نہیں تھی کہ جھومتی ہوئی آئی اور موسلا دھار برس کر رخصت ہوگئی اس کا پانی زمین پر پھیلا، بڑھا، اس کی بہت تھوڑی مقدار سے کھیتوں نے اپنی پیاس بجھائی، بقیہ سارا پانی نالیوں نالوں ندیوں اور دریاؤں کے راستے خلیج بنگال میں جاکر گم ہوگیا۔

قاضی صاحب کا قلم ابر نیساں تھا جس کے ایک ایک قطرے کے لئے صدف کا منہ کھلا رہتا ہے اور جب ایک قطرہ بھی مل گیا تو اس کو بیش قیمت امانت کی طرح اپنے سینہ سے لگا کر رکھ لیا، وہی قطرہ جب صدف کے سینہ سے باہر آتا ہے تو وہ دُر شہوار بن کر آتا ہے جو تاجداروں کے تاج میں جگہ پاتا ہے۔

میں اس کی شہادت میں قاضی صاحب کی ایک درجن کے قریب کتابوں کو بلا تکلف پیش کر سکتا ہوں کہ مملکت علم و تحقیق کے تاجداروں نے اس سے اپنے علم و تحقیق کے تاج کی زینت بڑھائی۔

محسن سندھ کا خطاب

قاضی صاحب ایک سیمینار کے سلسلے میں پاکستان گئے تو پاکستان کی کئی یونیورسٹیوں کے ممتاز دانشوروں نے قاضی صاحب کے اعزاز میں ایک پُرشکوہ تقریب کا انعقاد کیا جس میں خصوصیت کے ساتھ متعدد یونیورسٹیوں کے ممتاز دانشوروں کو مدعو کیا گیا تھا، قاضی صاحب چیف گیسٹ

کی معزز کرسی پر تشریف فرما تے، کئی ممتاز دانشوروں نے قاضی صاحب کے
علم و فن پر روشنی ڈالی ان کی عظیم الشان خدمات کو سراہا اور قاضی صاحب
کی ان کتابوں کے حوالے سے بات کی جن میں سندھ کے ابتدائی عہد اسلامی
کی روشن اور تابناک تاریخ تھی تقریب کی صدارت وزیر اعلیٰ سندھ نے
کی گومل یونیورسٹی کے چانسلر پروفیسر زی شان خٹک نے اپنی افتتاحی
تقریر میں قاضی صاحب کی علمی فتوحات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کو شاندار
لفظوں میں خراج عقیدت پیش کیا، انھوں نے کہا کہ مہمان محترم حضرت
قاضی صاحب نے ہم کو ہماری تاریخ سے روشناس کرا کے ہمارے سر کو
فخر سے اونچا کر دیا، ہم اب تک تاریخ کی بھول بھلیوں میں گم تھے، ہمارا شاندار
ماضی ہماری نگاہوں سے اوجھل تھا، ہم خود اپنی اور اپنے علاقہ کی تاریخ
اس کی قدر و قیمت اور مقام و مرتبہ سے ناآشنا تھے، قاضی صاحب نے
ہماری شناخت بنائی ہم کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں کھڑا کر دیا، انھوں
نے اہل سندھ پر یہ اتنا بڑا احسان کیا کہ ہمارا سر عقیدت و احترام کی وجہ
سے ان کے سامنے خم ہے، ہم اس احسان کا بدلہ نہیں دے سکتے، ہمارے
پاس الفاظ نہیں کہ اس احسان کا شکریہ ادا کر سکیں۔ سوائے اس کے کہ پورے
خلوص اور دل کی گہرائیوں سے ہم نے آپ کو "محسن سندھ" تسلیم کر لیا ہے
ہم کو اس اعتراف پر فخر ہے، ناز ہے، ہم آپ کے اس احسان کا ہمیشہ
صدق دلی سے اعتراف کرتے رہیں گے، ہم آپ کی کتابوں کی قدر و قیمت
سے آگاہ ہو چکے ہیں، ہماری دلی تمنا ہے کہ یہ ساری کتابیں ہم سندھی زبان
میں شائع کر کے سندھ کے عوام تک پہونچائیں اور ان کو بتائیں کہ تمہارے
آباو اجداد کیا تھے؟ تمہارا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ ہم آخر میں مہمان خصوصی سے
درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے ان افادات کو عام کرنے کے خیال سے ہمیں

ان کتابوں کو سندھی میں ترجمہ کرکے شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔

قاضی صاحب کو اپنی کتابوں سے جلب منفعت کا تصور کبھی نہیں آیا وہ تو اپنی علمی جدوجہد کے ثمرات کو عام کرنے اور ان سے استفادہ کرنے والوں کے دائرے کو وسیع کرنے میں دلی و روحانی مسرت محسوس کرتے تھے۔ اس لئے بلا کسی رائلٹی اور معاوضہ کے اس تنظیم کو ترجمہ اور اشاعت کی اجازت دیدی جو خاص اسی مقصد کے لیے "تنظیم فکر و نظر سندھ" کے نام سے تشکیل دی گئی تھی کچھ عرصہ بعد قاضی صاحب کی آدھے درجن کتابوں کے سندھی زبان میں ترجمے ہوئے اور شائع ہوئے ان کی اشاعت پورے پاکستان میں ہوئی اور علمی حلقوں میں یہ کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔

تصانیف کا علمی وزن

مجھے معلوم ہوا کہ کچھ مصنفین پابندی کے ساتھ متعینہ صفحات روزانہ لکھا کرتے تھے، بعض کثیر التصانیف مصنفین کے سلسلے میں یہ خبر ہے کہ وہ کسی طالب علم کو بٹھا کر زبانی املا کراتے تھے۔ تصنیف و تالیف کے اس آسان طریقۂ عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند مہینوں میں کتاب مکمل ہو کر پریس سے باہر آجاتی ہے اس طرح ان مصنفین نے بہت کم مدت میں تصانیف کا انبار لگا دیا۔

اس کے برعکس قاضی صاحب مہینوں جدوجہد کے چراغ میں اپنا خون جلا کر صرف چند صفحات ہی لکھ سکتے تھے، ان کی کتابیں عوام کیلئے نہیں خواص کے لیے تھیں ان کے پیش نظر اور مخاطب اہل فکر و نظر، علماء اور محققین کی جماعت تھی اسلئے ان کا معیار علم و تحقیق اتنا بلند تھا کہ زود نویس مصنفین کی نگاہ اس بلندی تک پہونچ ہی نہیں سکتی تھی، سستی شہرت حاصل کرکے عوام میں مقبولیت کا حصول قاضی صاحب کے پیش نظر کبھی نہیں رہا، قاضی صاحب کا کام پہاڑ کی چٹانوں کو کاٹ کر اپنی عظمتوں کا اہرام کھڑا کرنا نہیں تھا بلکہ

وہ سخت چٹانوں کا کلیجہ چیر کر لعل و جواہر نکال لینے کے قائل تھے، یہ محنت طلب اور دیر طلب کام تھا اس کے لئے تیشۂ فرہاد کی ضرورت تھی، خسرو پرویز کے شاہی فرمان کی نہیں، یہی وجہ ہے کہ سہل انگار مصنفوں کی درجنوں تصانیف پر قاضی صاحب کی ایک ایک تصنیف بھاری تھی، ان کی ایک کتاب کئی کئی برسوں میں پایۂ تکمیل کو پہونچتی تھی۔ قاضی صاحب لال قلعہ نہیں تاج محل بنانے کے قائل تھے، یہ صحیح ہے کہ لال قلعہ کی بلند و بالا فصیلوں کا جاہ و جلال، شان و شکوہ سیاحوں کے دل و دماغ پر مرعوبیت طاری کر دیتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تاج محل کا حسن و جمال اور قدر و قیمت اپنا جواب آپ ہے، سیاح اس کے نقش و نگار اس کی صناعی و فنکاری اس کے قیمتی جڑے ہوئے ہیرے اور جواہرات کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے، کیف و انبساط کی جو دولت اس کو حاصل ہوتی ہے اس کی قدر و قیمت کو بہتر طور پر وہی سمجھتا ہے۔

قاضی صاحب کی تصانیف کا حال کچھ ایسا ہی ہے وہ اپنی کتابوں کو رطب و یابس تفصیلات سے ضخیم اور بھاری بھرکم بنانے کے قائل نہیں تھے، ان کی حیثیت مرصع ساز کی تھی وہ لعل و زمرد اور یاقوت و جواہر کو تراش کر نگینہ کی طرح جڑتے تھے جو لوگ ان کی قدر و قیمت کو جانتے پہچانتے تھے وہ اس کی طرف لپکتے تھے اور ظاہر ہے کہ جوہر کی قدر جوہری جانتا ہے اگر کوئی اہل علم قاضی صاحب کے فن کی عظمت سے ناواقفیت کا اظہار کرتا ہے تو وہ اپنی کم علمی کا راز فاش کرتا ہے، جواہرات کی قدر و قیمت میں اسکی لاعلمی کی وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

رجال السند والہند کا مصری ایڈیشن

قاضی صاحب کی عربی تصنیف رجال السند والہند

جب مرتب ہوئی تو ان کو کوئی ناشر نہیں ملا کیونکہ قاضی صاحب ابھی ادبی علمی طبقہ میں کچھ زیادہ روشناس نہیں تھے، بمبئی میں قیام تھا، وہاں عربی کتابوں کا ایک ناشر تھا قاضی صاحب کا اس سے تعارف بھی تھا مگر کوئی بھی ناشر غیر مشہور مصنف کی کسی ضخیم کتاب کی اشاعت پر اسلئے نہیں آمادہ ہوتا کہ اولاً تو اس پر ایک خطیر رقم صرف ہوگی دوسرے کتاب کی فروخت کا کوئی بھروسہ نہیں کہ ایک ایڈیشن کتنے دنوں میں ختم ہوگا، اس لیے قاضی صاحب نے کچھ اپنے ذرائع سے اور کچھ اس ناشر کے تعاون سے ٹائپ میں ہندوستانی پریس سے کتاب کو طبع کرایا لیکن کتاب عربی میں تھی اور ضخیم بھی اسلئے بہت سست رفتاری سے کتاب نکل رہی تھی، ہندوستان میں خود اُردو کتابوں کی اشاعت بہت زیادہ حوصلہ افزا نہیں خاص طور سے جب وہ کتاب خالص علمی اور تحقیقی ہو، یہ ایڈیشن کتب خانوں میں برسوں پڑا رہا، اس دوران قاضی صاحب کی چھ سات کتابیں ندوۃ المصنفین دہلی جیسے مشہور و معتمد ادارہ سے شائع ہو کر ہند و پاک میں قبولیت حاصل کرچکی تھیں، ہند و پاک کے دانشور طبقہ نے ان کتابوں کی قدر و قیمت کو جانا اور سراہا، اخبارات و رسائل نے ان کتابوں کے بارے میں شاندار تبصرے لکھے۔

اب قاضی صاحب کی علمی شہرت عروج پر آچکی تھی، دوسرے معاشی کشمکش سے بھی وہ بڑی حد تک نجات حاصل کر چکے تھے اسلئے انھوں نے سفرِ حج کے ساتھ اسلامی ملکوں کی سیاحت ان کے کتب خانوں سے استفادہ اور مشہور اہل علم سے ملاقات کا پروگرام بنایا، اسی دورے میں آپ قاہرہ گئے، مقصد یہ تھا کہ "رجال السند والہند" کا اضافہ شدہ جدید ایڈیشن اعلیٰ معیار پر طبع کرائیں، اب ان کو حجاز کے ایک بہت بڑے

تاجر کتب کا تعاون بھی مل گیا تھا اس لئے کتاب کا نیا ایڈیشن بڑی آب و تاب کے ساتھ قاہرہ سے شائع ہو گیا، کتاب کا بڑا ذخیرہ تو حجاز آ گیا جہاں سے عالم اسلام میں پھیل گیا، اور قاہرہ کے کتب خانوں سے یورپ اور امریکہ کی دانشگاہوں تک پہونچ گیا اسی کے ساتھ قاضی صاحب کی دوسری کتاب "العقد الثمین فیمن ورد فی الهند من الصحابة والتابعین" کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہو کر اسلامی ممالک کے دانشکدوں میں پہنچ گیا۔

ملک و بیرون ملک کے ممتاز دانشوروں سے روابط

تیسری یا چوتھی بار قاضی صاحب نے جب حجاز کا سفر کیا اور زیارت حرمین سے فراغت حاصل کر لی تو حجاز کی سربرآوردہ علمی شخصیتوں سے ملاقات کا پروگرام بنایا اس سلسلہ میں انھوں نے صحافیوں ادیبوں، اخبارات و رسائل کے مدیروں، مہاجر علماء و مشائخ اور متعدد جامعات کے جلیل القدر اساتذہ سے معاصرانہ ملاقاتیں کیں باہمی تعارف کے بعد اپنی اپنی تصانیف کا تبادلہ کیا متعدد ممتاز علماء کی قیامگاہوں پر عشائیہ پر مدعو کئے گئے جہاں دوسرے اہل علم سے بھی ملاقات اور تعارف ہوا، پھر یہ روابط ان میں سے اکثر علماء و مشائخ کے ساتھ قاضی صاحب سے تادم اخیر قائم رہے ایک دوسرے کو خطوط لکھے گئے، مصر و حجاز کے کئی علماء و مصنفین سے ان کی برابر خط و کتابت رہی، ہند و پاک کے اکثر مشاہیر علماء سے ان کی مراسلت جاری تھی، آج بھی ان اکابر کے خطوط کا بہت بڑا ذخیرہ قاضی صاحب کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے قاضی صاحب کے علمی مقام و مرتبہ کو کتنا بلند سمجھا اور ان کی عظمت کا وہ کس طرح اعتراف کرتے رہے۔

قاہرہ (مصر) میں فضیلۃ الاستاد عبدالمنعم النمر، شیخ صلاح
ابو اسمٰعیل مقری، ڈاکٹر عبدالعزیز عزت سے ملاقاتیں رہیں، آخرالذکر
نے قاضی صاحب کی دو کتابوں کو اردو سے عربی میں منتقل کرکے شائع کیا،
حجاز میں مشہور صحافی عبدالقدوس انصاری مدیر المنہل، مورخ الجزیرہ
استاد احمد الجاسر، فضیلۃ الشیخ عبدالفتاح ابوغدہ یہ وہ حضرات ہیں
جو اپنے اپنے علم و فن میں اسلامی دنیا میں اہم مقام رکھتے ہیں، قاضی صاحب
کی ان سے معاصرانہ ملاقاتیں، تصانیف کا تبادلہ اور بعد میں مراسلت کا
سلسلہ بتاتا ہے کہ قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری

ہند و پاک کے متعدد مشاہیر اہل علم سے ان کی مراسلت تھی جن کے
خطوط قاضی صاحب کی فائلوں میں نظر آتے ہیں ان میں پروفیسر خلیق احمد
نظامی علی گڑھ یونیورسٹی، پروفیسر نذیر احمد دہلی، مولانا حبیب ریحان ازہری
تاج المساجد بھوپال مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی کلکتہ یونیورسٹی، شیخ
محمد خلیل ادارۃ المعارف النعمانیہ حیدرآباد، مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی
مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر محمد سلیم پاکستان، شاعر مزدور احسان
دانش لاہور وغیرہ کے خطوط بڑی تعداد میں ہیں۔

جہد مسلسل کی ابتدائی داستان

قاضی صاحب آج جس بلند مقام پر نظر آتے ہیں
ان کے طالب علمی کے دور میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، عربی
مدارس کے طلبہ جس ماحول میں اپنی تعلیمی زندگی گذارتے ہیں ان کی علمی ترقی
ان کے ذہن و فکر میں وسعت پیدا کرنے میں اس کا کوئی رول نہیں ہوتا
بس اسباق میں حاضری ایک خاص طرح کا لباس ان کی سعادتمندی کی سب
سے بڑی سند ہوتی ہے، دنیا میں کیا ہو رہا ہے، جس دنیا کی وہ تعلیم

حاصل کر رہے ہیں اس پر کیا گذر رہی ہے ؟ اسلام اور مسلمانوں کو کن چیلنجوں کا سامنا ہے، فراغت کے بعد وقت کے تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کیلئے کن صلاحیتوں کی ضرورت ہے ؟ ان تمام باتوں سے ان کا ذہن خالی ہوتا ہے، دینی مدارس کے اساتذہ اور ارباب انتظام بھی اس صورت حال کو برقرار رکھنے میں کلیدی رُول ادا کرتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عربی مدارس سے جب طلبہ سند فراغت لیکر باہر آتے ہیں تو ان کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے، اور دس بارہ سال کی تعلیمی زندگی کی انتھک محنت بھی ان کو رائیگاں نظر آتی ہے، کسی گاؤں دیہات کے مکتب میں معلمی تلاش کرتے ہیں، بڑے مدارس میں فرائض تدریس ادا کرنے کی ان میں ہمت نہیں ہوتی، اسٹیج پر کھڑے ہونے کے لئے علم و مطالعہ اور معلومات چاہئے وہ ان سے محروم ہیں کیوں کہ درسی کتابوں کے علاوہ خالی اوقات میں بھی دوسری کتابوں کا مطالعہ شجر ممنوعہ تھا، قلم پکڑنے کی پوری تعلیمی زندگی میں کبھی نوبت ہی نہیں آئی تو فراغت کے بعد چند سطریں بھی ان کیلئے دشوار ہوتی ہیں۔

قاضی صاحب نے بھی اسی ماحول اور انھیں حالات میں تعلیم حاصل کی اور سند فراغت حاصل کی مگر وہ دارالاقامہ کے بجاے اپنے گھر پر رہتے اوقات درس میں آتے اور پھر واپس ہو جاتے اس لئے عام طلبہ کے تفریحی مشاغل اور تضییع اوقات کی دلچسپیوں سے ان کا کوئی واسطہ نہیں رہا، گھر کے حالات بھی ان کی علمی نشو ونما کے لئے کچھ زیادہ سازگار نہیں تھے لیکن اپنے طبعی رجحان اور فطری ذوق و شوق کے بل بوتے کی وجہ سے حالات پر قابو پاتے اور اپنے مطالعہ کے لئے وقت نکال لیتے، ان کی خام سفالہ پوش نیم تاریک دالان ان کا دارالمطالعہ تھی، وہ قدرت کی عطا کردہ فطری صلاحیتوں

کے نتیجہ میں از خود اپنے مطالعہ کی لائن متعین کرتے اور حالات سے لڑتے اُلجھتے، ٹکراتے اسی لائن پہ آگے بڑھتے رہے، راستہ دشوار تھا مگر منزل تصور کی آنکھوں کے سامنے تھی، اور منزل تک پہنچنے کا عزم بالجزم دل میں موجود تھا۔

یا جاں رسد بہ جاناں یا جاں زتن برآید

جس کا مسلک بن جائے اس کو منزل تک پہونچنے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔

آغاز سفر

قاضی صاحب نے عام طلباء مدارس اسلامیہ کی راہ سے ہٹ کر اپنی راہ خود بنائی تھی، اس میں کسی کی رہنمائی کا کوئی دخل نہیں تھا، اسلئے اس راہ پر چلنے کے لئے دل و دماغ میں جو روشنی ہونی چاہئے ان کے ذہنی اُفق پر اُس کی کرنیں پڑنی شروع ہو گئی تھیں، انھوں نے طالب علمی کے دور میں شعر و شاعری کو لے کر اپنے سفر کا آغاز کر دیا تھا، ان کی نظمیں رسائل و اخبارات میں آنے لگی تھیں، پھر انھوں نے چھوٹے چھوٹے اور مختصر مضامین لکھنے شروع کر دیئے، سب سے زیادہ حوصلہ ان کو رسالہ قائد مرادآباد کی جانب سے ملا، یہ رسالہ استادِ محترم "علماء ہند کا شاندار ماضی" کے مصنف مولانا سید محمد میاں صاحب نے مرادآباد سے جاری کیا تھا، مولانا سید محمد میاں صاحب کے قلم میں بڑا زور تھا ان کا اپنا ایک مخصوص طرز تحریر تھا، اردو ادب میں ان کی تحریر نے اپنی شناخت بنالی تھی، وہ فکر ولی اللہی کے ترجمان تھے اس لئے انھوں نے "قائد" کا معیار بہت بلند رکھا تھا، رسالہ میں عام اور سرسری مضامین کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی اس لئے رسالہ کا بڑا حصہ خود آپ ہی کے رشحات قلم سے بھرا رہتا تھا۔ قاضی صاحب نے اسی رسالہ میں

لکھنا شروع کیا، تائید میں قاضی صاحب کے مضامین کی اشاعت ان کے پختہ کار اہل قلم ہونے کی سند بن گئی، ان کا حلقہ تعارف بڑھنے لگا، پھر انھوں نے دوسرے رسائل میں بھی اپنے مضامین شائع کرائے، ابتدائی کامیابیوں کے بعد جوش وجذبہ کروٹیں لے کر اٹھتا ہے تو ایک مضمون کی اشاعت کے بعد دوسرے مضمون کی داغ بیل پڑجاتی ہے، دل میں اُمنگوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے، پکی روشنائی سے اپنے نام کا چھپ جانا ہر اہل قلم کے لیے ابتداءً بڑا حوصلہ افزا ہوتا ہے قاضی صاحب بھی اس فطری جذبے سے خالی نہیں تھے، اسلئے ان کے لکھنے کی رفتار بڑھ گئی، شب وروز نئے نئے موضوعات اور عنوانات سوچتے، لکھتے، کاٹتے، بناتے، سنوارتے کچھ رسالوں کو بھیج دیتے کچھ فائل کی زینت بن کر رہ جاتے، اب قافلہ چل پڑا تھا، اب قافلہ کو منزل تک پہونچانے کے لیے حوصلے اور اُمنگیں اور جوش وجذبہ سب اس کے ہمرکاب ہو گئے۔

راستے کے نشیب وفراز

جب تعلیم سے فارغ ہوئے تو انکے سامنے عملی زندگی کا لق ودق میدان تھا، کوئی واضح راستہ نگاہوں کے سامنے نہیں تھا، نشانات سے ٹیڑھے دھندلے دھندلے، زندگی کے اس چوراہے پر کھڑے ہوکر مختلف سمتوں میں جانے والے راستوں کو دیکھا کئی راستوں پر تھوڑی دور چل کر لوٹ آئے، تدریسی زندگی اختیار کی وہ راس نہیں آئی، امرتسر سے ایک گمنام ادارے کا دعوتنامہ ملا، ادارہ کیسا ہے؟ اس کا کام کیا ہے؟ اس کے وسائل کیا ہیں؟ کچھ معلوم نہیں، انھوں نے بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیے اور امرتسر پہونچ گئے وہ ایک شخص کا ذاتی ادارہ تھا، تنخواہ غنیمت تھی، کام شروع کر دیا، مرکز تنظیم اہلسنت نام تھا ایک بخاری صاحب اس کے

مالک تھے وہ چھوٹے چھوٹے کتابچے طبع کراتے اور تقسیم کرتے تھے۔
قاضی صاحب کے زیر لٹریچر مرتب کرنا پھر اس کو لے کر لاہور جا کر طبع کرانا ہو گیا کیونکہ امرتسر میں کوئی اچھا اردو پریس نہیں تھا، کئی مہینے امرتسر اور لاہور کے درمیان آمد و رفت جاری رہی۔

قاضی صاحب لاہور میں اخبار "زمزم" کے پریس میں طباعت کا کام کراتے تھے ایک دن اخبار زمزم کے مالک سے ان کی ملاقات ہو گئی، وہ غائبانہ طور پر قاضی صاحب کی صلاحیتوں سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے تھے، انھوں نے دوستانہ مشورہ دیا کہ وہاں زندگی کیوں برباد کر رہے ہیں، اس ادارہ کا کوئی مستقبل نہیں نہ اس کا کوئی وزن ہے نہ وہ آپ کی حیثیت کے مطابق حق المحنت دے سکتا ہے، آپ ہمارے یہاں آجائیں، کام بھی آپ کے ذہن و مزاج کے مطابق ہوگا اور حق المحنت بھی بہت معقول اور مناسب ہوگا۔

اس پیشکش کو ٹھکرانا حالات کے پیش نظر نادانی تھی، آپ نے بخاری صاحب سے گفتگو کر کے لاہور جانے کا راستہ صاف کر لیا اور لاہور پہونچ کر اخبار زمزم کے دفتر سے وابستہ ہو گئے مگر اخبار کی مجلس ادارت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

ایک عظیم تالیف

اخبار زمزم کے مالک عبدالرحیم انصاری اپنے پریس سے ایک نئے انداز کی تفسیر مرتب کرانا چاہتے تھے، قاضی صاحب کو اسی مقصد سے بلایا تھا زمزم اخبار جس بلڈنگ میں تھا وہ خاصی بڑی تھی اسی بلڈنگ کے ایک کمرے میں قاضی صاحب کا دار التالیف قائم کر دیا گیا جس میں قدیم علماء کی طرح زمینی فرش پر نشست تھی۔

اس تفسیر کا نام "منتخب التفاسیر" تجویز ہو چکا تھا کام کا خاکہ یہ تھا کہ سات تفسیروں کے خلاصے ہر ہر آیت کے تحت جمع کر دیئے جائیں، ساتوں تفسیریں دفتر میں فراہم کر دی گئیں، کچھ تفسیروں میں ایک ایک آیت کے تحت مصنف نے کئی کئی صفحات لکھے ہیں، ان عربی تفسیروں کو اردو میں منتقل کرنا پھر لمبی لمبی بحثوں کی تلخیص اس انداز سے کرنی کہ مفسر کی رائے کا خلاصہ آجائے اور اتنی ہی سطروں میں آئے جتنی جگہ ہر صفحہ میں ایک تفسیر کے لئے مقرر ہے۔

کام بہت نازک اور ذمہ داری کا تھا، تلخیص کے لئے بڑے علم و مطالعہ کی ضرورت تھی مگر قاضی صاحب کی علمی استعداد ہر شک و شبہ سے بالاتر تھی مگر مفسر کے مقصد کو سمجھ لینا پھر اس کو مختصر لفظوں میں اردو میں منتقل کرنا دقت طلب امر تھا اس لئے ابتدا میں کام سست رفتاری سے چلا لیکن دو چار پاروں کے بعد ذہن و فراست نے یاوری کی، پہلے ایک پارہ بھی ایک ماہ میں نہیں ہوتا تھا بلکہ اوسطاً دو ماہ لگ جاتے تھے لیکن کام جب آگے بڑھا تو ایک ماہ میں ایک پارہ سے بھی زیادہ کا اوسط آنے لگا، تین سال میں یہ تفسیر مکمل ہو گئی۔

میں تقسیم ملک سے قبل فروری ۱۹۴۷ء میں لاہور پہونچا تو تفسیر کتابت کے مرحلے میں تھی، میں چار مہینے لاہور میں رہ کر مئی کے آخر میں وطن واپس آگیا۔ قاضی صاحب لاہور ہی میں رہے، تقسیم ملک کے عذاب کی سرخ آندھی چلنی شروع ہو گئی، فضا گرد آلود اور آسمان کے کنارے خون آلود نظر آنے لگے تھے، حالات صاف بتا رہے تھے کہ کوئی بہت بڑا طوفان امروز فردا میں آنے والا ہے، قاضی صاحب بھی ان حالات سے بے خبر نہیں تھے، فرقہ وارانہ فسادات کا آغاز ہو چکا تھا، نفرتوں کا سیلاب

پھیلتا اور بڑھتا جا رہا تھا جب حالات ایک دم بگڑ گئے تو تقسیم ملک سے دو ماہ قبل وسط جون میں لاہور چھوڑ کر وطن آ گئے، پھر وہ قیامت شروع ہو گئی جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا، آسمان سے عذاب کے انگارے برسنے لگے، کروڑوں مسلمان تباہ و برباد ہوئے مارے کاٹے گئے، ماں بہنوں کی عصمتیں لٹیں، کئی ہزار عورتیں اغوا ہوئیں، اربوں کھربوں کی جائداد مسلمانوں کی نذر آتش ہوئی اور کچھ عرصے کے لئے مسلمان بے یار و مددگار اور بے سہارا ہو کر رہ گیا اس کی فریاد کو سننے والا نہیں رہا، قاضی صاحب اس ہمہ گیر ہنگامہ محشر میں اپنی مصیبت بھول گئے، اچھے مستقبل کا سنہرا خواب چور ہو کر رہ گیا۔

لاہور سے واپسی کے بعد

لاہور سے واپسی کے بعد معاش کا مسئلہ پھر کھڑا ہوا، مگر یہ مسئلہ تو زندگی کے ساتھ ہے، دکھ کی بات یہ تھی کہ لاہور میں قاضی صاحب ترقی و شہرت کے چند زینوں ہی تک پہونچے تھے کہ وہ عمارت ہی زمین بوس ہو گئی۔

وہ چمن ہی لٹ گیا جس میں بہار آنے کو تھی

لاہور میں قاضی صاحب کا حلقہ تعارف بڑا پر شکوہ تھا، جن لوگوں سے ایک بار مل کر لوگ فخر محسوس کرتے تھے وہ قاضی صاحب کے حلقہ احباب اور بے تکلف دوستوں میں تھے ہندوستان کے مشہور صحافی مولانا عثمان فارقلیط اخبار زمزم کے ایڈیٹر تھے ان کا دفتر اور قاضی صاحب کا دفتر آمنے سامنے تھا، دونوں نیشنلسٹ تھے اسلئے ذہنی و فکری اتحاد نے دونوں کو ایکدوسرے سے بہت قریب کر دیا تھا، دفتر ساتھ جانا ساتھ ہی اکثر واپس آنا، پھر قاضی صاحب اور فارقلیط صاحب اندرون بھاٹی گیٹ ایک ہی بلڈنگ میں رہتے تھے اسلئے شب و روز کی ملاقاتیں تھیں۔

میں نے وہیں اخبار مدینہ بجنور کے مشہور ایڈیٹر ابو سعید بزمی کو دیکھا جو بھوپال کے تھے ان دنوں لاہور میں تھے وہ قاضی صاحب سے ملنے آئے یہ محفل بڑی بے تکلفی کی محفل تھی، لاہور کی ایک مشہور شخصیت شاعر مزدور حضرت احسان دانش کی تھی جو مزنگ میں رہتے تھے ان سے تو اتنے گہرے مراسم تھے کہ ہفتہ میں متعدد بار مزنگ چار بجے جانا اور عشاء کے بعد واپس ہونا معمول بن گیا تھا، اپنے قیام لاہور کے زمانے میں چار ماہ قاضی صاحب کے ہمراہ میں بھی ہوتا تھا، کبھی کبھی احسان صاحب ہم لوگوں کو روک لیتے، عشاء کے بعد ان کے دفتر میں جمع ہوتے تو آدھی آدھی رات تک اپنی نظمیں سناتے، وہ راتیں لاہور کی زندگی کی یادگار راتیں تھیں۔

لاہور میں ایک اور بھاری بھرکم شخصیت علامہ تاجور نجیب آبادی کی تھی قاضی صاحب کی ان کے پاس بھی آمد و رفت تھی اور خاطر مدارات چلتی تھی ایک بار میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔

میری اس تفصیل کا مقصد یہ بتانا ہے کہ قاضی صاحب خلوت نشین اور زاہد خشک نہیں تھے بلکہ بزم آرائی کے بھی قائل تھے لیکن اہل علم کی محفلوں کے علاوہ دوسری اور کوئی جگہ وہ جانا پسند نہیں کرتے تھے، احسان دانش کے توسط سے دو تین با ذوق نوجوان جو زندگی میں کچھ کرنا چاہتے تھے اُن سے بھی آمد و رفت تھی جن میں عشرت کرتپوری شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے اور اظہار اثر ناول نگاری سے آج کل ایک غازی آباد میں ہیں دوسرے دہلی میں۔

قاضی صاحب کو سب سے بڑا دھچکا یہ لگا کہ تین سال کی شبانہ روز مشقتوں کے بعد جو تفسیر مرتب کی اور ایک ہزار سے زائد صفحات میں آئی تھی اس کو کتابت کے مرحلے میں چھوڑ کر آئے تھے لیکن پھر اس کا کچھ پتہ

نہیں چلا کہ اس مسودہ پر کیا گذری، تقسیم ملک کی افراتفری میں نہ کاتب کا پتہ چلا نہ مسودہ کا، نہ عبدالرحیم انصاری کا سراغ ملا اور نہ دوسرے ذرائع سے کچھ پتہ چلا، ہوسکتا ہے کہ لاہور کے فسادات، آتشزدگی، لوٹ کھسوٹ، قتل و غارتگری میں یہ مسودہ بھی کہیں تباہ ہو گیا جس کا قلق قاضی صاحب کو آخر وقت تک رہا۔

منزل کی تلاش

لاہور سے واپسی کے بعد کچھ دنوں بہرائچ میں قیام رہا، مشہور عالم مولانا محفوظ الرحمٰن نامی نے الانصار نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کرنے کا فیصلہ کیا قاضی صاحب کو اس کا مدیر بنایا تھا، قاضی صاحب نے بہرائچ جاکر ذمہ داری سنبھال لی لیکن دینی اخبار کے لئے جو وسائل چاہیئے وہ بہرائچ میں عنقا تھے، پھر بھی کچھ دنوں تک اس کی اشاعت ہوتی رہی لیکن آخر میں مالی کمزوری کی وجہ سے اس کو بند کرنا پڑا قاضی صاحب وطن آگئے پھر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں بحیثیت استاد ادب کے ان کی تقرری ہو گئی اور وہ ڈابھیل چلے گئے، پاکستان کے مشہور محدث، قادیانیت کو پاکستان میں غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تحریک کی قیادت کرنے والے، فن حدیث میں مشہور کتاب "معارف السنن" کے مصنف مولانا محمد یوسف بنوری اس زمانہ میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں شیخ الحدیث تھے قاضی صاحب کو ان کی رفاقت حاصل ہوئی وہ بہت ہی جید الاستعداد اور بہت ہی حاضر دماغ عالم تھے جدید و قدیم عربی تصانیف پر ان کی بڑی گہری نظر تھی، قاضی صاحب ان کی مجلس کے رکن رکین بن گئے اور تدریسی فرائض انجام دیتے رہے، لیکن تدریسی زندگی ان کو راس نہ پہلے آئی اور نہ اب، اس لئے ان کا مزاج لگی بندھی تعلیم اور ماحول سے کچھ زیادہ مناسبت نہیں پیدا کرسکا، کچھ دنوں کے بعد دل کے تقاضوں نے

مجبور کیا اور جامعہ اسلامیہ سے ترک تعلق کر کے وطن آگئے۔

عروس البلاد بمبئی میں

ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

چکر چلتا رہا، آخر میں بمبئی نے ان کے پیروں میں زنجیر ڈال دی، قاضی صاحب کے بمبئی جانے کی تقریب یہ ہوئی کہ جمعیۃ علماء مہاراشٹر کے تعاون سے ایک اخبار "جمہوریت" کے نام سے نکالنا طے ہوا، یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے، حامد الانصاری غازی بمبئی میں قیام پذیر تھے ان کو ایڈیٹر بنایا گیا اور جوائنٹ ایڈیٹر قاضی صاحب ہوئے ساری تیاریاں کر لی گئیں تو قاضی صاحب بھی بمبئی پہنچ گئے، اور اپنی ذمہ داری سنبھال لی، اخبار نکل بھی گیا لیکن اخبار کی ذمہ داری جن کے سر تھی ان میں اخلاص کے بجائے جلب منفعت کا جذبہ چھپا ہوا تھا، اس لئے اختلافات شروع ہو گئے، قاضی صاحب خالص دینی ذہن و مزاج کے آدمی تھے بازیگر سیاستداں نہیں تھے، دیانتداری اور پاک آمدنی پر یقین رکھتے تھے، غازی صاحب کو قاضی صاحب کی ادارت میں شمولیت منظور نہیں تھی وہ خود معاشی اعتبار سے پریشان حال تھے، انھوں نے

"جمہوریت" کو ذریعہ معاش بنا لیا اور مختار کل بن گئے جمعیۃ علماء مہاراشٹر کا وزیر بلڈنگ میں دفتر تھا اس کے دو کمروں پر وہ پہلے ہی قبضہ کر چکے تھے کرایہ جمعیۃ ادا کرتی اور قابض غازی صاحب تھے اب اخبار کو بھی انھوں نے اپنے قبضہ میں لے لیا تو قاضی صاحب کی خودداری کو ٹھیس لگی وہ اخبار سے بے تعلق ہو گئے اور دفتر میں قیام بھی ترک کر دیا۔

اخبار انقلاب سے وابستگی

بمبئی کا سب سے بڑا اردو اخبار انقلاب پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے جب اس کے مالک عبدالحمید انصاری کو معلوم ہوا کہ قاضی صاحب نے "جمہوریت" سے قطع تعلق کرلیا تو انھوں نے اپنے اخبار میں آنے کی پیشکش کی قاضی صاحب نے اس کو امداد غیبی سمجھا، ان کی دعوت کو منظور کرلیا اور انقلاب میں آگئے، اور ریپن روڈ پر ایک کمرہ ان کو قیام کیلئے مل گیا پھر چالیس سالوں تک اپنا مخصوص کالم جواہر القرآن اور احوال و معارف کے نام سے لکھتے رہے، اگر ان تمام مضامین کو جمع کیا جائے تو شاید دس بارہ ضخیم جلدوں میں آئیں، اس کالم میں بالعموم علمی مسائل ہی پر لکھتے تھے، آخر میں چند سطریں حالات حاضرہ سے متعلق ہوتی تھیں۔

بمبئی کے شب و روز

قیام بمبئی کے زمانے سے قاضی صاحب کا تصنیفی دور شروع ہوتا ہے بارہ چودہ سالوں کی صحرانوردی کے بعد ان کو عروس البلاد بمبئی میں ایک گوشۂ عافیت مل گیا، ایک پرانا خستہ کمرہ، جس میں چٹائیوں کا فرش ایک بدرنگ ڈیسک، شکن آلود چادر پر ہر طرف کتابیں بکھری ہوئیں، قلم میں لئے ہوئے آنکھیں ڈیسک پر رکھے ہوئے کاغذ پر، جیسے گوتم بدھ کا کوئی مجسمہ، ساکت و صامت بمبئی جیسے شہر کے ہنگامہ خیز اور طوفاں بدوش ماحول سے ایک دم بے نیاز، قاضی صاحب علم و تحقیق کی دنیا میں گم، بُت بنے گھنٹوں بیٹھے رہتے، قلم چلتا رہتا، ایک طرف مٹی کے تیل کا اسٹوپ اس پر ایک چھوٹی سی دیگچی میں آزوقہ تیار ہو رہا ہے یہ فقیرانہ اور قلندرانہ طرز زندگی قاضی صاحب کو بہت عزیز تھا اس کے لئے وہ شاہی منیافتوں کو بھی ٹھکرا دیتے تھے۔

شاہانہ دعوت سے انکار

ایک بار شاہ اُردن ہندوستان کے دورے پر آئے اور جب وہ بمبئی آئے تو جوہریوں کے بادشاہ عرب جوہری نے شاہ اُردن کی شاہی دعوت کی عرب جوہری نے قاضی صاحب کو مدعو کیا کیونکہ قاضی صاحب عرب ملکوں سے آنیوالے معزز مہمانوں کی ترجمانی کرنے کے لئے بلائے جاتے تھے اس لئے عرب جوہری بھی قاضی صاحب سے واقف تھا شاہ اُردن کی ترجمانی بھی قاضی صاحب کرتے تھے، ڈنر فائیو اسٹار ہوٹل میں تھا اس کا دعوتنامہ قاضی صاحب کی جیب میں تھا، وہ جب اپنے کمرے میں آئے تو دعوتنامہ کو غور سے پڑھا، اس میں ڈنر کے بعد بہت ہی اعلیٰ پیمانے پر رقص وسرود کا بھی پروگرام تھا بمبئی کی مشہور فلمی اداکاریں اور ڈانسر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والی تھیں، جوں ہی پروگرام کی یہ سطریں پڑھیں ان کی دینی غیرت اور عالمانہ وقار کو ٹھیس لگی، انھوں نے شیروانی اُتار کر کھونٹی پر لٹکائی اور چولھے پر کھچڑی کے لئے دیگچی چڑھادی اور گنگنانے لگے ؎

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس
ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

حافظ شیرازی کو ہندوستان کے بادشاہ نے یہاں تشریف آوری کی دعوت دی، حافظ شیرازی ان دنوں معاشی تنگیوں میں مبتلا تھے، دل میں خیال آیا کہ شاہی دربار سے وابستگی ایک شاندار زندگی کا پیش خیمہ ہے دل میں یہ خیال آیا کہ شاہی دربار سے وابستگی ایک شاندار زندگی کا پیش خیمہ ہے، دل میں یہ خیال ابھی آیا ہی تھا کہ اسی دوران اندر سے کنیز ایک پیالے میں دودھ لے کر آئی اور پیش کیا، دودھ پی کر شکم پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ جب تک مجھے یہ میسر ہے شیراز چھوڑنے کی ضرورت نہیں اور ہندوستان

آنے سے صاف انکار کر دیا، قاضی صاحب بھی کچھ اسی ذہن و مزاج کے
بزرگ تھے ۔

عظمتوں کا چراغ روشن رکھا

ایک بار شاہ ایران رضا شاہ پہلوی
خیر سگالی کے دورے پر ہندوستان
آئے اور بمبئی میں اسی عرب جوہری کو ان کی میزبانی کی عزت حاصل ہوئی
قاضی صاحب اس ڈنر میں مدعو تھے، صبح کو اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ شاہ ایران
کی عروس البلاد بمبئی میں تشریف آوری کی خوشی میں مہاراشٹر حکومت نے
تین دنوں کے لئے شراب سے پابندی اٹھالی ہے ہر شخص آزادانہ شراب خرید
سکتا ہے اور پی سکتا ہے میکدے کے پیر مغاں کا اعزاز یہی ہے کہ اس کی
نگاہوں کے سامنے

ہر سمت ساغروں میں چھلکتی ہوئی شراب

کا دلکش منظر ہو اور رندانِ بلانوش اس کا استقبال کریں، ہندوستان
کی سرزمین نے یہ شاندار روایت قائم کر رکھی ہے کہ باہر سے آنے والے
معزز مہمانوں کا ان کے ذہن و مزاج کی رعایت کرتے ہوئے ان کی شایانِ
شان استقبال کرتی آئی ہے ۔

آزادی کے کچھ ہی دنوں بعد خادم حرمین شریفین شاہ سعود ہندوستان
کے دورے پر آئے تو بنارس میں ان کا استقبال اس طرح کیا گیا کہ ان کے
راستہ میں جتنے مندر پڑتے تھے ان تمام مقامات پر سفید لٹھے کے لمبے لمبے
بینر بنائے گئے اور ان پر بہت ہی جلی قلم سے کلمۂ شہادت لکھ کر ان بینروں
سے مندر کو چھپا دیا گیا تاکہ شاہ کی نظران پر نہ پڑنے، سڑکوں پر جگہ جگہ
عظیم الشان گیٹ بنائے گئے ان پر جو بینر لگائے گئے ان پر ایکس X کی صورت
میں دو تلواریں بنا کر دائیں بائیں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی

سطر جگمگا رہی تھی لاکھوں کی بھیڑ میں جب شاہ سعود ان سڑکوں سے
گذرے تو ان کو محسوس ہوا ہوگا کہ وہ بنارس میں نہیں حجاز کی شاہراہوں پر
چل رہے ہیں، رواداری کی یہ شاندار روایت ہمیشہ یہاں رہی، شاہ ایران
کی آمد کے موقعہ پر ان کے ذہن و مزاج کی رعایت کرتے ہوئے بمبئی کی سرزمین
نے اس روایت کو قائم رکھا، اور میکدوں کے دروازے کھول دیے"۔

قاضی صاحب نے اخبار میں خبر پڑھتے ہی عرب جوہری سے معذرت
کردی، نشہ برساتی ہوئی اس فضا میں قاضی صاحب کے جانے کا کیا سوال

قاضی شہر کجا؟ رند خرابات کجا؟

قاضی صاحب اسی شان قلندری کے ساتھ چالیس برسوں تک بمبئی میں
رہے ان کے دامن فضل وکمال پر کبھی کوئی دھبہ نہیں پڑا، نشہ برساتی ہوئی بمبئی
کی فضا کا اُن کے دل ودماغ پر کبھی کوئی اثر نہ ہوا، یہ خودشناسی، خودداری
اپنے مقام ومرتبہ کے صحیح احساس اور استقامت کا ایسا حیرتناک کارنامہ ہے
کہ اس کی مثال عملی زندگی میں بہت ہی کمیاب ہے۔

شعروادب کی مجلس میں شرکت

قاضی صاحب عالمانہ وقار کی حفاظت
ضروری سمجھتے تھے اسلئے جہاں اسکو
ٹھیس لگنے کا احتمال نہیں ہوتا تھا آپ وہاں شریک بھی ہوتے تھے مجھے یاد
ہے کہ جن دنوں میں بمبئی میں تھا انھیں دنوں ایک قدیم طرز کی محفل شعروسخن منعقد
ہوئی اس میں انھوں نے شرکت کی میں خود ان کے ہمراہ تھا، حیدرآباد کے ایک
رئیس زادے اُنس حیدرآبادی بمبئی میں رہتے تھے وہ ایک شاندار فلیٹ
میں رہتے تھے انھوں نے اپنے فلیٹ کے ہال میں ایک محفل شعروسخن
منعقد کی صرف شعرا اور صرف تین چار اہل علم مدعو تھے کل بیس بائیس افراد
تھے بمبئی کی مقبول ترین شخصیت حکیم اعظمی کے ہمراہ ہم دونوں بھی اس محفل میں

شریک ہوئے تمام لوگ ایک دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے تو ایک نوجوان ایک چھوٹی سی مرادآبادی سینی میں ایک موٹی سی موم بتی جلاکر لایا اور صدر مشاعرہ کے سامنے رکھ دی، انس حیدرآبادی نے صدر سے مخاطب ہو کر کہا حضرت! بسم اللہ، صدر نے شمع اپنی داہنی جانب سرکادی، شمع سامنے آنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنا کلام سنائیں، شاعر نے غزل پیش کی غزل تمام کر کے شمع اپنی داہنی جانب بڑھادی، اسی طرح شمع گردش کرتی ہوئی قاضی صاحب اور پھر میرے سامنے آئی اور جلدی سے داہنی جانب سرکادی کیوں کہ ہم دونوں کو پڑھنا نہیں تھا، شمع گردش کرتی ہوئی بمبئی ریڈیو سے وابستہ رفعت سروش کے سامنے آئی انھوں نے ایک آزاد نظم سنائی اور خوب داد و تحسین وصول کی اب شمع مہمان خصوصی ساغر نظامی کے سامنے تھی یہ ان کے شباب کا زمانہ تھا اور ان کی شاعری پر بھی شباب آیا ہوا تھا انھوں نے متعدد غزلیں اور نظمیں سناکر شمع صدر کے سامنے بڑھادی، صدر نے پھونک مار کر شمع بجھادی، یہ مشاعرہ کے ختم ہونے کا اعلان تھا، باہر نکل کر قاضی صاحب نے رفعت سروش سے کچھ دیر باتیں کیں پھر ہم لوگ اپنے کمرے پر لوٹ آئے۔

رسالہ البلاغ اخبار انقلاب سے آپ وابستہ تھے لیکن اخبار کے دفتر شاذ و نادر ہی جاتے تھے جو کالم آپ کے ذمہ تھا وہ کسی بھی وقت لکھ کر جیب میں ڈال لیتے اور جب شام کو گھر سے نکلتے تو انقلاب کے کاتب کی قیامگاہ راستہ میں پڑتی تھی اپنی تحریر ان کے حوالے کر دیتے وہی اس کالم کی کتابت بھی کرتے تھے، قاضی صاحب اب بالکل آزاد تھے، بعد میں انھوں نے انجمن اسلامیہ کے ہائی اسکول میں دینیات کے دو گھنٹے لے لئے تھے وہاں البتہ پابندی سے جاتے تھے

تیسری دلچسپی کی جگہ صابو صدیق کا مسافر خانہ تھا جہاں انجمن خدام النبی کا دفتر تھا جس کو بمبئی کے ایک دیندار مخیر رئیس احمد غریب نے قائم کیا تھا، جس کا مقصد زائرین حرم کو سہولت فراہم کرنا تھا انھیں کی تجویز پر ایک رسالہ البلاغ کا اجرا ہوا قاضی صاحب اس کے مدیر تھے یہ رسالہ بیسوں سال تک قاضی صاحب تن تنہا نکالتے تھے، یہ ساری مصروفیات ۴ بجے شام کے بعد کی تھیں اس کے علاوہ وہ شب و روز کا زیادہ حصہ اپنے دارالمطالعہ میں تصنیف و تالیف اور مطالعہ میں گذارتے بلا ضرورت کہیں آنا جانا پسند نہیں تھا آپ کی تین درجن کے قریب کتابیں اسی خلوت گزینی کے نتیجہ میں مرتب ہوئیں اور آپ کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔

عربی ادب کا ذوق

قاضی صاحب کا عربی ادب کا ذوق بڑا پختہ تھا، دوران گفتگو بے تکلف احباب کی محفلوں میں اکثر سبعہ معلقہ دیوان حماسہ مختلف جاہلی شعراء کے اشعار سناتے اور اس کی معنویت کی وضاحت کرتے، بیشمار عربی اشعار ان کے حافظے میں محفوظ تھے، چونکہ شب و روز عربی کتابوں کا ہی مطالعہ تھا اس لئے ذرا سی توجہ سے عربی کی بہت مرصع نثر لکھتے تھے، بعض عربی کتابوں پر جو انھوں نے مقدمے اور پیش لفظ لکھے ہیں، بہت رواں دواں، سلیس اور فصیح عربی میں ہیں، کہیں کہیں سجع کی رعایت اور قافیہ پیمائی بھی نظر آتی ہے، یہی عربی ادب کا ذوق آگے چل کر مزید نکھر گیا، ان کی عربی عبارتوں میں کہیں تکلف اور آورد کی جھلک نہیں ملتی نہ کہیں اظہار مطالب میں اغلاق و ابہام کا شائبہ ہے "رجال السند والہند" ان کی عربی کی پہلی تصنیف ہے، دوسری کتاب "العقد الثمین" جب آپ کے قلم سے نکلی تو عام متداول عربی تاریخ و سیر کی کتابوں کا جو انداز ہے ٹھیک وہی انداز بیان وہی سادہ لب و لہجہ بلا کسی

عبارت آرائی اور تصنع کے صاف ستھری سلیس عربی ہے، جدید صحافتی عربی ان کی کتابوں میں کہیں نظر نہیں آتی جو کچھ ہے قدما کے رنگ میں ہے جو ان کی کتابوں کے علمی معیار کو اور بلند کر دیتی ہے۔

قاضی صاحب کی دور اندیشی

قاضی صاحب طالب علمی کے دور سے اُردو کتابوں کے بجائے آغذ و مراجع کی عربی کتابوں کے مطالعہ میں دلچسپی رکھتے تھے، ہم لوگ اپنی عمر کے طبعی تقاضوں کے زیر اثر اردو ادب، شعر و شاعری، سیاسی تاریخ، افسانوں ناولوں اور ادبی رسالوں کی گلریز وادیوں کی سیر کو حاصل زندگی سمجھتے تھے۔ قاضی صاحب تذکرۃ الحفاظ، فتوح البلدان، المسالک والممالک جیسی خشک کتابوں کے مطالعہ میں مصروف نظر آتے تھے، معاشی حالت زیر و زبر تھی مگر کیسے کیسے چار پیسے جوڑ کر عربی کی ان کتابوں کو خریدتے، جلد سازی کرتے، اس پر کاغذ کا غلاف چڑھاتے، اور سجا کر طاق پر رکھتے ان کتابوں کو پھول کی طرح چھوتے، نہایت احتیاط اور نفاست کے ساتھ ان کے اوراق پلٹتے اور گھنٹوں ان کے مطالعہ میں منہمک رہتے، طبقات خلیفہ بن خیاط، وفیات الاعیان، تہذیب التہذیب وغیرہ کتابیں اسی دور غربت و افلاس کی خرید کردہ تھیں حیرت ہوتی ہے کہ طالب علمی کے دور میں کس طرح انھوں نے ان کتابوں کی قدر و قیمت کو پہچانا جبکہ ہم لوگ ان کتابوں کے ناموں سے بھی واقف نہیں تھے ان کی افادیت کا تصور بھی ہمارے دماغ سے اونچا تھا اور اگر قاضی صاحب کے بتانے سے کچھ سمجھ بھی جاتے تو اسکو کوہ کندن کاہ برآوردن سمجھتے اور کہتے تھے ہم ان کے مطالعہ کو تضییع اوقات سمجھتے کیوں کہ ہمارا شعور خام تھا قاضی صاحب اس سے بہت آگے جا چکے تھے، ہماری جارحانہ تنقیدوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا ہماری گمراہ طبیعتوں نے ہم کو رنگین

کھلونے دے کر بہکار رکھا تھا اور قاضی صاحب ثریا پر کمند ڈالنے کی فکر میں مصروف تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو علمی مجلسوں میں صدر نشینی کی عزت و سرافرازی نصیب ہوئی اور ہم کو صف نعال میں بھی جگہ نہ ملی۔

قاضی صاحب کی شاعری

ہر ذہین عالم میں شاعری کا جوہر موجود ہوتا ہے بس ذوق سلیم اور موزونیٔ طبع درکار ہوتی ہے، قاضی صاحب بھی شاعر تھے اور اپنے دور طالب علمی میں بہت لکھتے تھے، اس دور میں ان کی شاعری ہی ان کی شناخت بن گئی تھی، وہ غزل کے بجائے صرف مذہبی و اصلاحی نظمیں لکھتے تھے، جس میں جوش و جذبہ کی فراوانی تو ضرور تھی مگر لطف بیان، طرز اظہار میں جدت، زبان و بیان کی چاشنی، برجستگی و سلاست اور شگفتگی کا عنصر بہت کم تھا، ان کی شاعری اصلاحی نظموں تک محدود تھی کبھی کبھار کوئی نعت لکھ دیتے تھے۔

عمر کے ساتھ ان کی شاعری پر بھی نکھار آنے لگا تھا، ان کے شعروں میں رمزیت، معنویت، استعارات کا خوبصورت استعمال اور تخیل کی کارفرمائیاں نظر آنے لگی تھیں، جن میں زبان و ادب کی چاشنی، انداز بیان کی لطافت تخیل کی فن کاری جگہ جگہ نظر آنے لگی، اب وہ غزلیں بھی لکھنے لگے تھے انکی کچھ غزلیں پاکیزہ اور دلکش ہیں لیکن اس کا بڑا حصہ سادگی بیان اور سادگی زبان کی وجہ سے دلکشی و جاذبیت سے عاری ہے، سچی بات یہ ہے کہ یہ قاضی صاحب کا فن نہیں تھا اور نہ ان کی ذہنی ساخت غزل کی شاعری کو قبول کرتی تھی غزل کی شاعری کے لئے حسن پرستی تھوڑی سی ذہنی و فکری آوارگی کی ضرورت ہے تبھی وہ مضراب بن کر دل کے تاروں کو چھیڑ سکتی ہے، تخیل کی بلند پردازی محاکات کی رنگ آمیزی، طرز اظہار کی شوخی کے تمام جھام کے ساتھ جب عروس غزل جلوہ افروز ہوتی ہے تبھی اس کی جانب فکر و نظر کی نگاہیں اٹھتی ہیں۔

قاضی صاحب خالص علمی آدمی تھے، ان کا ذہن ومزاج تحقیقی تھا صداقت کی تلاش وجستجو اور حقیقت کی دریافت ان کی فطرت تھی اور غزل کی شاعری ہوا میں گرہ باندھنے کا کام ہے، یہی وجہ ہے کہ جب انکی تصنیفی مصروفیات میں اضافہ ہوتا چلا گیا تو انھوں نے شاعری سے ایک دم توبہ کرلی۔

ان کے پاس ایک ضخیم مجموعہ کلام تھا اس میں ابتدائی دور سے لے کر آخری دور تک کا کلام ہے، اس میں ہر طرح کا کلام ہے، مذہبی واصلاحی نظموں کا تناسب زیادہ ہے، ان میں کچھ نظمیں بڑی جاندار اور مرصع ہیں برجستگی وسلاست بھی ہے اور زور بیان بھی، اس میں غزلیات کا حصہ کم ہے، غزلوں میں بھی کہیں بڑے شگفتہ نمونے مل جاتے ہیں، ان کی مذہبی واصلاحی نظموں کا بڑا حصہ اس دور کے اخبارون اور رسالوں میں شائع ہوچکا ہے، جن حالات اور جس فضا میں یہ نظمیں لکھی گئی تھیں یہ نظمیں انکی عکاس ہیں اسلئے وہ پسند بھی کی جاتی رہیں۔

قاضی صاحب کا مکمل مجموعہ کلام ان کے ورثہ کے پاس موجود ہے، انکی ابتدائی زندگی کی علمی وادبی سرگرمیوں اور تدریجی ارتقا کا پورا پورا عکس ہے اگر اسی نقطۂ نگاہ سے اسکو شائع کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

آخری بات

حضرت نانوتوی پر جب میری کتاب شائع ہوگئی تو اسکے کچھ ہی دنوں بعد میں نے حضرت گنگوہی کے سوانح حیات پر کام شروع کردیا تھا، کام بڑی تیزی سے چل رہا تھا، تقریباً دوسو صفحے سیاہ کرچکا تھا کہ ۱۴ر جولائی کی شب میں قاضی صاحب کے صاحبزادے کا فون آیا کہ

آج والد صاحب کا انتقال ہوگیا

یہ چند لفظوں کی خبر تھی جو دل و دماغ پر بجلی بن کر گری۔ ہوش و حواس صبر و ضبط، غور و فکر، قوتِ عمل سب کو خاکستر کر گئی، دماغ نے کام کرنا اور انگلیوں نے قلم پکڑنا چھوڑ دیا، چاہنے کے باوجود بھی ایک حرف نہ لکھ سکا مسودہ لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا جب قلم ہاتھ میں لیتا قاضی صاحب کا حادثۂ وفات غموں کی سیاہ چادر آنکھوں کے سامنے تان دیتا، اس اندھیرے میں قلم نے چلنے سے انکار کر دیا، میرے قابو میں اس وقت آیا جب خود یہ غمناک کہانی موضوعِ سخن بن گئی۔

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیثِ یار کہ تکرار می کنیم

ڈاکٹر مولانا شمس تبریز خاں
شعبہ عربی لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری مرحوم

اسلام کے عہدِ زریں کے مؤرخ و محقق

دبستانِ دیوبند میں ابھی مولانا وحید الزماں صاحب مرحوم کا غم تازہ تھا کہ اسے جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری کا غم بھی دیکھنا پڑا جنہوں نے ۱۴ جولائی ۱۹۹۶ء ، ۲۰ صفر ۱۴۱۷ھ کو اس دارِ فانی کو خیرباد کہا۔

مولانا مرحوم نے دارالعلوم دیوبند کے بجائے اس کی شاخ مدرسہ قاسمیہ شاہی مرادآباد سے فراغتِ علمی حاصل کی تھی مگر دارالعلوم کے اساتذہ سے بھی فیض اٹھایا تھا اسلئے علوم نبویہ کے اس شجرۂ طیبہ سے اپنے کو وابستہ و پیوستہ رکھتے تھے اور اس سے انتساب کرتے تھے۔ مولانا مرحوم ہمارے علماء کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جو علم و فضل، علمی کاوش و تحقیق، تصنیف و تالیف کے ذوق کے ساتھ فضائلِ اخلاق سادگی و بے تکلفی، توازن و اعتدال، حق پسندی و غیر جانبداری، مروت و رواداری کے گوناگوں محاسن سے بھی آراستہ تھی اور جس کی شخصیت میں عالم کا وقار، داعی کا اخلاص، مردِ مومن کی دلنوازی، محقق کی طلب و جستجو، اور دینِ کامل کی جامعیت کی جھلکیاں دلوں کو مسرور اور نگاہوں کو مسحور کر دیتی تھیں۔

قاضی صاحب کا مزاج خالص علمی و تحقیقی تھا، ان کا ذوقِ طلب اور جستجوئے علم دیکھ کر عام آدمی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ بجائے خود علم کا پیکر اور تحقیق کا مظہر

ہیں، ان کی پوری زندگی علمی تلاش و جستجو، تحقیق و تفحص، اور بحث و نظر سے عبارت تھی وہ عالمانہ شان اور رکھ رکھاؤ سے دور رہتے ہوئے اور اپنے قیمتی اوقات کو علم مجلسی سے بچاتے ہوئے اپنے موضوع سے متعلق تحقیق و تفتیش میں صرف کرتے تھے اور بڑے بڑے موضوعات کے لئے چھوٹے سے چھوٹے مواد کو بھی اس محنت و مشقت سے حاصل کرتے تھے جیسے چیونٹیوں کے منہ سے شکر جمع کرنا کہتے ہیں۔

وہ تحقیق کے فن سے اچھی طرح واقف تھے کہ محقق کے لیے کوئی تحقیق حرف آخر نہیں بلکہ وہ ایک منزل پر پہنچ کر دوسری منزلوں کی طرف نگاہ کیے رہتا ہے کہ شاید کوئی اور نئی بات معلوم ہو اور کوئی نیا پہلو سامنے آئے اس کے ساتھ وہ اپنے ذخیرہ معلومات پر مطمئن نہیں ہوتا بلکہ اپنا ذہن کھلا رکھتا ہے اور ہر نئی دریافت کو خوشدلی سے قبول کرتا ہے، اسی لئے وہ کسی موضوع سے متعلق بیشتر مواد رکھتے ہوئے کم سے کمتر مواد کے لئے بھی سرگرداں اور اس کا قدرداں رہتاہے اور زبان حال سے یہ کہتا ہے کہ ؎

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نداشت
دانہ می چیدم من آں روزے کہ خرمن داشتم

قاضی اطہر صاحب کے طرز فکر و تحقیق کی خوبی اس کی یکسوئی و یک جہتی، اور وحدت داریکازہے، انھوں نے علم و تحقیق کا ایک میدان اپنے لئے مخصوص کرلیا جس میں زیادہ علمی سرگرمیاں نہیں پائی جاتی تھیں اور جس میں بڑی دقت نظر، خون جگر، پتہ ماری، کدو کاوش، اور دماغ سوزی کی ضرورت تھی۔

دوسرے محققوں کی طرح انھوں نے دوسرے علمی میدانوں میں منہ مارنے کے بجائے اپنی عمر عزیز کے بیشتر اوقات اپنے موضوع کا حق ادا کرنے میں صرف کردیئے اور تحقیقی یکسوئی و توحید پرستی، اور علمی خلوص و حسن نیت اور

صدق عزیمت کا ایسا مظاہرہ کیا جو ہمارے محققوں کے یہاں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

مبارکپور کے اس مرد مبارک نے اپنا موضوع بھی وہ چنا جو ہر طرح مسعود و مبارک کہلانے کا مستحق ہے۔ یعنی عہد رسالت، خلافت راشدہ اور صدر اسلام جو اسلام ہی کا نہیں بلکہ انسانی تاریخ کا بھی عہد مسعود اور دورِ زریں ہے۔

قاضی صاحب کے علمی و تحقیقی کام کی اہمیت دو طرفہ اور دو گونہ ہوجاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انکے کام کے محرکات و عوامل میں ایک طرف اسلام کے عالمی انسانی پیغام اور تاریخ اسلام کے دور اولیں سے عقیدت ہے تو دوسری طرف اپنی مادر وطن ہندوستان سے محبت وانسیت کے جذبات ہیں، اس طرح قاضی صاحب نے اپنے مذہب، اپنی تاریخ و تہذیب کے ساتھ اپنے وطن کی بھی خدمت کی، اور عام تاریخ کے ماضی وحال سے الگ رہتے ہوئے خیر القرون اور عہد میمون کی جلوہ سامانیوں سے ہمیں آشنا کرایا، اور عہد رسالت، اور خلافت اور اموی و عباسی زمانے کی گوناگوں علمی و دینی، لوبی و ثقافتی، تہذیبی اور تمدنی سرگرمیوں، عرب و ہند کے دو طرفہ تعلقات، اور اشخاص و مقامات کے کتنے مجہول و غیر معروف پہلوؤں کو تحقیق و تاریخ کی روشنی میں لے آئے اور ان تعلقات کی تاریخ کو اعتبار و استناد بخشا۔ اور ان تعلقات کے تنوع اور رنگا رنگی سے بحث کر کے انکی ثروت و اہمیت اور وسعت میں اضافہ کیا، اور اپنے تحقیقی عمل اور علمی رویے سے یہ پیغام دیا کہ تعمیر انسانیت کی تاریخ میں عرب و ہند کے خوشگوار و مبارک تعلقات کی بڑی اہمیت ہے جس پر مورخین و محققین کو پوری توجہ کرنا چاہیئے اور ان تعلقات میں مزید بہتری اور خوشگواری لانے کی ضرورت ہے ــــ قاضی صاحب اپنے کام سے یہی پیغام دے گئے ہیں کہ ہمیں روشنی

دگری کیلئے۔ آتش رفتہ سے ہی کام لینا چاہیے' سے

میں کہ مری نوا میں ہے آتش رفتہ کا سراغ

میری تمام زندگی، کھوئے ہوؤں کی جستجو

ان سے ذاتی تعلق وتعارف اس وقت ہوا جب ۱۹۵۷ء کے آس پاس
ان کے رسالہ البلاغ بمبئی کا تعلیمی نمبر دیکھنے کو ملا جسے انھوں نے بڑی محنت
سے مرتب کیا تھا اور ہندوستان کے بیشتر علمی وتعلیمی اداروں کے تعارف کے
ساتھ ایک طویل مقالہ مسلمانوں کے ہر طبقے میں علم سے متعلق لکھا تھا جس سے
پتہ چلتا تھا کہ علمی ذوق وشوق سے ماضی میں مسلمانوں کا کوئی طبقہ خالی نہیں رہا ہے
اگرچہ اب پیشہ ورانہ اور کاروباری مصروفیات نے علمی پہلو کو مغلوب کر لیا ہے اور انکے
شاندار ماضی جیسی صورت حال باقی نہیں جسکی شانداری ان کے علمی شغف ہی کا نتیجہ
تھی وہ مقالہ مجھے اتنا پسند آیا کہ اسے میں نے اپنے بعض ساتھیوں سے نقل کروالیا۔

قاضی صاحب کا رسالہ البلاغ غالباً حج کمیٹی کا پرچہ تھا لیکن قاضی صاحب
کے علمی مزاج نے اسے ایک معیاری پرچہ بنا دیا تھا جس سے بمبئی کے کاروباری
دنیا میں علم ودین کی بڑی اشاعت ہورہی تھی۔

دیوبند سے فراغت کے بعد میں نے قاضی صاحب کو خط میں لکھا اور ان سے
مشورہ کیا کہ بمبئی میں علمی ودینی خدمت کا کوئی موقع ہو تو بتائیں۔ اسکے جواب
میں انھوں نے بمبئی میں تجارت کی علم ومعرفت پر غلبہ وبالادستی کی شکایت کی اور
لکھا کہ وہاں کوئی سنجیدہ علمی کام کرنا بہت مشکل ہے اور کہ

ع من نکردم شما حذر بکنید

بہرحال میں نے صاحب البیت أدری بما فیہ کے مطابق انکی نصیحت مان لی۔
قاضی صاحب کی یہ خرد نوازی اور علم دوستی تھی کہ مجھ طالب علم کے علمی رجحان
کا اندازہ کر کے انھوں نے اپنی بعض کتابیں بھی ارسال کردیں جن میں۔ رجال السند

والہند بھی تھی۔

پھر میں نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ "عربی ادب میں ہندوستان کا حصہ" کی تیاری کے وقت ان کی تمام کتابوں سے استفادہ کیا اور ان کا شکرگزار رہا۔ مراسلت و ملاقات کا اتفاق کم ہی ہوا، عرصے کے بعد ندوۃ العلماء کے جشن میں ملاقات ہوئی پھر دارالعلوم دیوبند کے اجلاس صدسالہ کے موقع پر ملاقات اور سمینار میں شرکت کا موقع ملا۔

آخری اور بھرپور ملاقات۔ دارالعلوم دیوبند کے مہمان خانہ میں ہوئی جہاں اتفاق سے ہم دونوں مقیم تھے، تین چار دنوں کی یکجائی کی وجہ سے قاضی صاحب کو قریب سے دیکھنے اور انکی سادگی و بے تکلفی، علمی لگن اور خوش اخلاقی و تواضع کے ایسے مظاہر دیکھنے میں آئے۔ جن کی وجہ سے میرے دل میں انکی قدر و عظمت اور بڑھ گئی۔

انھیں دنوں (النادی العربی) کا جلسہ ہو رہا تھا جس میں طلبہ ہم دونوں کو مدعو کرنے آئے قاضی صاحب نے یہ کہہ کر میری تقریر رکھوائی کہ یہ تو اصل دارالعلوم کے فرزند ہیں اور میں تو اس کی شاخ سے وابستہ رہا ہوں۔ انکی یہ تواضع دیکھ کر مجھے بڑی شرمندگی کا احساس ہوا۔

وہ "شیخ الہند اکیڈمی" کی نگرانی کیلئے دارالعلوم جاتے رہتے تھے اس بار بھی اسی سلسلے میں آئے ہوئے تھے، مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم کے بعد انکی نگرانی کی بدولت اکیڈمی کا علمی وقار قائم تھا، اسی طرح انھوں نے مولانا اکبرآبادی مرحوم کے رسالہ "برہان" دہلی کی ادارت سنبھال کر اس جھلملاتے چراغ کو بجھنے سے بچائے رکھا اب آگے اللہ مالک ہے۔

اپنی شخصیت اور علمیت کے سبب وہ ہماری بزم دوشیں کے ان پرانے چراغوں میں تھے جن سے بزم میں رونق اور روشنی تھی۔

"رجال السند والهند" غالباً انکی اولین تالیف تھی جسے انھوں نے
رواں اور سلیس عربی میں سندھ اور ہندوستان کی ان شخصیات کے تعارف
میں لکھا تھا جو ہندوستان میں اسلام کے دور اولیں سے تعلق رکھتی تھیں۔
ان کی کوشش یہ تھی کہ مولانا عبدالحی حسنی کی نزھۃ الخواطر میں جو نام اور
حالات اندراج سے رہ گئے ہیں ان کی تکمیل بھی ہو جائے اس طرح ان کے
کام کا تعلق آغاز اسلام، صدر اسلام اور قرون اولیٰ کی شخصیات و حالات
کو تاریخ و تحقیق کی روشنی میں لانے کا تھا اور یہ ایک بڑی مبارک مہم تھی
جسکو انھوں نے اپنی غیر معمولی محنت و محویت، صلاحیت و لیاقت اور خلوص
نیت و عزیمت سے سر کیا۔ اس کتاب میں تذکروں اور رجال و تاریخ کی
کتابوں میں بکھرے مواد کو انھوں نے بڑے سلیقے سے ایک جا کر دیا جس سے
بہت سے گمنام افراد ہمارے لیے معروف و متعارف ہو گئے۔

مسجد نبوی کے استاذ محمد بن نذیر الطرازی نے اپنی منظوم تقریظ میں
یہ شعر بھی لکھا تھا ؎

هو الحبرو فی الانساب حافظ عصره　　سیوطی اهل الهند بل منه اغزر

قاہرہ سے ۵۸۸ صفحات میں ۱۳۹۸ھ میں دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تھا

اس سلسلے کی ان کی دوسری اہم کتاب "العقد الثمین فی فتوح الهند
ومن ورد فی الهند من الصحابة والتابعین" ہے جس میں انھوں
نے بڑی تحقیق و تفتیش کے ساتھ ان صحابہ و تابعین کا تعارف کرایا جو ہندوستان
تشریف لائے تھے۔ پہلی کتاب کی طرح انکی دوسری کتاب بھی اپنے موضوع
پر منفرد اور اولیں کتاب کی حیثیت رکھتی ہے اسلیے تاریخ و تحقیق کی دنیا
میں اس کی اہمیت مسلم ہے۔ استاذ عبدالقدوس الانصاری مدیر المنهل
جدہ نے اپنے مقدمہ میں انکے اسلوب کو سہل ممتنع لکھا تھا یہ کتاب رابطہ عالم اسلامی

کے سکریٹری جنرل شیخ محمد بن ناصر العبودی کی سفارش سے شائع ہوئی تھی۔

عرب و ہند کے تعلقات پر علامہ سید سلیمان ندوی کی کتاب کو بڑی اہمیت ہے اور اسے اولیت حاصل ہے مگر سید صاحب نے تعلقات کے بہت سے پہلوؤں سے بحث کی تھی اسلئے بعض پہلو تشنہ تھے اور انھوں نے ایک ایسا خاکہ تیار کر دیا تھا جس میں مختلف رنگوں کے بھرنے کی بڑی گنجائش تھی اور اسے محققین و مورخین کی ایک ٹیم انجام دے سکتی تھی، مگر ہمارے اولوالعزم قاضی اطہر صاحب نے تن تنہا انجام دیدیا اور مولانا سید سلیمان ندوی کے چھوڑے ہوئے کام کی تکمیل بہتر سے بہتر طریقے پر کر دی بلکہ اسے اپنا مستقل موضوع بنا کر اس کی اہمیت کو اور نمایاں کر دیا۔

قاضی صاحب نے اس سلسلے کو مکمل و منظم کرنے کیلئے عہد رسالت سے لیکر عہد عباسی تک کے عرب و ہند کے تعلقات پر تاریخی روشنی ڈالی اور تاریخ کے مخفی پہلوؤں اور مجہول و تاریک گوشوں کو بھی پوری روشنی میں اس طرح لے آئے کہ آج ان سے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو گیا اور عرب و ہند کے تعلقات کی قدامت اور تسلسل ایک تاریخی حقیقت بن گیا، جس سے آج اس موضوع سے متعلق محققین و مورخین اور دوسرے افراد کام لے رہے ہیں۔

اس سلسلے کی تیسری کتاب "عرب و ہند عہد رسالت میں" ہے جو تحقیق و تلاش کا نہ صرف عمدہ نمونہ ہے بلکہ عہد نبوی کے تعلق سے سیرت نبوی کے مبارک ذخیرے سے بھی اس کا رشتہ قائم ہو گیا ہے۔ اور سیرت پر کام کرنے والوں کیلئے بھی اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

اس سلسلے کی دیگر کتابوں میں ہندوستان اور خلافت راشدہ، الہند فی عہد العباسیین، اسلامی ہند کی عظمت رفتہ، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، وغیرہ کتابیں ہیں، العقد الثمین میں شائع شدہ فہرست کے مطابق انکی دیگر کتابوں میں،

جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول للبروی (تعلیق و تحقیق) حج کے بعد، حیات جمیلہ یا اسلامی نظام زندگی، دیار پورب میں علم اور علماء، طبقات الحجاج، مآثر و معارف، معارف القرآن، منتخب التفاسیر، ندائے حرم، علی و حسین، تذکرۂ مبارکپور ہیں۔

غیر مطبوعہ کتابوں میں بنات اسلام، اور علمائے اسلام کی خونیں داستانیں ہیں۔

وہ روزنامہ انقلاب بمبئی میں روزانہ قریب تیس سال تک، احوال و معارف، کے عنوان سے آیات و احادیث پر مشتمل کالم بھی لکھتے رہے جنھیں جمع کیا جائے تو کئی کتابیں تیار ہو جائیں۔

کتابوں کی اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ تصنیف و تحقیق میں صرف کیا اور بقول انکے رجال السند انکی نصف عمر کی محنت کا نتیجہ ہے۔

ان کی اردو عربی دونوں زبان کی تحریروں میں انکی شخصیت کی سادگی و پُرکاری بے تکلفی و شگفتگی موجود ہے اور ان میں ایک خاص اثر ہے۔ عرب و ہند تعلقات اور ساتویں صدی ہجری تک کی اسلامی شخصیات کے سوانح اور تاریخ کے مرجع و ماخذ کے طور پر قاضی اطہر صاحب مرحوم کی مستند تحریریں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ اور ان کی بدولت انکی پاکیزہ شخصیت کی یاد بھی تازہ ہوتی رہے گی۔ ؎

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو!

مولانا ظفر احمد صدیقی
شعبۂ اردو ہندو یونیورسٹی بنارس

قاضی صاحب بحیثیت مورخ و مصنف

فاضل اجل و عالم بے بدل حضرت مولانا قاضی ابو المعالی عبد الحفیظ اطہر مبارکپوری (۱۳۳۴ھ - ۱۴۱۷ھ / ۱۹۱۶ء - ۱۹۹۶ء) ایمان اور عمل صالح کی جامعیت علمی و تصنیفی مشاغل اور سادہ و متواضع سیرت و شخصیت کے لحاظ سے بلا شبہ سلف صالحین کی نظیر تھے۔ دیار پورب، خطۂ اعظم گڈھ اور سرزمین مبارکپور، ان پر جس قدر بھی فخر کریں کم ہے۔ تاریخ و طبقات اور سیر و تراجم کے مختلف گوشوں پر ان کی گراں قدر تصانیف و مقالات کیفیت و کمیت ہر دو لحاظ سے عالم اسلامی کے کتب خانے میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ نامساعد حالات ناسازگار ماحول اور بے سرو سامانی کے باوجود انھوں نے جو بلند پایہ علمی کارنامے انجام دیے ہیں وہ تحقیقی و تصنیفی اداروں کے ان ارکان اور بڑے بڑے مراکز علمی کے ان وابستگان کے لیے تازیانۂ عبرت ہیں جو "وادیِ غیر ذی زرع" کی عملی تفسیر ہیں، یعنی ایک مدت سے ان کا قلم خشک اور کشت زار علم ویراں ہے۔

؎ باوجودِ یک جہاں ہنگامہ، پیدائی نہیں

قاضی صاحب کے علمی کارناموں کی تعیینِ قدر اور تجزیہ و تبصرے کے لئے وسیع علم، غائر مطالعے اور کم از کم ایک مکمل کتاب کی وسعت درکار ہے اور

اس ناچیز کی بے بصری و ہیچ مدانی کا حال یہ ہے کہ وہ موصوف کے بہت سے
مراجع و مآخذ کا صورت آشنا بھی نہیں۔ ایسی صورت میں قاضی صاحب کی
فتوحاتِ علمیہ کے بارے میں لب کشائی " تحسین ناشناس " کے مرادف ہوگی۔
اس لئے پیش نظر مضمون کو ان کے ایک خورد سال عقیدت کیش کی جانب سے
محض ایک طالب علمانہ خراج عقیدت تصور کیا جائے۔

قاضی صاحب کی تمام حیثیتوں میں سب سے نمایاں حیثیت اسلامی ہند
کے ابتدائی عہد کے مورخ کی ہے۔ ابتدائی عہد سے مراد آغاز اسلام سے لیکر
خاتمۂ خلافت بنو عباس تک کا دور ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی ہند کے اس دور
کی تاریخ پر صدیوں سے تاریکی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ قدیم عرب مورخین
میں سے بیشتر نے سندھ و ہند کے علاقہ جات اور یہاں کی ابتدائی فتوحات
اور ثقافتی روابط کو چنداں قابل اعتنا تصور نہیں کیا اور اگر بعض لوگوں نے خال
خال اس طرف توجہ کی بھی تو ان کی کتابیں دستبرد زمانہ کی نذر ہوگئیں۔ جہاں تک
ہندی مورخین کا تعلق ہے تو ان کی تمام تر تحریریں عہد غزنوی یا زمانۂ مابعد سے
متعلق ہیں۔ گمان غالب یہ ہے کہ یہ لوگ اسلامی ہند کے ابتدائی ادوار کی تاریخ
سے چنداں واقفیت ہی نہیں رکھتے تھے۔ یہاں قاضی صاحب کی ہمت اور حوصلے
کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے اپنی علمی جد و جہد اور تگ و تاز کا میدان اسی عہد کی
تاریخ کو قرار دیا اور پھر اس بے آب و گیاہ صحرا میں اپنے سفر کو برابر جاری رکھا۔
یہاں تک کہ متعلقہ عہد کی مکمل تاریخ جدید معیار و مذاق کے مطابق مرتب ہوگئی۔
جس میں جنگی مہمات و فتوحات کی تفصیلات بھی ہیں اور ملکی و تمدنی احوال و کوائف
کی جزئیات بھی۔ اس کے علاوہ علمی و تہذیبی سرگرمیوں کا جائزہ بھی ہے۔

قاضی صاحب کو ادب اور لغت کے علاوہ تاریخ، طبقات اور سیر و تراجم
کی کتابوں کے مطالعے کا ذوق اور ان سے شغف زمانۂ طالب علمی سے ہی تھا۔ چنانچہ

۱۳۷۷ھ / جون ۱۹۵۸ء میں منظر عام پر آیا۔

قاضی صاحب نے اس کتاب میں عہد رسالت سے لے کر ساتویں صدی ہجری تک کے ان تمام علما، محدثین، رواۃ، فقہا، مشائخ، ادبا، شعرا، متکلمین، فلاسفہ، اور مختلف پیشوں سے متعلق اشخاص کا ذکر کیا ہے، جن کا مولد ومنشا سندھ و ہند تھا۔ اسی طرح ان لوگوں کے تراجم بھی قلم بند کئے ہیں جن کی ولادت اور نشوونما کہیں اور ہوئی، لیکن ان کے آبا، واجداد خطۂ سندھ و ہند سے تعلق رکھتے تھے۔

یہ کتاب ۲۲۸ صفحات پر مشتمل ہے اور عربی زبان میں ہے۔ لیکن اس میں قاضی صاحب کی اپنی عبارتیں کم ہیں۔ اس کی تصریح انھوں نے مقدمۂ کتاب میں بھی کردی ہے۔ لیکن جہاں کہیں اور جتنا کچھ انھوں نے لکھا ہے، وہ صاف ستھری اور شستہ عربی میں لکھا ہے۔ کہیں بھی عجمیت یا عجز بیان کا احساس نہیں ہوتا۔ دراصل قاضی صاحب نے یہ کتاب قدما کے طرز پر لکھی ہے اور شروع سے آخر تک ان کا انداز برقرار رکھا ہے۔

اس کتاب کی اصل قدر و قیمت موضوع کے ساتھ کامل انصاف اور تراجم کے احاطہ و استیعاب میں پنہاں ہے۔ مصنف نے اپنے دائرہ کار میں داخل اشخاص واعلام کے تراجم فراہم کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے۔ اس سلسلے میں مصنف موصوف کی سعی و جستجو اور تلاش و تفحص کا اندازہ لگانا ہو تو "رجال السند والہند" کا موازنہ مولانا عبدالحی حسنی کی معرکہ آرا تصنیف "نزہۃ الخواطر" کی ابتدائی جلدوں سے کرنا چاہیئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نزہۃ الخوطر ہندوستانی علما کے تراجم پر نہایت بلند پایہ کتاب ہے اور اس کے مصنف کو فضل تقدم بھی حاصل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ اعتراف بھی کرنا چاہیئے کہ مراجع و مآخذ کی قلت اور بعض دیگر وجوہ کی بنا پر اس میں ابتدائی چار صدیوں کے ہندوستانی علما کے تراجم خاطر خواہ نہیں آسکے ہیں۔ "کم ترک الأول للآخر" کے بمصداق

قاضی صاحب ۔ رجال السند والہند ، کے ذریعے اس کمی کی تلافی کردی ہے ۔ اس سلسلے میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی علیہ الرحمہ کے یہ دو جملے سند اور شہادت کا درجہ رکھتے ہیں :

" حضرت العلامہ قاضی ابوالمعالی اطہر مبارکپوری کی تصنیف ۔ رجال السند والہند ، کے مطالعے سے مستفید اور محظوظ ہوا ۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے ۔ آپ نے ہند و سندھ کے مایۂ فخر و امتیاز مگر تاریخی مظلوم گروہ کے تراجم و تذکرہ کو ایک منظم صورت میں پیش کر کے ایک بڑے خلا کو پورا فرمایا ..... "

(مکتوب بنام قاضی صاحب)

اس کتاب کی اہمیت کا ایک پہلو اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اس نے قاضی صاحب کے آئندہ علمی سفر کا رُخ اور اس کی منزلیں متعین کیں ۔ اس کی قدرے توضیح یہ ہے کہ رجال السند والہند ، کی ترتیب و تدوین کے دوران موصوف نے حدیث ، رجال ، سیرت و مغازی ، تاریخ ، طبقات ، تذکرہ و تراجم ، جغرافیہ ، لغت ، شعر و ادب اور بعض دیگر علوم و فنون کی سو سے زائد امہات کتب کا بار بار مطالعہ کیا اور اکثر و بیشتر کو بالاستیعاب پڑھا ، بلکہ یوں کہیے کہ حتی الامکان پوری طرح کھنگال ڈالا ۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ اپنے موضوع اور اس کے متعلقات پر پوری طرح حاوی ہو گئے اور اسلامی ہند کے ابتدائی چار سو سالہ عہد کی تاریخ کا اجمالی خاکہ ان کے ذہن میں مرتب ہو گیا ، جس وہ برابر رنگ آمیزی و گل کاری کرتے اور اسے خوب سے خوب تر بناتے رہے ۔

" رجال السند والہند ، کے بعد قاضی صاحب نے اپنی فکر و نظر کا مرکز و محور " عہد رسالت میں عرب و ہند " کو قرار دیا اور ابتداءً اسے دار المصنفین اعظم گڈھ کے علمی و تحقیقی ترجمان ماہنامہ " معارف " میں اس کے مختلف ابواب شائع کرائے

بعدہٗ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ نے اپنے مؤقر ادارے ندوۃ المصنفین دہلی کی جانب سے اسے کتابی شکل میں شائع کیا۔ اس کام کی تکمیل رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ یک ہو چکی تھی، لیکن اشاعت رمضان ۱۳۸۴ھ / جنوری ۱۹۶۵ء میں عمل میں آئی۔ چونکہ دار المصنفین اور ندوۃ المصنفین دونوں ہی ملک کے اہم ترین علمی وتصنیفی ادارے تھے اور قاضی صاحب یہ تصنیف ان دونوں اداروں کے توسط سے منظر عام پر آئی تھی پھر موضوع کی ندرت اور مصنف کا حزم واحتیاط نیز تحقیقی انداز اس پر مستزاد تھا، اسلئے کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور علمی حلقوں میں اسے قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

"رجال السند والہند" کے برخلاف قاضی صاحب نے یہ کتاب اردو زبان میں لکھی، اس لیے ان کے علم کا فیضان عام اور قدر شناسوں کا حلقہ بھی وسیع ہوا پھر مصنف کو ایک معتمد علیہ ناشر اور ناشر کو ایک بلند پایہ مصنف ہاتھ آیا، اسلئے آئندہ کی تصنیفی سرگرمیوں کے لئے راہیں ہموار ہوئیں۔ چنانچہ قاضی صاحب کی اگلی کتاب "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی ان دو اُردو کتابوں کی اشاعت کے بعد وہ پھر عربی کی طرف متوجہ ہوئے، اور اپنے وسیع مطالعے نیز متعلقہ مآخذ ومراجع پر کامل دسترس کے نتیجے میں، محض ایک سال کی قلیل مدت میں "العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین" کے نام سے ایک جامع کتاب مرتب کر دی۔ اس کا سالِ اشاعت ۱۹۶۸ء ہے۔ اس دوران انھوں نے اسلامی ہند کے ابتدائی ادوار کی بعض اہم شخصیات قابل ذکر مراجع ومآخذ اور بعض دیگر امور سے متعلق تحقیقی مقالات کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ چنانچہ اس سلسلے کے آٹھ منتخب مقالات کا مجموعہ "اسلامی ہند کی عظمت رفتہ" کے عنوان سے ۱۹۶۹ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس کے بعد موصوف کی تین کتابیں "خلافت راشدہ اور ہندوستان"، "خلافتِ

بنوامیہ اور ہندوستان " اور " خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان " بالترتیب ۱۹۶۲ء ، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئیں۔ اس طرح انھوں نے اسلامی ہند کے ابتدائی ادوار کی تاریخ نگاری کا منصوبہ نہایت حسن وخوبی کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہونچادیا۔

اہل علم واقف ہیں کہ اردو میں جدید طرز تاریخ نگاری کے بانی علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ انھوں نے یوروپین مصنفین کے انداز پر المامون (۱۸۸۹ء) اور پھر الفاروق (۱۸۹۸ء) مرتب کی پھر انھی کے طرز پر مولوی عبدالرزاق کانپوری نے اپنی تاریخی کتابیں لکھیں، جن میں البرامکہ (۱۸۹۷ء) کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ پھر مولانا سید سلیمان ندوی اور دیگر رفقائے دارالمصنفین نے جدید تاریخ نگاری کی اس روایت کو مزید فروغ واستحکام بخشا۔ قاضی صاحب ان کتابوں سے ناواقف نہ تھے، بلکہ جیسا کہ انھوں نے اپنی خود نوشت میں تصریح کی ہے، وہ دور طالب علمی ہی میں دارالمصنفین کی بیشتر کتابوں کا مطالعہ کرچکے تھے، اسلئے یقین ہے کہ ایک صاحب بصیرت اور باشعور قاری کی طرح اپنے پیش رو مصنفین کے اسلوب نگارش اور انداز تحریر سے وہ متاثر اور فیض یاب بھی ہوئے ہونگے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے کسی خاص مصنف یا کسی خاص تصنیف کو سامنے رکھ کر اس کا چربہ اتارنے کی کوشش ہرگز نہیں کی، بلکہ موضوع و مواد اور ہیئت واسلوب ہر دو لحاظ سے شعوری طور پر اپنی راہ الگ نکالنے کی سعی بلیغ کی اور اس باب میں خود اپنے ذوق اور مطالعے کو اپنا ہادی و رہنما بنایا۔ بقول میر تقی میر ؎

دلیل اس بیاباں میں دل ہی ہے اپنا
نہ خضر و کلیدیاں، نہ رہبر نہ ہادی،

اس بیان کی صداقت کا اندازہ لگانے کیلئے مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی

محققانہ اور گراں مایہ تصنیف "صدیق اکبر" کا مطالعہ علامہ شبلی کی "الفاروق"
کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیے۔ اگرچہ مولانا اکبر آبادی نے "الفاروق" اور اس کے
مصنف کا کہیں حوالہ نہیں دیا ہے۔ لیکن پھر بھی صاف محسوس ہوتا ہے کہ "صدیق
اکبر" "الفاروق" کا متنبّع ہے۔ اس کے برخلاف قاضی صاحب کی کسی کتاب پر کسی
سابق تصنیف کی مماثلت کا گمان نہیں گذرتا۔ یہی نہیں بلکہ بحیثیت مورخ و مصنف
انھوں نے متعدد خصائص و امتیازات بھی قائم کئے ہیں جنھیں اجمال و اختصار کے
ساتھ ہم آئندہ صفحات میں پیش کرتے ہیں۔

(الف) جس عہد اور جس طرز کی تاریخ نگاری کا انھوں نے بیڑا اٹھایا اور اسے
پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے، اس باب میں وہ سبّاق غایات ہیں۔ اب تک ان
کے انجام دیئے ہوئے کارناموں کے کسی پہلو پر کوئی اضافہ تو درکنار، پچھلے
چالیس برسوں میں کسی نے ان سے ہم عناں ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کیا۔ دراصل
قاضی صاحب کے حدود مملکت میں داخل ہونے کیلئے ان صدہا کتابوں کے جنگلوں
سے گذرنا، بلکہ اس میں ایک مدت مدید بسر کرنا ضروری ہے۔ جن میں موصوف نے
اپنے مراجع و مآخذ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بنیادی شرط کا ہی
پورا کرنا نہایت دشوار گذار ہے۔ اس لئے اگلے مراحل کی نوبت ہی نہیں آپاتی ؎

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کسے کہ تیری تمنا کرے کوئی (غالب)

(ب) قاضی صاحب کی یہ خوبی بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہ کسی خاص نظریے کے
اثبات یا اس کی نفی کے لئے نہ مطالعہ کرتے ہیں نہ لکھتے ہیں۔ اس بات کو ہم یوں
بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ کسی ذہنی تحفظ یا پیش بندی کے بغیر کھلے ذہن اور کھلی طبیعت
کے ساتھ کتابوں کا مطالعہ کرتے اور پھر حاصل مطالعہ کو پیش کر دیتے ہیں۔ اس لئے
نہ تو خود کسی مغالطے میں مبتلا ہوتے ہیں اور نہ اپنے قاری کو اپنے مخصوص نظریات

و افکار کی زنجیروں میں جکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قاضی صاحب کے اس وصف خاص کی داد صحیح معنوں میں وہ لوگ دے سکتے ہیں جنھوں نے مستشرقین یا ان کے تربیت یافتگان کی کتابیں پڑھی ہوں اور پھر ان کی خباثتوں اور ریشہ دوانیوں کا اندازہ لگایا ہو کہ کس طرح یہ لوگ اپنی ہر بات بظاہر معقول و مدلل طریقے سے کہتے اور حوالوں کے انبار لگا دیتے ہیں، لیکن وہ تصویر کا صرف ایک رُخ، بلکہ بسا اوقات اس کا مسخ شدہ روپ ہوتا ہے۔

افسوس ہے کہ ہمارے بعض نیک نیت اور مخلص مصنفین نے بھی بعض صالح مقاصد کے حصول کے لئے یہی غلط طریق کار اختیار کیا ہے۔ حالانکہ مقاصد کے صلاح کے ساتھ ساتھ طریق کار کی درستگی کا لحاظ رکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ بصورت دیگر اول الذکر گروہ کی طرح ثانی الذکر جماعت کی تحریروں پر بھی پوری طرح اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

قاضی صاحب کی تمام تصانیف اس قسم کی بے اعتدالیوں سے پاک و صاف ہیں۔ ان کے یہاں ہر بڑے سے بڑے مصنف کی طرح تسامحات اور فرو گذاشتوں کا امکان تو ہے، لیکن دیدہ و دانستہ حقائق پر پردہ ڈالنے یا اسے کسی خاص رُخ یا زاویے سے پیش کرنے کا رجحان ہرگز نہیں پایا جاتا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہم قاضی صاحب کے حوالوں پر پوری طرح اعتماد اور نتائج بحث سے بالکلیہ اتفاق کر سکتے ہیں۔ بلاشبہ یہ قاضی صاحب کا بہت بڑا اکتساب ہے۔

(ج) گذشتہ صدی میں یورپ سے بہت سے مذموم نعروں کی طرح وطنیت و قومیت کے بے بنیاد راگ بھی الاپے گئے اور مشرقی اقوام و ممالک نے حسب معمول ان پر بھی آمنّا و صدقنا کہا اور پھر انھی وطنی و قومی عصبیتوں کی بنیادوں پر ان اقوام و ممالک نے از سر نو اپنی تاریخیں بھی مرتب کیں، یہاں تک کہ ایک

زمانے میں خود مصر سے "نحن ابناء الفراعنة" کا نعرہ بلند کیا گیا۔ دوسری طرف ہمارے برادران وطن بھی وطنیت و قومیت کے مغربی عقیدوں پر ہی ایمان رکھتے اور اسی نقطۂ نظر سے اپنے ملک کی تاریخ لکھنا اور پڑھنا پسند کرتے ہیں۔

قاضی صاحب نے اس قسم کی ہر افراط و تفریط سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنی محبت و وفاداری کا اصل مرکز و محور اسلام اور شارع علیہ السلام کی ذات والاصفات کو قرار دیا ہے اور وطن، ابنائے وطن اور اشیائے وطن سے تعلق و محبت کو اسی مرکز سے وابستہ کر رکھا ہے۔

نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز (اقبالؔ)

یہ کیفیت یوں تو قاضی صاحب کی تمام تحریروں میں موجود ہے، لیکن اس کی خاص کر جلوہ گری دیکھنی ہو، تو "عرب و ہند عہد رسالت میں" "خلافتِ راشدہ اور ہندوستان" اور "اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

(د) اردو میں جدید تاریخ نگاری کے زمانۂ رواج سے لے کر اب تک یہ طریقہ چلا آتا ہے کہ ہمارے مورخین و مصنفین اپنی تلاش و جستجو کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے قدما کی طرزِ نگارش کے عیوب بیان کرتے ہیں، قلت مواد کا رونا روتے ہیں، پھر ان پر بے خبری و بے بصری کا الزام بھی عائد کر دیتے ہیں، لطف یہ ہے کہ اس تمام نوحہ و ماتم کے بعد انھی قدما کی کتابوں سے اخذ و اقتباس کرتے ہیں۔ ان کی عبارتیں نقل کرتے ہیں اور موقع بہ موقع ان کے حوالے دیتے چلے جاتے ہیں۔

قاضی صاحب نہ صرف یہ کہ اس ابتلائے عام سے محفوظ ہیں، بلکہ انھوں نے متاخرین کی غلط فہمیوں کا ازالہ اور قدما کا بہترین دفاع بھی کیا ہے۔ چنانچہ "خلافتِ راشدہ اور ہندوستان" کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے اسلامی، دینی، ملّی، سیاسی، تمدنی، علمی، فکری

ادبی، لسانی، اجتماعی اور انفرادی پہلوؤں میں سے ہر ایک پر الگ الگ تصانیف کے انبار لگائے ہیں . . . مثلاً غزوات و فتوحات کے موضوع پر صرف رزم کی داستانیں مرتب کیں۔ اس میں علمی و فکری تاریخ کو نہیں ملایا اور تہذیب و تمدن کے مباحث پر جو کتابیں تصنیف کیں، ان میں صرف تہذیبی و تمدنی حالات درج کیے . . .

قدما کے اس عام طرز تاریخ نویسی کی وجہ سے بعض لوگوں کی طرف سے شکوہ ہونے لگا کہ ہماری تاریخوں میں غزوات و فتوحات اور حکومت امارت کی تفصیلات تو نہایت شرح و بسط سے پائی جاتی ہیں۔ مگر تمدنی، فکری، علمی، معاشی، معاشرتی باتیں اور مقامی و وقتی احوال نہیں ملتے ہیں۔ حالانکہ اس شکوے کی وجہ ان موضوعات کی مستقل تصانیف سے کوتاہ نظری اور صرف سیر و مغازی کی کتابوں ہی میں سب کچھ تلاش کرنے کی سعی ناکام اور ذوق خام ہے۔ . . .
اگر کوئی مورخ چاہے تو کسی ایک ملک یا علاقے کی اسلامی تاریخ کے ہر پہلو کو ان کتابوں سے چھان بین کر کے نمایاں کرے۔ غزوات و فتوحات کے لئے سیر و مغازی کا مطالعہ کرے، دینی و علمی رجال کے لئے طبقات و تذکرہ کی کتابیں پڑھے۔ نظام حکومت کے لئے خراج اموال اور قوانین کا کتب خانہ کھنگالے۔ عام حالات کے لیے ادب و محاضرات اور متعلقہ کتابوں کی ورق گردانی کرے اور ان سے اخذ و اقتباس کر کے جامع اور مستوعب تاریخ مرتب کرے" (ص ۱۷، ۱۸، ۱۹)

مندرجہ بالا اقتباس سے تاریخ نویسی کے باب میں قاضی صاحب کے طرز اور طریق کار کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ کس طرح وہ مختلف النوع موضوعات کی کتابوں کی چھان بین کر کے اپنے کام کی جزئیات تلاش کرتے اور پھر انھیں مناسب ترتیب و تہذیب

کے ساتھ پیش کر کے ایک جامع تاریخ تیار کر دیتے تھے۔

(۴) قاضی صاحب کے بیانات قیاس آرائی اور ظن و تخمین پر مبنی نہیں ہوتے وہ اپنی ہر بات حوالوں کی روشنی میں اور مدلل طور پر کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی روایات کے جمع و استیعاب کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ اب اگر بعض روایات کمزور اور منکر نظر آتی ہیں، تو ان کے ضعف و نکارت کی تصریح کر دیتے ہیں۔ روایات میں اختلاف و تعارض کی نشان دہی کرتے ہوئے اس کے اسباب بھی بیان کرتے ہیں۔ اس سلسلے کی دو مثالیں ان کے معرکہ آرا مقالے "فاتح ہند حضرت محمد بن قاسم ثقفی" سے پیش کی جاتی ہیں۔ محمد بن قاسم اور حجاج بن یوسف کے مابین عزیزداری کی نوعیت سے بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> حضرت محمد بن قاسم، حجاج بن یوسف کے حقیقی چچا زاد بھائی تو نہیں ہیں البتہ خاندان اور رشتے میں چچازاد بھائی ضرور ہوتے ہیں لیکن یہ جو مشہور ہے کہ وہ حجاج بن یوسف کے داماد بھی ہیں اور حجاج کی بیٹی ان سے بیاہی تھی، اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، صرف چچ نامہ میں اس کا ذکر افسانوی انداز میں پایا جاتا ہے۔ اس میں ہے کہ "محمد بن قاسم پسر عم او بود، و داماد نیز بود"، پھر ایک حکایت درج ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دن حجاج نے خوش ہو کر محمد بن قاسم سے کہا کہ تم مجھ سے اپنی کوئی حاجت طلب کرو، محمد بن قاسم نے کہا کہ آپ مجھے کسی مقام کا امیر و حاکم بنا کر اپنی صاحبزادی سے میری شادی کر دیں۔ یہ سن کر حجاج نے خفگی میں محمد بن قاسم کے سر پر چھڑی ماردی، جس کی وجہ سے ان کا عمامہ گر گیا پھر حجاج نے وہی بات کہی اور محمد بن قاسم نے اپنی بات دہرائی اور جب تیسری بار یہ گفتگو ہوئی تو حجاج نے کہا کہ اچھا میں اس شرط پر تم سے اپنی بیٹی کی شادی کرتا ہوں کہ تم لشکر لے کر فارس یا ہندوستان جاؤ اور

اور اس کو فتح کر کے نظم و ضبط قائم کرو اور مالِ غنیمت بھیجو۔ حجاج بن یوسف کے رعب و داب اور محمد بن قاسم کی ذات سے یہ بات بالکل بعید از قیاس ہے۔ پھر انساب و تذکرہ اور تاریخ کی کتابوں میں حجاج کی بیٹی سے محمد بن قاسم کے نکاح کا واقعہ نہیں ملتا، بلکہ حجاج کی اولاد میں اس کی کسی بڑی لڑکی کا ذکر تک نہیں ہے۔ ابن قتیبہ نے حجاج کی اولاد میں یہ نام دیئے ہیں (۱) محمد (۲) ابان (۳) عبدالملک (۴) ولید اور (۵) جاریہ (ایک بچی)

اور ابن حزم نے ان کے یہ نام لکھے ہیں (۱) محمد (۲) عبدالملک (۳) ابان (۴) سلیمان اس میں ولید کے بجائے سلیمان ہے اور کسی بچی کا نام بھی نہیں ہے " (اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ ص ۹۷)

مذکورہ بالا اقتباس سے قاضی صاحب کی عالمانہ و محققانہ طرزِ تاریخ نویسی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ موصوف نے اسی انداز کی محققانہ بحث ہندوستان میں امارت کے وقت محمد بن قاسم کی عمر سے متعلق بھی کی ہے اور دلائل کی روشنی میں اس مشہورِ عام قول کی تردید کر دی ہے کہ ہندوستان کی امارت و فتوحات کے وقت انکی عمر صرف سترہ سال تھی۔ پھر یہ بتایا ہے کہ ان کی یہ عمر دراصل فارس کی امارت کے وقت تھی۔ یہ پوری بحث اصل کتاب میں پڑھنے اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم یہاں صرف اس کا ایک مختصر سا اقتباس نقل کرنا چاہتے ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں :

" ہمارے مورخوں کے قول کو مان کر محمد بن قاسم کی عمر ۹۲ھ یا ۹۳ھ میں فتحِ ہندوستان کے وقت صرف سترہ سال تسلیم کر لی جائے تو ۸۳ھ میں جب کہ وہ فارس کے امیر بنائے گئے، انکی عمر چھ سات سال ماننی پڑے گی، جو ایک مضحکہ خیز بات ہو گی۔ اس عمر میں کسی بچے کو ملک کی ولایت اور غزوات کی امارت تو دور کی بات ہے، گھر کی کوئی معمولی سی ذمہ داری

بھی نہیں دی جاتی ہے " (اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ص۱۰۷)

گذشتہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا گیا، اس سے اسلامی ہند کے ابتدائی ادوار کی تاریخ سے متعلق قاضی صاحب کے کارناموں نیز بحیثیت مورخ و مصنف انکے خصائص و امتیازات کا کسی قدر اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قاضی کی دوسری اہم حیثیت دیار پورب یعنی اودھ، الہ آباد، جون پور، بنارس، اعظم گڑھ، غازی پور اور ان کے اطراف و جوانب کے علماء و فضلاء کے تذکرہ نگار اور یہاں کی علمی سرگرمیوں کے تاریخ نگار کی ہے۔

گمانِ غالب ہے کہ تاریخ بغداد، تاریخ جرجان وغیرہ کے مطالعے نیز کتابوں میں تاریخ دمشق، تاریخ نیشاپور وغیرہ کے حوالے دیکھ کر قاضی صاحب کے دل میں اپنے وطن مبارک پور کی تاریخ اور یہاں کے علماء کے احوال قلم بند کرنے کا داعیہ پیدا ہوا۔ بہرحال انکی خود نوشت سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۴۸ء میں قیام بہرائچ کے دوران تذکرہ علمائے مبارکپور کے لیے انھوں نے ابتدائی معلومات جمع کی تھیں۔ غالباً بعد میں موصوف نے اس دائرے کو مزید وسعت دے دی۔ چنانچہ ان کے مسودات میں ایک بیاض پر "تذکرہ مشاہیر اعظم گڈھ و مبارکپور" درج ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسلامی ہند متعلق تصانیف میں انہماک و مشغولیت نیز خاطر خواہ اور حسب منشا مواد فراہم نہ ہونے کے سبب مبارک پور اور اعظم گڈھ سے متعلق کسی مستقل کتاب کی اشاعت ان کے لیے ممکن نہ ہو سکی۔ اسلئے انھوں نے دیار پورب کے مشاہیر سے متعلق رسائل و مجلات میں الگ الگ مقالات لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔

ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ تذکرہ علمائے مبارک پور مرتب ہو گیا اور ۱۹۷۴ء میں اس کی اشاعت عمل میں آئی اس کے بعد متذکرہ بالا مقالات کا مجموعہ "دیار پورب میں علم اور علماء" کے نام سے ۱۹۷۹ء میں منظر عام پر آیا۔ قاضی صاحب نے اس مجموعے کے آغاز میں "دیار پورب کے چار علمی ادوار" کے عنوان سے اس

اس خطے کی سات سو سالہ علمی تاریخ بالاجمال بیان کردی ہے، سو صفحات پر مشتمل یہ مضمون درحقیقت پوری کتاب کی جان ہے۔ اس کے مطالعے سے قاضی صاحب کے مورخانہ ذہن کی زرخیزی اور گہرائی و گیرائی کا پورا پورا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس مجموعے میں جن مشاہیر اہل علم کے احوال و آثار سے بحث کی گئی ہے، ان کے نام بالترتیب یہ ہیں (۱) قاضی شہاب الدین دولت آبادی (۲) راجہ سید حامد شاہ مانک پوری (۳) میر علی عاشقاں سرائے میری (۴) ملا محمود جون پوری (۵) مولانا حافظ امان اللہ بنارسی (۶) مولانا شیخ غلام نقشبند گھوسوی (۷) مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی (۸) مولوی حسن علی ماہلی۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد بھی قاضی صاحب نے اس دیار سے متعلق اپنے مضامین و مقالات کا سلسلہ جاری رکھا۔ چنانچہ اس سلسلے کے بعض مقالات کے عنوانات درج ذیل ہیں:

(۱) خانوادۂ علمائے رسول پور (۲) خانوادۂ علمائے سریاں
(۳) مولوی حسن علی اور چند دیگر ماہلی علماء (۴) مشائخ جیتن پور
(۵) خانوادہ مشائخ بھیرا و لہرا، مبارک پور (۶) مشائخ سارین
(۷) دیار اعظم گڑھ کے چند غیر معروف مشائخ۔

ہندوستانی علماء و فضلاء کی حیات و خدمات کی طرف عموماً اور دیار پورب کے مشاہیر کے احوال و آثار کی جانب خصوصاً سب سے پہلے میر غلام علی آزاد بلگرامی نے توجہ فرمائی اور اپنی عربی تصنیف سبحۃ المرجان نیز فارسی تصنیف مآثر الکرام میں اس سلسلے کی بنیادی معلومات فراہم کیں۔ اس کے بعد مولانا عبدالحی حسنی نے نزہۃ الخواطر میں عام علمائے ہند کے تراجم کے ساتھ ساتھ خطۂ پورب کے علماء کے احوال بھی قلم بند فرمائے۔ اسکے بعد مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی کے مقدمے میں اعظم گڑھ کی تاریخ کے ساتھ ساتھ یہاں کے مشہور

قصبات اوران سے متعلق مشہور شخصیتوں کے مختصر حالات بھی تحریر فرمائے۔
اس کے علاوہ خطۂ پورب کی علمی سرگرمیوں اور ترقیات کے چار ادوار قائم
کرتے ہوئے ہر دور کے مشاہیر ارباب فضل وکمال کا مختصر تعارف بھی کرایا۔
اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قاضی صاحب نے دیار پورب کے چار علمی ادوار
کا خاکہ حیات شبلی کے مذکورہ بالا مقدمے سے حاصل کیا، پھر اس میں آب و رنگ
بھرنے کے لئے مقدمے کے علاوہ سبحۃ المرجان، ماثر الکرام اور نزہۃ الخواطر سے بھی
مدد لی، لیکن اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ موصوف
نے اپنے پیش روؤں کی کتابوں سے نقل واقتباس کے بجائے پچاس کے قریب
قلمی و مطبوعہ کتابوں سے مراجعت کر کے سابقہ معلومات پر بیش بہا اضافے فرمائے
اس کے علاوہ مشہور علمی و دینی خانوادوں کے تذکروں میں ان کے اساتذہ و تلامذہ
اور معاصرین و متعلقین کو بھی سمیٹ لیا، جس سے پورے دیار اور پورے دور کی
علمی سرگرمیوں کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ مزید برآں بہت سی ایسی شخصیتوں
اور خانوادوں کے تعارف کی خدمت بھی انجام دی جو ماضی کے دھندلکوں میں
گم ہو چکے تھے۔
یہ گفتگو دیار پورب میں علم اور علماء اور دیگر مضامین و مقالات کے حوالے
سے تھی، جہاں تک تذکرہ علمائے مبارکپور کا تعلق ہے تو وہ سراسران کی
کدوکاوش اور تلاش وجستجو کا ثمرہ ہے (اس کی کسی قدر تفصیل خود مقدمۂ
کتاب میں موجود ہے) اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مقدمۂ
حیات شبلی میں مبارکپور کے بارے میں صرف یہ دو جملے ملتے ہیں۔
"محمد آباد کے قریب مبارک پور نام کا بڑا قصبہ ہے، جو پرانے زمانے
سے پارچہ بافی کا مرکز ہے اور جہاں پچھلے زمانے میں چند نامور
علماء پیدا ہوئے ہیں" (ص ۵۷)

واضح رہے کہ قاضی صاحب کا تذکرہ علمائے مبارک پور ۲۹۲ صفحات کو محیط ہے ۔ یہاں اس امر کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا کہ قاضی صاحب کی تحریروں اور گفتگوؤں سے ان کے بعض خورد سال معاصرین اور احباب کو بھی اپنے دیار کے علماء و فضلاء پر کام کرنے کا حوصلہ ملا ۔ اس ضمن میں تذکرہ علمائے اعظم گڈھ مصنفہ مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند اور تذکرہ علمائے بنارس مصنفہ مولانا وسیم احمد بنارسی استاذ جامعہ اسلامیہ بنارس کے نام بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں ۔

قاضی صاحب کی تمام تصانیف اگرچہ مستقل تذکرے اور تجزیہ و تبصرے کی متقاضی ہیں لیکن ایک مضمون کے محدود صفحات اس حق کی ادائگی سے قاصر ہیں تاہم یہاں ان کی ایک اہم کتاب تدوین سیر و مغازی کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے ۔

یہ کتاب شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند کی جانب سے ۱۴۱۰ھ/۱۹۹۰ء میں اشاعت پذیر ہوئی ۔ اس کی ضخامت ۳۲۰ صفحات ہے ۔ قاضی صاحب میں اس کتاب کے لکھنے کا داعیہ مشہور جرمن مستشرق پروفیسر جوزف ہارویز کی کتاب پڑھ کر پیدا ہوا ۔ اصل کتاب جرمن میں تھی ، اس کا عربی ترجمہ حسین نصار نے المغازی الأولیٰ و مؤلفوھا کے نام سے کیا ، عربی سے اس کتاب کو پروفیسر نثار احمد فاروقی نے اردو میں منتقل کیا اور اس کا نام سیرت نبوی کی ابتدائی کتابیں اور ان کے مؤلفین رکھا ۔ قاضی صاحب کے سامنے ہارویز کی کتاب کا یہی اردو ترجمہ تھا موصوف نے راقم الحروف کو یہ اردو ترجمہ مطالعے کے لئے عنایت کیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا تھا کہ میرا بھی ارادہ اس موضوع پر کچھ کام کرنے کا ہے ۔ یہ موضوع قاضی صاحب کے سابقہ دونوں موضوعات اسلامی ہند کی ابتدائی تاریخ اور دیار پورب میں علم اور علماء سے مختلف تھا ، گویا ان کے رہرو قلم کو ایک نئے دیار کی سیاحت کیلئے کمر ہمت باندھنی تھی ، اس لئے ساز و برگ سے آراستہ ہونے میں انھیں خاصا وقت لگا ۔

چنانچہ مقدمۂ کتاب میں انھوں نے تصریح کی ہے کہ اس کی تحریر و تسوید میں آٹھ سال کی مدت صرف ہوئی۔ بعض موانع اور مشغولیات سے قطع نظر زیادہ وقت صرف ہونے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ قاضی صاحب روا روی اور عجلت پسندی کے کام کے عادی نہ تھے۔ وہ دراصل اپنے موضوع کے اصول و فروع پر حاوی ہوئے بغیر قلم اٹھانا پسند نہیں فرماتے تھے۔ اس سے ان کی عالی حوصلگی اور بلند نظری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شہرت کے بام عروج پر پہنچنے کے بعد بھی انھوں نے ثانوی مآخذ کے استعمال اور ثانوی درجے کے کام کو پسند نہیں کیا۔

اردو میں سیر و مغازی کی ابتدائی تاریخ اس کے رواۃ اور مصنفین پر سب سے پہلے علامہ شبلی نے مقدمہ سیرۃ النبی میں قلم اٹھایا تھا اور ممکنہ حد تک استیعاب و احاطے کی کوشش کی تھی۔ نقش اول ہونے کے باوجود ان کی یہ تحریر اب بھی قابلِ مطالعہ اور لائق استفادہ ہے۔ نومبر ۱۹۷۹ء میں مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی نے دوحہ، قطر کی تیسری عالمی سیرت کانفرنس میں متعلقہ موضوع پر عربی میں اپنا مقالہ پیش کیا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ جون ۱۹۸۱ء کے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں ڈاکٹر نعیم صدیقی کے قلم سے شائع ہوا۔ یہ مقالہ بہت قیمتی ہے نیز متعدد جدید اور مفید معلومات پر مشتمل ہے، لیکن اس کا وہ حصہ جو سیر و مغازی کی تاریخ سے متعلق ہے، اس میں علامہ شبلی کی معلومات پر کوئی اہم اضافہ نظر نہیں آتا۔ پروفیسر ہارویز کی کتاب کا ذکر بھی اوپر آ چکا ہے۔

ان سب کے بعد اگر قاضی صاحب کی تدوین سیر و مغازی کا مطالعہ کیا جائے تو کتاب کی قدر و قیمت ظاہر ہوگی اور مصنف کے جوہر نظروں میں آ جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں بھی قاضی صاحب نے چبائے ہوئے لقموں کو چبانے کے بجائے جدید و مفید معلومات اور مضامین نو کے انبار لگا دیے ہیں۔ ہمارے محدود علم کے مطابق اردو بلکہ عربی میں بھی اپنے موضوع پر اب تک کی یہ سب سے

بہتر اور منفرد کتاب ہے۔

اس مضمون کو قاضی صاحب کے دو قابل قدر بلکہ قابل تقلید اوصاف کے ذکر پر ختم کیا جاتا ہے۔ عام طور پر طبیعتیں کسی خاص موضوع پر کچھ دنوں تک کام کرنے کے بعد ادھر سے اچاٹ ہو جاتی ہیں۔ خاص طور پر اس صورت میں جب کہ وہ کام کسی درجے میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ لیکن قاضی صاحب میں ایسی استقامتِ طبع تھی کہ ایک موضوع پر کام کرتے ہوئے وہ اکتاتے نہ تھے۔ یہی نہیں بلکہ وہ پلٹ پلٹ کر اس کی طرف رجوع ہوتے رہتے تھے۔ اس سلسلے کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں۔ رجال السند والہند (طبع اول) میں مصنف نے ان لوگوں کے تراجم قلم بند نہیں کیے تھے جو باہر سے اس ملک میں آئے اور پھر یہیں کے ہو گئے، یا ایک طویل مدت تک یہاں قیام پذیر رہے۔ چنانچہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مقدمۂ کتاب میں انھوں نے لکھا تھا:

ولم نذکر اللذین جاؤا الی الہند وتأھلوا وتوطنوا فیہا، ومن حقوقہم علینا أن نذکرھم أیضا وھم کثیرون، ولعل اللہ یحدث بعد ذلک أمرا۔

اس پر حضرت مولانا محمد شفیع عثمانی رح نے اپنی تقریظ میں یہ کلمات تحریر فرمائے تھے:

"اللہ تعالیٰ مصنف علام کو توفیق مزید عطا فرمائیں کہ اپنے وعدے کے مطابق ان رجال کا تذکرہ بھی جمع فرما دیں، جو اگرچہ ہند و سندھ میں پیدا نہیں ہوئے، مگر ان کا طویل قیام استفادے یا افادے کی صورت میں ان ملکوں میں رہا ہے۔"

حضرت مفتی صاحب کی یہ دعا قبول ہوئی اور مصنف نے آئندہ اس کمی کی تلافی کر دی، چنانچہ ۱۳۹۸ھ میں اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن جب دارالانصار قاہرہ سے شائع ہوا، تو یہ اس پہلو سے بھی مکمل تھا۔ قاضی صاحب نے دوبارہ اس کتاب پر

کتنی محنت کی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ طبع اول کے وقت اسکی ضخامت ۲۲۸ صفحات تھی جو طبع ثانی کے وقت ۵۰۰ صفحات ہو گئی۔

یہی کیفیت ان کی مایۂ ناز تصنیف "خیر القرون کی درس گاہیں اور ان کا نظامِ تعلیم و تربیت" کی بھی ہے۔ قاضی صاحب نے اولاً اس موضوع پر دو مضامین "اسلامی تعلیم کا مرکز دارارقم" اور "مدارس اسلامیہ کے ارتقائی ادوار" کے عنوان سے البلاغ بمبئی میں لکھے۔ اس کے بعد ایک مختصر کتاب "تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں" کے نام سے لکھی۔ آخر میں اس سلسلے کو مزید وسعت دیتے ہوئے "خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظام تعلیم و تربیت" مرتب کر دی۔

اسی طرح بہت پہلے ایک مضمون "ہر طبقے اور ہر پیشے میں علم اور علماء" کے عنوان سے البلاغ بمبئی کے لئے لکھا، جو ان کے مجموعۂ مقالات "مآثر و معارف" میں بھی شامل ہے۔ عام طور پر اہل علم نے بہت پسند کیا اور متعدد اہم شخصیتوں نے اسے مزید وسعت دینے کی درخواست کی۔ چنانچہ آخر عمر میں قاضی صاحب نے پھر اس طرف توجہ کی اور تقریباً تین سو صفحات کی ایک جامع تصنیف "مسلمانوں کے ہر طبقے اور ہر پیشے میں علم اور علماء" کے نام سے تیار کر دی، یہ قاضی صاحب کی آخری تصنیف ہے، جس کا مقدمہ غالباً انھوں نے مرض وفات کے دوران لکھا ہے۔ ابھی اشاعت کے لئے کہیں بھیج نہ سکے تھے کہ ان کا پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا۔

ع ساقی! سلام لے مرا پیمانہ بھر گیا

قاضی صاحب کا دوسرا وصفِ خاص یہ تھا کہ وہ سچے اہل علم کی طرح تنقید و استدراک سے گھبراتے نہ تھے، بلکہ خندہ روئی و کشادہ جبینی کے ساتھ اس کا استقبال کرتے تھے۔ اس کی بھی دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔ قاضی رشید بن زبیر غسانی کی تصنیف "کتاب الذخائر والتحف" کے مصنف کی تعیین کے سلسلے میں قاضی صاحب اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہوا۔ سبب اختلاف یہ تھا۔

کہ رشید، بیٹے، باپ اور دادا تینوں کے نام کا جز تھا۔ قاضی صاحب کا خیال تھا کہ یہ پوتے کی تصنیف ہے اور ڈاکٹر صاحب کی رائے تھی کہ دادا کی تصنیف ہے اس کے علاوہ کچھ اور امور بھی متنازعہ فیہ تھے اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کے مکتوب اور قاضی صاحب کے مضمون کی اشاعت ماہ نامہ معارف اعظم گڈھ دسمبر ۱۹۶۰ء) میں ایک ساتھ ہوئی۔ اس پر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی علیہ الرحمہ نے ایک مضمون بطور محاکمہ تحریر فرمایا، جو رسالہ مذکور میں فروری ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ جس میں مولانا نے تعیین مصنف کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی رائے سے اور بعض دیگر نقد واستدراک کے بارے میں قاضی صاحب کے خیالات سے اتفاق کا اظہار فرمایا۔ مزید برآں موضوع زیر بحث سے متعلق متعدد اہم امور کا انکشاف بھی فرمایا۔

قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ قاضی صاحب نے مآثر و معارف میں اپنے مضمون کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا الاعظمی کے نقد اور محاکمے کو بھی جوں کا توں شائع کیا اور اس سلسلے میں کسی قسم کی رنجش یا تنگ دلی کے مظاہرے سے گریز کیا۔

اسی طرح محمود جون پوری پر قاضی صاحب کے مقالے کی اشاعت (معارف اعظم گڈھ مئی، جون، جولائی ۱۹۷۳ء) کے بعد جناب شبیر احمد خاں غوری اور جناب حافظ غلام مرتضیٰ نے استدراکات لکھے (بالترتیب معارف اعظم گڈھ اکتوبر، نومبر دسمبر ۱۹۷۳ء و مارچ ۱۹۷۴ء) جن میں قاضی صاحب پر کوئی نقد واعتراض تو نہ تھا لیکن ان کی فراہم کردہ معلومات پر بعض اضافے ضرور تھے۔

قاضی صاحب نے یہاں بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا اور "دیار پورب میں علم اور علماء" میں ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے مضمون کیساتھ دونوں استدراکات بھی شائع کیے۔

گذشتہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا گیا، یہ قاضی صاحب کی تصنیفی خدمات اور علمی کمالات کی ایک ہلکی سی جھلک ہے۔ ابھی ان پر بہت کچھ اور مختلف زاویوں سے لکھنے کی نہ صرف گنجائش بلکہ ضرورت ہے۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

ادارہ

مئے طہور

مجموعہ کلام (غیر مطبوعہ) قاضی اطہر مبارکپوری

قاضی صاحب کے علمی سفر کا آغاز مذہبی و اصلاحی شاعری سے ہوا، یہ طالب علمی کا دور تھا اور جب فراغت کے بعد عملی زندگی کے لق و دق صحرا میں آئے تو یہی ان کا زادِ سفر تھا، آزادی کی ساعت قریب آتی جارہی تھی، اس وقت ان کی نظموں کا تیور کچھ اور تھا اور آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں پر جو قیامت گذری، اس وقت کا درد و کرب غم و یاس، احساس مظلومی و بیچارگی ان کی نظموں پر چھاگیا، آزادی کے فوراً بعد وہ بہرائچ چلے گئے وہاں سے ہفتہ وار "الانصار" جاری کیا، اس میں جتنی نظمیں شائع ہوئیں ان میں بلا استثناء ہر ایک میں وہی درد و کرب رچا بسا ہوا ہے، چار پانچ برسوں کے بعد حالات میں کچھ ٹھہراؤ پیدا ہوا اور امید کی کرنیں کچھ نظر آنے لگیں تو ان کی نظموں میں اس کیفیت کا عنصر شامل ہوگیا، پھر ڈابھیل، امرتسر، لاہور ہوتے ہوئے عروس البلاد بمبئی پہونچ گئے، اخبار نویسی، تصنیف و تالیف، تحقیق و مطالعہ کے صحرائے ناپیدا کنار میں اس طرح گم ہوکر رہ گئے کہ شعر و شاعری کی راہ ہمیشہ کے لئے چھوٹ گئی۔

آغاز سفر میں قدم ڈگمگاتے ہیں لیکن یہی قدم اگر منزل تک پہونچادیں تو ان ڈگمگاتے قدموں کی بھی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے، فطری اصولوں کے مطابق

ان کی قدر شناسی ہمارے لئے ضروری ہے ، اس لئے قاضی صاحب کی شاعری ان کی علمی ترقی کا پہلا زینہ ہے ، اس کے تذکرہ کے بغیر ان کی داستان حیات نامکمل رہ جائے گی ، ہم اسی نقطۂ نگاہ سے چند نظمیں اور غزلیں یہاں پیش کر رہے ہیں ——————— (اسیرادروی)

بسوئے رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

بینم بہ ہجرش برہم نظامے — در شام صبحے ، در صبح شامے
در صبح رُویش شمسے درخشاں — شمسے چہ شمسے ، شمسے مدامے
در شام زُلفش ، ماہِ مبارک — ماہے چہ ماہے ، ماہے تمامے
خطِ جبینش ، تقدیر ہستی — نطق بیانش ، مبرم پیامے
صدیق وفاروق عثمان وحیدر — در بند زلفش صید بدامے

اے فخر عالم ! باسوز فرقت
گوید سلامے ، ادنیٰ غلامے

درسوز سینہ سوز دسفینہ — در بحر غربت ، اللہ اکبر
در گوش عزلت قید جہ شورے — شور قیامت ، اللہ اکبر
از تیر شیطاں در قلب ایماں — زخم نہایت ، اللہ اکبر
طوفِ مسلماں گردِ صنمہا — ایں چہ قیامت ، اللہ اکبر
رسوا ز دست مردِ مسلماں — ناموس ملت ، اللہ اکبر
ہر روز جنگے بر نام مذہب — نیرنگ شامت ، اللہ اکبر

ہر دو صنم گر ، ملا و صوفی | گو ریش بر رُو ، گو سر بہ سجدہ
از نام فتویٰ ملت فروشی | وز نام تقویٰ از غیر بردہ
امت پریشاں در راہ طیبہ | رہبر گرفتہ ، راہِ کلیسا
حاضر و درت ام یا رحمت کل | با چشم تر ، با آہ فسردہ

بہر غلاماں ، آقا دُعا کن ،
امت پریشاں ، آقا دُعا کن

(مارچ ۱۹۵۵ء)

نعت شریف

اندھیری رات، بادل کی گرج، بجلی، ہوا، پانی
زمیں بھیگی، فضا پُرہول، ہر سو دورِ طوفانی

پپیہے کی صدائے درد آگیں شاخساروں میں
گھنیرے جنگلوں میں جابجا جگنو کی تابانی

ادھر کوئل کی رنگیں کوک لہراتی ہے رہ رہ کر
ادھر جذبات پر ہوتی ہے پیہم برق ارزانی

جھڑی برسات کی، جل تھل زمیں پر، ابر گردوں پر
یہ کس کی یاد میں کی آسماں نے اشک افشانی

نظر سہمی سی، دل ڈوبا ہوا، اوسان وارفتہ
کوئی ایسے میں سن لیتا نوائے سوز پنہانی

عطا ہو ساقیا! تشنہ لبوں کو جام عرفانی
حریم نعت میں آئے نظر، ہر چیز نورانی

نہ پوچھ اس دم مرا سوز و گداز شاعری ہمدم
درِ معنی پہ سجدہ ریز ہے لفظوں کی پیشانی

وفورِ بیخودی میں ہے نئے انداز سے پیہم
حریم حسن میں دستِ طلب کی پردہ جنبانی

تری ذاتِ مقدس مبدأ الطاف بے پایاں
تری ذاتِ مقدس منتہائے فضل ربانی

کھلا ہے صحفِ قرآں، ضیائے روئے انور میں
جبیں پر گیسوئے پُر پیچ میں آیاتِ قرآنی

بیانِ والضحیٰ پیشانیٔ سیمیں کے جلوے میں
ہے شرحِ سورۂ واللیل، زلفوں کی پریشانی

تری آنکھوں کو ساقی چشمۂ کوثر سے کیا نسبت
جو اک جنبش میں چھلکائیں ہزاروں جام عرفانی

ابوبکر و عمر عثمان و حیدر، واہ کیا کہنا
انھیں چاروں سے ہے آئینہ ملت میں تابانی

قسم ہے گردشِ چرخ کہن کی، دورِ آخر کی
زمانہ لا نہیں سکتا ہے ان حضرات کا ثانی

بروقتِ قیادت

چھا جاتا ہے ماحول پہ جب زنگِ تباہی
آنکھوں میں جب آجاتی ہے افسردہ نگاہی

کام آئیں نہ جس وقت اوامر نہ نواہی
حق دیتا ہے جب بھول کے باطل کی گواہی

چھپ جاتا ہے جب نورانہ چیرونکی ردا میں
انوار پہ یورش کو جب اٹھتی ہے سیاہی

سجادۂ ناپاک پہ جب بے اثری سے
دم توڑتی ہے یاس میں ہر آہ پگاہی

جس وقت بھلا دیتا ہے منزل کا تصور
آزادیٔ احساس کی شہراہ کا راہی

جب بیٹھ رہے دیکھ کے ہنگامۂ میداں
روباہ صفت خانقہِ غم میں سپاہی

تسکین ہو جب گوشہ نشینانِ حرم کو
ہتھیائیں گدا دھر کے اسلام کی شاہی

جب موت کے سانچے میں ڈھلے زیست کی دنیا
جب امن سے ہوتی ہو تباہی پہ تباہی

اس وقت ابھرتا ہے کوئی دین کا غازی
باہیبت و باہمت و با زرق نگاہی

اس شان سے چلتا ہے شہنشاہ صداقت
خورشید پہ ہنستی ہے درخشندہ کلاہی

ہنگامۂ بیداری ہمت کے اثر سے
لیتی ہے قیامت بھی جماہی پہ جماہی

وہ امن بھی یلغار سے محفوظ نہیں ہے
جس امن کا اک رُخ ہو تباہی ہی تباہی

(۲۲ر نومبر ۱۹۴۷ء)

جمعیۃ علماء ہند

نکل آئیں نیاموں سے تڑپ کر گرم تلواریں
رگِ باطل سے پھوٹیں بے محابا خون کی دھاریں

چلو، اُٹھو، بڑھو، حملہ کرو، باطل سے ٹکراؤ
اُگیں کشتِ وفا میں غازیانِ دیں کی للکاریں

جب آجاتی ہے دستِ حق پرستی میں یداللّٰہی
لرز جاتی ہیں قصرِ کفر کی مضبوط دیواریں

خیالِ دوریٔ منزل سے رک جاتی ہیں جب راہیں
کہ میرِ کارواں کی دم بخود ہوتی ہیں گفتاریں

سمجھ جاتے ہیں اہلِ کارواں جب اس کی گمراہی
تو کام آتی ہے قائد کی نہ گفتاریں نہ رفتاریں

قیادت کا گلا گھٹتا ہے جب اندوہ کثرت سے
تو کام آتی ہیں پھر مردانِ وحدت کی ہی للکاریں

عبادت خانقاہی ہوں کہ رُہبانِ کلیسائی
اُچھالی ہیں انھیں دونوں نے اہلِ حق کی دستاریں

بدل سکتی نہیں رُخ غازیوں کا جادۂ حق سے
نہ مکاروں کی مکاری نہ سفاکوں کی یلغاریں

جو گمراہِ ازل ہیں راہِ حق پر آ نہیں سکتے
ہم ان کو لاکھ سمجھائیں ہم ان سے لاکھ سر ماریں

حسین احمد امیرِ کارواں ہیں اہلِ ہمت کے
جو دشواری سے گھبرائیں نہ کچھ دوری سے ہاریں

ہزاروں مرحلے باقی ہیں مردانِ محمدؐ کے
پسِ دیوارِ مستقبل ہیں جانے کتنی یلغاریں

ہے اظہرؔ روحِ مذہب اصل میں جمعیۃ علماء
ہیں جس کے دم سے قائم ہند میں ملت کی دیواریں

(۳۰ نومبر ۱۹۴۷ء)

اشارات

زمانہ کے تغیر سے ہوئی یوں عام بربادی
کہ ویرانہ ہے ویرانہ نہ آبادی ہے آبادی

نظر اٹھتی ہے جس جانب ہے بربادی ہی بربادی
سلیقے کی اسیری ہے، قرینے کی نہ صیادی

نہ پوچھو ہمدمو! ہم بیکسوں کی وجہ بربادی
کہ آکر اس جگہ خاموش ہو جاتے ہیں فریادی

ہماری بے زبانی رحم کے قابل ہے اے یارو
انھیں سے پوچھ لیتا کاش کوئی وجہ بربادی

بسا اوقات مرغانِ قفس کی گرم آہوں سے
وبالِ جان بن جاتی ہے صیادوں کی صیادی

بہر حال آرزو اپنی ترے قدموں کے نیچے ہے
محبت میں یہی اک چیز ہے لے دے کے بنیادی

زمانے بھر کی ٹھوکر کھا کے تیرے در پہ آئی ہے
کدھر جائیگی دل کی آہ گر تو نے بھی ٹھکرا دی

فسانہ بن رہی ہے اب تو محفل میں فداکاری
وفا کی سرد پڑتی جا رہی ہے گرم بازاری

ہے باقی وصل کی خواہش نہ فرقت کی جنوں کاری
جنوں کاروں کی اُلفت سے ہوئی جاتی ہے بیزاری

نہ جانے کیا دلِ وحشی نے اپنا رنگ بدلا ہے
کہ صحرا چھوڑ کر پھرتی ہے در در اسکی خودداری

زمانے نے اڑا دی دھجیاں دامانِ ہستی کی
بدن پر مردنی سی، رُوح پر افسردگی طاری

پڑا ہے زندگی کا کارواں ششدر دوراہے پر
نہ جینے ہی کا ساماں ہے نہ مرنے ہی کی تیاری

شکایتہائے رنگیں کہہ تو دوں لیکن ہے ڈر اطہر
کہ ہو جائے نہ ان کی طبع نازک پر گراں باری

(۲۰ مارچ ۱۹۴۴ء)

مئے طہور

شعورِ دل سے طوفانِ بصیرت پھوٹ جاتا ہے بصارت کا تعلق جب نظر سے ٹوٹ جاتا ہے

نگاہوں پر برس جاتی ہے جب مایوس تاریکی ہر اک تارِ نظر سے چشمۂ خوں ٹوٹ جاتا ہے

حدِ منزل پہ جب جاتا ہوں یہ محسوس کرتا ہوں کوئی آ کر متاعِ کارواں کو لوٹ جاتا ہے

گذر جاتی ہیں میری حسرتیں یاس و تمنا میں یتیموں کا مقدر جسطرح سے پھوٹ جاتا ہے

سنا دیتا ہوں دل کی آپ بیتی پھر بھی دانستہ بسا اوقات عنوانِ فسانہ چھوٹ جاتا ہے

گرا دیتے ہیں وہ مجھکو نظر سے جب سرِ محفل مرے جینے کا دنیا میں سہارا لوٹ جاتا ہے

تعالی اللہ، زہے تقدیر، ایسے مرنیوالوں کی مسیحا مسکرا دیتا ہے اور دم چھوٹ جاتا ہے

ہوا جاتا ہے جب جوشِ سفر بیتابیٔ منزل کوئی ہم شکلِ منزل بن کے اظہرؔ لوٹ جاتا ہے

مجھے اپنوں سے الفت ہے وگرنہ قاضی اظہرؔ
انھیں حالات میں اپنوں سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے

(۲۷ / دسمبر ۱۹۴۷ء)

○

سرور و کیف سے آہ و فغاں تک بات جا پہونچی
پہونچنا تھا کہاں ؟ لیکن کہاں تک بات جا پہونچی

جبیں سے میری، ان کے آستاں تک بات جا پہونچی
زمیں سے اٹھ کے پہلے، آسماں تک بات جا پہونچی

تھے غنچے مہر برلب منتظر ادنیٰ اشارے کے
ذرا سا وہ ہنسے تو گلستاں تک بات جا پہونچی

دعا دیتا ہوں غمّازِ چمن! تیری تگ و دو کو
جونہی تنکے چنے، برقِ تپاں تک بات جا پہونچی

معاذاللہ، بحثِ حسن و الفت کتنی خونی ہے
چلی مژگاں سے اور تیغ و سناں تک بات جا پہونچی

نہ کہتا تھا، نہ چھیڑو مرے اشکوں کو بُرا ہوگا
اگر قطرے سے بحرِ بیکراں تک بات جا پہونچی

بہر قیمت بدلنا ہے نظامِ میکدہ ہم کو
پہونچنے دو اگر پیرِ مغاں تک بات جا پہونچی

سکوت اظہر کیا ہم نے بہت آغازِ الفت میں
مگر انجام میں شرح و بیاں تک بات جا پہونچی

○

وہ وقت بھی تھا کبھی کہ دونوں ہلاکِ تیغِ ستم رہے ہیں
مگر اب اپنی وفا پہ قائم نہ وہ رہے ہیں نہ ہم رہے ہیں

سرور و غم کی جدا ہیں راہیں کہ ایک نغمہ ہے ایک نالہ
مگر محبت کی تلخیوں میں ندیم دونوں بہم رہے ہیں

وہاں شکنجے میں زندگی تھی یہاں ہے حلقوم زیرِ خنجر
کہ ہو کے آزاد ہم قفس سے اسیرِ دامِ کرم رہے ہیں

شعور و احساس پھوٹ نکلا ہے توڑ کر بندشِ زمانہ
قفس میں محسوس کر رہا ہوں کہ بال و پر میرے جم رہے ہیں

ہزار دنیا نے رنگ بدلے مگر نہ اپنا مقام بدلا
نشاط کی انجمن میں رہ کر بھی ہم اسیرِ الم رہے ہیں

وفا کے دل پر ہزار چرکے دیئے جفا نے طرح طرح کے
مگر رہِ جستجو میں آگے، ترے شکستہ قدم رہے ہیں

گذر گیا وہ حسیں زمانہ کہ جب جوابِ وفا، وفا تھی
اب آگیا ہے وہ دور جس میں وفا کے امکان کم رہے ہیں

ادھر تو گذری ہے عمر اہلِ خودی کی آزاد خلوتوں میں
وہ اور ہوں گے جو انجمن میں اسیرِ جاہ و حشم رہے ہیں

○

جب سے ان کی یاد حرزِ جسم و جاں ہونے لگی
زندگی بیگانۂ سود و زیاں ہونے لگی

ان کی محفل میں بھی میرا تذکرہ ہونے لگا
اب تو میری داستاں بھی داستاں ہونے لگی

میں نے برسوں یوں گزارے ہیں قفس کے رات دن
برق جب چمکی تو فکرِ آشیاں ہونے لگی

ہمصفیرو! کون سی دُھن یہ تراشی تم نے آج
مضمحل نغموں سے روحِ گلستاں ہونے لگی

کچھ دنوں میں اور بدلے گی یونہی رسمِ قفس
اب تو کچھ آزادیٔ آہ و فغاں ہونے لگی

ہائے وہ بیمار آنکھیں جن کا اللہ ہے مریض
ان کی اک شہ پر میری دنیا جواں ہونے لگی

○

کچھ اس انداز سے پچھلے پہر فریاد کی ہم نے
اُڑھا دی ماہ و انجم کو ردائے تیرگی ہم نے

جھکایا سر ترے در پہ بہ انداز خودی ہم نے
ستاروں کی جبیں سے چھین لی تابندگی ہم نے

اک ایسا کشمکش کا وقت گذرا ہے محبت میں
کہ خود اپنی تمنا کی اڑائی ہے ہنسی ہم نے

قصور اس میں ہے کیا ساحل کا دریا کی خطا کیا ہے
اگر طوفان میں جاکر خود ہی کشتی توڑ دی ہم نے

ہلا سکتی نہیں ہے دولتِ کونین بھی اطہرؔ
زمینِ فقر پہ رکھی ہے بنیاد خودی ہم نے

مولانا ضیاء الدین اصلاحی
مدیر رسالہ معارف دارالمصنفین، اعظم گڈھ

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

گذشتہ مہینہ سفر میں جب مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کے انتقال کی خبر ملی تو بڑا دھکا لگا۔ مجھے ان کی تجہیز و تکفین میں شرکت سے محرومی کا ہمیشہ بہت ملال رہے گا۔

اعظم گڈھ کے متعدد علماء کو بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی، خود مبارکپور کے جو اعظم گڈھ کا مشہور قصبہ اور علم و تعلیم اور صنعت و حرفت کا بڑا مرکز ہے، مولانا عبد الرحمن مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی اور مولانا عبید اللہ رحمانی شارح مشکوٰۃ المصابیح کا آوازہ شہرت عالم اسلام میں بلند ہے۔ انہی لوگوں کی صف میں مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے بھی اپنی جگہ بنالی تھی۔ مگر افسوس کہ دستِ اجل نے انھیں ہم سے چھین لیا، یہ بڑا علمی سانحہ ہے اور قاضی صاحب کا خلا پُر ہونا آسان نہیں ——— ان کی ولادت ۱۹۱۶ء میں ہوئی۔ ان کے نانا مولانا احمد حسین رسولپوری عربی زبان و ادب کے ماہر اور صاحبِ تصانیفِ کثیرہ تھے۔ قاضی صاحب نے ان کا عربی دیوان مرتب کر کے شائع کیا تھا، انھوں نے عرصہ دراز تک ڈھاکہ میں مسندِ درس کو رونق بخشی۔ انہی سے قاضی صاحب نے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں۔ پھر مبارکپور کے مشہور مدرسہ جامعہ احیاء العلوم میں درسیات کی تکمیل

کی اور جامعہ قاسمیہ مراد آباد میں مولانا فخر الدین، مولانا سید محمد میاں اور مولانا سید اسماعیل سنبھلی سے صحاح ستہ کا درس لیا۔

طالب علمی کے زمانے میں ان کو شعر و سخن سے دلچسپی تھی، اور خود بھی مشقِ سخن فرماتے تھے، یہ تحریک آزادی کے شباب کا زمانہ تھا، قاضی صاحب کو عملی سیاست اور ہنگامہ آرا قومی جد و جہد سے کبھی سروکار نہیں رہا، تاہم آزادی کا جادو ہر شخص پر چل گیا تھا، قاضی صاحب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے بلکپور میں ہر قسم کے مذہبی و سیاسی جلسے برابر ہوتے رہتے تھے جن کیلئے وہ نظمیں کہتے تھے، مگر قدرت نے ان کو اس سے اعلیٰ و ارفع کاموں کیلئے پیدا کیا تھا، جب علم و فن سے ان کا اشتغال بڑھا تو شاعری کا کوچہ خود بخود چھوٹ گیا۔

صغر سنی ہی سے مضمون نگاری بھی کرنے لگے تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد صحافت کے پیشے سے وابستہ ہوئے، آزادی سے پہلے زمزم لاہور سے نکلتا تھا جو اس دور کا مشہور قوم پرور اخبار تھا، قاضی صاحب اس کے اور دوسرے اخباروں کے شعبہ ادارت سے منسلک رہے، یہاں "زندہ دلانِ پنجاب" کی صحبت میسر آئی۔ جس سے زبان کے نوک پلک درست کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی اور لکھنا پڑھنا ہی زندگی کا معمول بن گیا۔

ملک کی تقسیم کے بعد انھوں نے بمبئی کا رخ کیا جو ہندوستان کا سب سے بڑا اور مشہور تجارتی شہر ہے، لوگ یہاں مادی منفعتوں کی طلب اور اپنے کاروبار کو فروغ دینے کیلئے آتے ہیں لیکن قاضی صاحب اپنے علم و فن کی دکان سجانے کے لئے یہاں آئے تھے ؎

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالیؔ نے دکاں سب سے الگ

یہی ہنگامہ خیز شہر ان کی علمی، قلمی اور تصنیفی جولان گاہ بنا، اس کے ایک حجرہ میں

بیٹھ کر انھوں نے اپنے علم و ہنر کا تازہ جہان آباد کیا، شب روز مطالعہ میں مستغرق رہتے۔ نہ اپنے آرام و راحت کا خیال، نہ کھانے پینے کی پروا، نہ سونے جاگنے اور اٹھنے بیٹھنے کا کوئی وقت، بمبئی کے ہنگاموں اور لوگوں کے ملنے جلنے سے محترز رہ کر صرف علم کی خدمت و اشاعت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالینا اور علم کے لئے اپنے وجود کو گھلا ڈالنا آسان نہ تھا مگر انھوں نے یہ سب کر دکھایا اور ؏

پے علم چوں شمع باید گداخت

کا نمونہ پیش کیا۔ جس کا آج کل کے آرام طلب اور تن آسان لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔

یہاں بھی صحافت ہی سے وابستہ رہے، مختلف اخباروں میں مخصوص کالم لکھتے رہے، انقلاب میں کالم لکھنے کا سلسلہ بمبئی چھوٹنے کے بعد بھی جاری رہا، یہاں انجمن اسلام کے اسکولوں میں طلبہ کو دینیات کا درس بھی دیا، انجمن خدام النبی نے جب ابلاغ کے نام سے ایک علمی، دینی اور حج سے متعلق معلوماتی رسالہ نکالا تو گو اس پر دوسرے لوگوں کے نام بھی ہوتے تھے، مگر اصلاً اس کی ترتیب وادارت کا کام وہی تنہا انجام دیتے تھے، اور اسکے اکثر مضامین بھی انہی کے قلم سے ہوتے تھے، اس کے ایک مستقل کالم "مطالعات و تعلیقات" میں وہ اپنے مہینہ بھر کے مطالعہ کا نچوڑ پیش کرتے تھے، جس کے بعض مفید حصے کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے ۱۹۵۵ء میں انھوں نے ابلاغ کا ایک خاص شمارہ تعلیمی نمبر نکالا جو ایک علمی دستاویز بن گیا اور بہت پسند کیا گیا۔

وہ بڑے زود نویس تھے، اس زمانے میں بھی ان کی بعض کتابیں اور رسالے شائع ہوئے مگر شروع میں ان پر صحافت کا رنگ غالب تھا، بمبئی میں جب علمی انہماک بڑھا اور تحقیق و جستجو کے عادی ہوئے تو ان کا طرز تحریر بھی بدلا اور تحریروں میں بھی پختگی پیدا ہوگئی، وہ علامہ شبلی مرحوم کے ہمیشہ عقیدت مند رہے، ان کے نزدیک

اردو انشا پردازی کا بہترین اور اعلیٰ ترین نمونہ انہی کا طرز تحریر تھا، اس لئے انھوں نے اسی انداز انشا کی تقلید کی۔ اسی زمانے میں معارف میں ان کے علمی و تحقیقی مضامین نکلنے لگے جس کا سلسلہ مدۃ العمر قائم رہا۔

سنہ ۱۹۵۸ء میں انکی کتاب رجال السند والھند شائع ہوئی تو ملک و بیرون ملک کے علمی حلقوں میں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی، یہ ساتویں صدی سے قبل کے ہندوستانی و سندھی اصحاب علم و کمال کا تذکرہ ہے۔ سنہ ۱۹۷۸ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن بڑے اضافوں کے ساتھ دو حصوں میں شائع ہوا، پہلے حصہ میں ان اشخاص کا تذکرہ ہے جو یا تو ہند و سندھ میں پیدا ہوئے اور یہیں وفات پائی یا جن کا اصل تعلق اسی سرزمین سے تھا مگر ان کی ولادت اور سکونت باہر رہی، دوسرے حصہ میں باہر سے یہاں آکر واپس چلے جانے یا باہر سے آکر یہاں قیام پذیر اور یہیں کی خاک کا پیوند ہونے والوں کا تذکرہ ہے، سیر، تاریخ، رجال، تراجم اور طبقات کی سینکڑوں کتابوں کو کنگھال کر یہ معلومات جمع کئے گئے ہیں، اس طرح یہ کتاب ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی تاریخ اور عربی طبقات و تراجم میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔

بمبئی میں انھوں نے اپنی تصنیفی زندگی کا باقاعدہ نظام بنایا تو ہندوستان کے ابتدائی قدیم عہد کی اسلامی تاریخ ان کا خاص موضوع بن گیا۔ دراصل اردو میں سب سے پہلے علامہ شبلی نے اپنے بعض مضامین میں اس موضوع پر بحث کی، پھر مولانا سید سلیمان ندوی نے عرب و ہند کے تعلقات اور عربوں کی جہاز رانی لکھ کر اس موضوع پر کام کرنے والوں کیلئے راہ ہموار کر دی، دارالمصنفین کی کتاب۔ تاریخ سندھ، اور۔ ہندوستان عربوں کی نظر میں۔ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، قاضی صاحب نے اس موضوع کو اپنایا تو اس کو مزید وسعت دی، جس سے اس کے بعض نئے گوشے اور پہلو سامنے آئے، اس سلسلہ کی کتابوں کے نام یہ ہیں۔

عرب و ہند عہد رسالت میں۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، اسلامی ہند

کی عظمت رفتہ، خلافت راشدہ اور ہندوستان، خلافت امویہ اور ہندوستان، خلافت عباسیہ اور ہندوستان۔

گو یہ ساری کتابیں ایک ہی طرز کی ہیں مگر قاضی صاحب کی محنت وکاوش سے میرانیس کے بقول ان کا حال یہ ہوگیا ہے کہ

ع اک پھول کا مضمون ہو تو سو طرح سے باندھوں

یہ ساری کتابیں بہت مقبول ہوئیں اور ان کے عربی ترجمے بھی شائع ہوئے بعض کتابوں کا ترجمہ مصر کے ڈاکٹر عبدالعزیز عزت عبدالجلیل نے کیا ہے۔

ہندوستان میں پورب کا علاقہ جو پہلے سرکار جون پور میں شامل تھا۔ بڑا زرخیز اور شیراز ہند کہلاتا تھا۔ شرقی سلاطین کی علوم ومعارف پروری نے اس کے ہر قریہ کو فردوس کے مانند اور ہر قصبہ کو شیراز واصفہان کا ہم سر بنا دیا تھا۔ قاضی صاحب نے دیار پورب کی علمی تاریخ کو بھی اپنا موضوع بنایا اور یہاں کے قعر گمنامی میں پہنچ جانے والے علماء کو اس سے نکالا، مضامین کے علاوہ اس موضوع پر ان کی کتابیں «دیار پورب میں علم وعلماء» اور «تذکرہ علمائے مبارکپور» بھی اہم ہیں، تدوین سیر ومغازی آثر ومعارف اور بنات اسلام کی علمی خدمات بھی بڑی کدوکاوش کا نتیجہ ہیں۔

ان کی ایک کتاب «علی وحسین» بھی ہے۔ جو جناب محمود احمد عباسی کی کتاب «خلافت معاویہ ویزید» کا جواب ہے، اس میں قاضی صاحب نے دکھایا ہے کہ عباسی صاحب نے اپنے نظریات کو ثابت کرنے کیلئے یا تو کمزور تاریخی روایتوں کا سہارا لیا ہے یا روایتوں میں کتر بیونت کی ہے، یہ خیال بجا ہے لیکن دوسری طرف حضرت معاویہ ویزید بلکہ بنی امیہ کے مثالب میں جو روایتیں پیش کی جاتی ہیں وہ بھی ضعف وضع اور نکارت سے خالی نہیں ہیں، ضرورت ہے کہ کوئی صاحب علم ونظر اس دور کی دونوں طرح کی روایات کی چھان پھٹک کرکے دودھ اور پانی کو الگ الگ کردے، ہمارے خیال میں ہمارے فاضل دوست پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی ندوی

یہ کام بہتر انداز سے کر سکتے ہیں۔

قاضی صاحب نے ان دو نادر و نایاب کتابوں کے متون تحقیق و تحشیہ کے بعد شائع کئے ہیں۔

جواہر الحدیث فی علم حدیث الرسول اور دیوان احمد (قاضی صاحب کے نانا کا کلام) ان کی کتابیں شائع ہونے سے رہ گئی ہیں، ان میں مسلمانوں کے مرطبقہ اور ہر پیشہ میں علم و علماء۔ بڑی اہم اور اچھوتی ہے۔

جب بمبئی چھوڑ کر اپنے وطن میں فروکش ہوئے تو مختلف اداروں نے ان کو اپنے یہاں بلانا چاہا مگر کبر سنی اور عائلی زندگی کے لطف و لذت کو چھوڑ کر کہیں جانا پسند نہیں کیا، تاہم دارالمصنفین کا اعزازی رفیق اور اس کی وقف کمیٹی کا ممبر بننا قبول کر لیا۔ ماہنامہ برہان دہلی کے اعزازی مدیر اور شیخ الہند اکیڈمی کے ڈائرکٹر بھی ہو گئے تھے۔ جہاں سے ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ وہ بہت سے علمی و تعلیمی اداروں کے ممبر بھی تھے، جن میں دارالعلوم تاج المساجد بھوپال، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دارالعلوم دیوبند قابل ذکر ہیں۔

قاضی صاحب کی بے لوث علمی خدمت اور غیر متولی جاں فشانی کی بنا پر انھیں علمی و دینی وجاہت کی طرح دنیاوی وجاہت اور مادی فارغ البالی بھی حاصل ہوئی۔ ان کی عربی خدمات اور علمی و تحقیقی کاموں کے اعتراف کے طور پر سابق صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ نے انھیں توصیفی سند عطا کی۔ جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں پاکستان گئے تو وہاں بھی علمی خدمات کی بنا پر انعام و اکرام سے نوازے گئے۔ قاضی صاحب نے سندھ پر جو قابل قدر کام کیا ہے اس کی بدولت وہاں انکی پانچ کتابوں کے افتتاح کی تقریب ہوئی جس کی صدارت اس وقت کے وزیر اعلیٰ سندھ نے کی اور "محسن سندھ" کا خطاب بھی دیا۔

قاضی صاحب بڑے متواضع، منکسر المزاج اور خلیق تھے۔ وہ خلوص و محبت

اور دردمندی کا پیکر تھے۔ لوگوں کی حاجت روائی اور ان کے کام کر دینے میں ان کو لذت ملتی تھی۔ کسی کو ضرر پہنچانا یا ایذا دینا ان کا شیوہ نہ تھا۔ ان کی زندگی بڑی سادہ اور ہر قسم کے تکلف و تصنع سے بری تھی، اپنی وضع قطع اور ملنے جلنے کے انداز سے اپنی عظمت اور بڑائی ظاہر نہ ہونے دیتے، طبیعت میں غیرت و خودداری تھی، کسی کا احسان مند ہونا گوارا نہیں کرتے تھے، وہ کسی کے عہدہ و منصب اور جاہ و تمول سے نہ کبھی مرعوب ہوتے اور نہ اس سے دب کر اور جھک کر ملتے، اہل علم کی بڑی قدر کرتے، ان کے سامنے مصنوعی اور خود ساختہ بڑوں کو ہیچ و حقیر خیال کرتے، علم کی توہین کسی حال میں نہ ہونے دیتے، اصحاب علم کو دولتمندوں اور امرا کی خوشامد کرتے دیکھتے تو غضب ناک ہو جاتے۔ بڑے صاف گو تھے، ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا، لاگ لپیٹ، رو رعایت، ظاہر داری اور مصلحت پسندی انھیں نہیں آتی تھی، ناگوار باتوں اور غلط کاموں کو دیکھ کر چپ رہنے یا چشم پوشی کر لینے کو پسند نہ کرتے تھے، اور صحیح بات بے جھجھک برملا کہہ دیتے تھے۔

حرص و آز اور تملق سے نفرت تھی، غرور و تمکنت اور رعونت و نخوت کا کوئی شائبہ بھی ان میں نہ تھا، وہ خود ستائی اور خود نمائی کے بالکل عادی نہ تھے کوئی ایسی بات نہ کرتے جس سے انکی فضیلت و برتری ظاہر ہوتی، ان کی دینداری ریا و نمائش سے خالی تھی، وہ نام و نمود کے بجائے خاموش خدمت کو پسند کرتے۔

ہر ایک سے بشاشت اور گرم جوشی سے ملتے، ان کا آئینۂ دل بغض اور کینہ کدورت سے زنگ آلود نہ تھا، تعصب تنگ نظری اور جماعتی عصبیت کو سخت ناپسند کرتے تھے، ہر گروہ و مسلک کے لوگوں سے ان کے تعلقات تھے، ان کے جنازہ میں بڑا اژدحام تھا جس میں ہر مسلک و مشرب اور ہر فرقہ و گروہ کے لوگ شامل تھے۔ اپنے خوردوں سے بھی نہایت بے تکلفی سے ملتے اور محبت و شفقت کا برتاؤ کرتے، ان کی حوصلہ افزائی کے لئے ان کے معمولی اور ادنیٰ کاموں کی

داد دیتے، اپنے بزرگوں اور برابر کے لوگوں سے ہمیشہ عزت واکرام کا معاملہ کرتے۔ بڑے مہمان نواز تھے، علماء کو اکثر اپنے گھر آنے کی دعوت دیتے اور جب وہ پہنچ جاتے تو ان کو بڑی خوشی ہوتی اور خوب خاطر مدارات کرتے۔

اللہ تعالٰی علم و دین کے اس خادم کی مغفرت فرمائے اور اعزہ و متوسلین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین"

ص۲۶ کا بقیہ

مسنونہ کرلیں۔

جن حضرات کو حضرت مفتی صاحب کی طرف سے رمضان المبارک میں اعتکاف کا نظام قائم کرنے کی اجازت تھی ان سے یہ گذارش ہے کہ اس طرف خاص توجہ دیں اور اس میں اضمحلال نہ آنے دیں۔ دعا ہے کہ حق تعالٰی حضرت اقدس مفتی صاحب کو ان کی قربانیوں اور خدمات کا بھرپور صلہ مرحمت فرمائے اعلٰی علیین میں مقام عطا فرمائے۔ ان کی خطاؤں اور لغزشوں کی مغفرت فرمائے ہم خدام و متوسلین کو حضرت کی خوبیوں کی پیروی کی توفیق بخشے اور صبر جمیل سے نوازے۔

مولانا اعجاز احمد اعظمی
مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور اعظم گڈھ

قاضی صاحبؒ کا امتیازی وصف

قدیم ترین مآخذ میں عرب و ہند روابط کی جستجو

حضرت مولانا قاضی عبدالحفیظ صاحبؒ اطہر مبارکپوری علیہ الرحمہ اپنی کتاب "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں کہ:

آیئے ہم اور آپ تھوڑی دیر کیلئے تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے عالم اسلام کے علاقہ ہند و سندھ میں چلیں اور یہاں کے آثار و علائم اور کھنڈروں کی سیر کریں، یہ راہ اب تو بہت قدیم اور تیرہ و تاریک ہو چکی ہے، اس میں چلنے کیلئے ہمیں اسی قدیم دور سے روشنی بھی ساتھ لینی پڑے گی، جس کی رہنمائی میں ہمارے قدم آگے بڑھ سکیں گے ہمارا یہ علمی و تحقیقی رحلہ اور دینی و ثقافتی سفر ہندوستان کے مغربی ساحلوں سے شروع ہو کر سندھ کے آخری حدود پر ختم ہوگا، اس طویل سفر میں یوں تو قدم قدم پر ہمارے ماضی کی منزلیں آئیں گی۔ مگر ان میں پانچ منزلیں بہت اہم ہونگی، سندان، ملتان، منصورہ، مکران، اور طوران، ان منزلوں میں ہمارے دین و ایمان اور شان و شوکت کے قافلے صدیوں ٹھہرے ہیں۔ اور انکی عظمتوں کے تخت و تاج یہاں دفن ہیں ان منزلوں میں ہمیں تھوڑی دیر قیام

کر کے اپنی ایک ہزار سال پرانی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہے، مگر جیسا کہ
کہا گیا کہ اس میں ہمیں بہت سی مشکلات کا سامنا ہے اور اسی قدیم
دور کے اسلامی سیاحوں، مورخوں اور جغرافیہ نویسوں کے چند دھندلے
چراغوں کی مدھم روشنی کے مرہون منت رہیں گے۔"

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں عرب و ہند تعلقات کی تاریخ کے دھندلے
راستوں کا سراغ ابتداء ہندوستان کے نامور عالم اور مورخ حضرت مولانا سید سلیمان
ندوی علیہ الرحمہ نے لگانے کی کوشش کی، اور انھوں نے ان راہوں کے نقوش کو
"عرب و ہند کے تعلقات" میں محفوظ کر دیا تھا۔ اس وقت اہل علم کے لئے تاریخ
و تحقیق کا وہ ایک نیا باب تھا جو مفتوح ہو رہا تھا، پھر حضرت سید صاحب
اپنے دوسرے علمی مشاغل کی وجہ سے اس جانب توجہ نہ دے سکے۔ اور اجمالاً
جتنا وہ لکھ گئے تھے، اس کی تفصیلات مرتب نہ ہو سکیں، یہ ۱۹۲۹ء کی بات
ہے، سید صاحب کے بعد قاضی اطہر صاحبؒ نے ۱۹۴۸ء میں اس مضمون کو اپنی
تحقیق و جستجو کا موضوع بنایا۔

قاضی اطہر صاحبؒ نے ایسے عربی مدرسے میں تعلیم پائی تھی، جس کا نہ موضوع
تاریخ تھا، نہ وہاں اس سے کسی کو دلچسپی تھی۔ بلکہ اس کا موضوع و محور قرآن و حدیث
اور علم فقہ تھا، اور فی الحقیقت علم دین بنیادی طور پر اسی مثلث کا نام ہے بھی، اور پھر
تعلیم سے فراغت کے بعد اسی مدرسے میں چار سال تک معلمی کے فرائض بھی انجام دیئے
ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں جس طالب علم نے نشوونما پائی ہو اس کے بارے میں کیا
کہا جا سکتا ہے کہ وہ تاریخ و تذکرہ کے کوچہ میں قدم رکھے گا؟ تاہم واقعہ یہی ہوا
کہ دینی طالب علم اسی ماحول میں رہ کر اپنے "زمانۂ طالب علمی" ہی سے فن تاریخ
سے مناسبت پاتا ہے، اور اس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی ذوق رکھتا ہے
قاضی صاحب کو یہ ذوق قدرت کی طرف سے وہبی طور پر بخشا گیا تھا۔ اس میں

جلا روتر قی محنت وکاوش اور کسب وعمل سے ہوئی ورنہ ان کی درسگاہ کا ماحول ایسا نہ تھا کہ اس میں تاریخی تحقیقات کا کوئی داعیہ ابھرتا۔

قاضی صاحب کا بیان ملاحظہ ہو:

"مدرسہ احیاء العلوم (مبارکپور) کے مدرسین واراکین کو تصنیف و تالیف کا ذوق بالکل نہ تھا ایک مرتبہ بزم احباب احمد آباد نے ائمۂ اربعہ کے سوانح پر مدرسہ کے طلبہ سے مضمون طلب کیا تو بڑی مشکل سے بعض اساتذہ نے اسے ترتیب دیا"(۱)

اس واقعہ کے بعد ارباب مدرسہ کو خیال پیدا ہوا کہ طلبہ میں مطالعہ وتحقیق اور مضمون نگاری وانشاپردازی کا ذوق پیدا کرنا چاہیے، چنانچہ اس کا نظم کیا گیا، مختلف علوم وفنون کی غیر درسی کتابیں منگائی گئیں، طلبہ کی انجمن بنائی گئی اور اس کے تحت مشق وتمرین کا قدرے اہتمام کیا گیا۔ قاضی صاحب اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"دارالمصنفین، ندوۃ المصنفین، جامعہ ملیہ اور دارالتراجم کی کتابوں نیز معارف، برہان اور جامعہ وغیرہ رسائل سے مجھے بہت رہنمائی ملی، ان کتابوں میں عام طور سے حوالے ہوتے، ان کو دیکھ کر عربی کے اصل ماخذوں سے براہ راست استفادہ کا شوق پیدا ہوا، چنانچہ اس زمانہ میں تاریخ وطبقات کی متعدد کتابیں اسی داعیہ پر خریدیں"(۲)

بہرحال اس طرح اپنے ذوق وشوق اور وسعت مطالعہ کی بدولت قاضی صاحب کی طبیعت کا ایک رخ بنتا جا رہا تھا اور اس سلسلے میں انھیں افراد ورجال سے رہنمائی کم ملی، زیادہ تر کتابوں اور علمی مجلات سے انھیں راستہ ملتا رہا، اس وقت مبارکپور سے بالکل قریب اعظم گڈھ میں دارالمصنفین ایک بلند پایہ علمی وتحقیقی ادارہ تھا، جو تصنیف وتالیف، تاریخ وتحقیق اور نشرواشاعت

ہر لحاظ سے اپنے دورِ شباب پر تھا۔ لیکن اس کا افادہ ایک حلقۂ خاص تک محدود تھا، اس لئے قاضی صاحب وہاں کے اہلِ علم اور اہلِ تصنیف حضرات سے براہِ راست کوئی استفادہ نہ کر سکے، فرماتے ہیں:

"اس زمانہ میں دار المصنفین اعظم گڈھ میں کئی مشہور اہلِ علم تصنیف و تالیف اور تحقیقی کاموں میں مشغول تھے۔ میں کبھی کبھی ساتھیوں کے ہمراہ وہاں جاتا تھا، مولانا سید سلیمان ندوی ادھر ادھر آتے جاتے ہم لوگوں کو دیکھ کر رک جاتے اور خیریت دریافت کرتے، بعض اوقات وہ خود بھی مدرسہ احیاء العلوم میں آیا کرتے تھے، مگر ان سے یا دار المصنفین کے کسی عالم سے استفادہ نہ ہو سکا ویسے بھی دار المصنفین دوسروں کے حق میں شجرِ ممنوعہ ہے۔ البتہ وہاں کی تصانیف اور رسالہ معارف سے بہت فائدہ ہوا، اور ان سے میرے تصنیفی ذوق کو مدد ملی"[۲]

فراغت کے بعد قاضی صاحب نے چار سال مدرسی کی، پھر امرتسر اور لاہور میں صحافت، تصنیف و تالیف اور شاعری کے میدانوں میں جولانئ طبع دکھاتے رہے یہ ایک عبوری دور تھا۔ جس میں ابھی طبیعت کا کوئی خاص رجحان متعین نہ ہوا تھا، تاہم آثار اسی وقت سے ایسے نظر آ رہے تھے کہ بالآخر تاریخ کی وادی کی جانب سمتِ سفر متعین ہو گی۔ اس دور میں قاضی صاحب نے امرتسر میں ردِ شیعیت اور ردِ قادیانیت پر مضامین لکھے۔ لاہور میں تفسیر کی متعدد کتابوں سے مضامین کا انتخاب کر کے "منتخب التفاسیر" مرتب کی۔ اس کے علاوہ "علمائے اسلام کی خونیں داستان"، "الصالحات"، "ائمہ اربعہ" کی تالیف کی، پھر اسی دوران حیات امام احمد بن حنبل اور حیات امام لیث بن سعد مصری اور الطبابۃ عند العرب کیلئے معلومات مہیا کئے، لیکن ان میں سے کوئی چیز شائع نہ ہو سکی، سارا اثاثہ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کی نذر ہو گیا، لیکن تاڑنے والے تاڑ سکتے ہیں کہ ذوق اور رجحانِ طبع

انھیں کہے جا رہا ہے ۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان تقسیم ہو گیا، قاضی صاحب کا مرکز علم اور دارالعمل لاہور تھا۔ اب وہ پاکستان کا حصہ بن گیا، اور قاضی صاحب کے لئے وہاں کا راستہ مسدود ہو گیا، اس لئے انھوں نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مدرسی اختیار کر لی، ڈابھیل ہی سے انھیں اپنی وہ راہ ملی جس پر چل کر وہ منفرد محقق و مورخ اور عالم اسلام کے باوقار علمی حلقوں کے رکن بنے ۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کا کتب خانہ علوم و فنون کی امہات الکتب کا سرمایہ دار تھا۔ قاضی صاحب اسی کتب خانہ میں احمد امین مصری کی کتاب "ضحی الاسلام" کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اس میں مشہور امام لغت و ادب ابن الاعرابی کے متعلق لکھا ہوا تھا کہ "کان اصلہ سندیا"۔ وہ اصلاً سندھ کے تھے۔ یہیں سے قاضی صاحب کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ جب عربی لغت و ادب کا اتنا بڑا امام اصلاً سندھی ہے تو نہ جانے کتنے علماء و فضلاء ہوں گے، جن کا نسلی و خاندانی تعلق ہندوستان اور سندھ سے ہوگا۔ لیکن اب ان کا شمار اہل عرب کے زمرہ میں ہوتا ہے۔ (۴)

یہ خیال دل میں بنیاد بن کر جم گیا، اور پھر اس پر سندھ و ہند کے اکابر رجال اور عرب و ہند کے تعلقات کی تاریخی عمارتوں کا سلسلہ قائم ہوا، اور بالآخر اسی بنیاد پر آٹھ عظیم کتابیں تیار ہو گئیں۔ ان کے نام بالترتیب یہ ہیں :

(۱) رجال السند والہند الی القرن السابع (عربی)

(۲) عرب و ہند عہد رسالت میں (اردو)

(۳) ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں (")

(۴) العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین (عربی)

(۵) اسلامی ہند کی عظمت رفتہ (اردو)

(۶) خلافت راشدہ اور ہندوستان (اردو)

(۷) خلافتِ امویہ اور ہندوستان (")

(۸) خلافت عباسیہ اور ہندوستان (")

اس موضوع کی دشواری اور اس میں معلومات کی قلت کا اعتراف تمام اہل نظر نے کیا ہے، اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ اسلامی ہند کی تاریخ کے تسلسل میں یہ ایک بڑا خلا تھا جس کو پُر کرنا ضروری تھا، اس کی طرف ابتداءً حضرت سید سلیمان ندوی کو توجہ ہوئی۔ ان کے بعد پھر قاضی صاحب اس راہ پر تفصیلاً چلے، ایک ایک نقشِ قدم کو تلاش کیا، پرانے کھنڈرات کو کُریدا، تاریخ کے چہرے پر پڑے ہوئے صدیوں کے غبار کو صاف کیا، علائق و روابط کی کڑیوں کی تلاش و جستجو میں نامعلوم اور نامانوس وادیوں میں پہونچے، اور جہاں سے خزف ریزوں کی امید نہیں ہو سکتی تھی وہاں سے ہیرے تلاش کر لائے۔ اور جب یہ کام مکمل کر لیا تو ان کی اس سلسلہ کی اردو کتابوں کے بزرگ اور صاحب نظر ناشر مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی علیہ الرحمہ نے اعتراف کیا کہ:

اس میں شک نہیں کہ قاضی صاحب اس بے آب وگیاہ صحرا میں تنہا چلے، اور جب لوٹے تو باغ و بہار کا پورا قافلہ اپنے ساتھ لائے۔(۵)

قاضی صاحب نے اس بے آب وگیاہ صحرا کا سفر جن علامتوں کی رہنمائی میں طے کیا ہے، اور بقول ان کے جن چند دھندلے چراغوں کی مدھم روشنی میں ایک ایک قدم انھوں نے آگے بڑھایا ہے، ہم ان کی کتابوں کی روشنی میں انھیں علائم راہ اور انھیں دھندلے چراغوں کو دیکھنا چاہتے ہیں، کہ ہندوستان و عرب کے تعلقات جن پر قدامت عہد نے ذہول و نسیان کی گرد ڈال دی تھی، انھیں کن کن جانکاہیوں اور دشواریوں سے روشنی میں لایا گیا ہے۔

جستجو کی جگر کاویاں عام طور سے دستور ہے کہ جب کسی مصنف کو کسی

موضوع پر کچھ لکھنا ہوتا ہے ، اس موضوع سے متعلق کتابوں ، مضمونوں اور نوشتوں کی تلاش ہوتی ہے ، انھیں پڑھنے کے بعد ان کے بین السطور اور حواشی سے دوسرے مراجع و مصادر کی جانب نگاہ جاتی ہے ، اور انھیں دیکھ بھال کر اپنی ایک نئی ترتیب کے ساتھ مضمون یا کتاب مرتب کر دیتا ہے ۔

لیکن مصنف اس وقت سخت مشکل سے دوچار ہوتا ہے ، جب اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے موضوع پر یکجائی معلومات نہیں ہیں ، اور نہ خاص اس موضوع پر کوئی مستند اور محققانہ کتاب ہے ۔ اس صورت حال میں اس کے لئے بجز اس کے اور کوئی راہ عمل نہیں ہوتی کہ بہت سی کتابیں موضوع سے متعلق اور غیر متعلق پڑھے نہیں بلکہ نہایت دیدہ وری سے مطالعہ کرے ، ہر ہر لفظ کو خاص طور سے نگاہ میں رکھے شاید وہ اس کی منزل کا سراغ بتائے ۔ قاضی صاحب کو اسی راہ پر چلنا پڑا تھا ۔

دنیا کے علمی موضوعات میں تاریخ کا فن قدیم ترین فن ہے ، ہر دور میں لوگوں نے پچھلی تاریخ مدون کی ہے ، آدمی کا فطری مذاق ہی یہ ہے کہ خواہ اس کے اوپر بیتے ہوئے حالات و واقعات ہوں یا دوسروں پر ، اسے پچھلی باتوں سے غیر معمولی دلچسپی ہوتی ہے ، واقعات و حوادث اپنے اپنے وقت پر گزر جاتے ہیں ، لیکن انسان ان واقعات کو کبھی لفظوں میں اور کبھی تصویری حکایات میں باقی رکھنے کی کوشش کرتا ہے ، واقعات کی یہی لفظی تصویریں تاریخ ہیں ۔

دنیا میں جب اللہ کے آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا دور آیا تو دنیا میں تاریخ کا اُجالا پھیل چکا تھا ، لیکن آپ کی بعثت کے بعد یہ فن ایک نئے ارتقائی دور میں داخل ہوا ، اور دیکھتے ہی دیکھتے علمائے اسلام نے اصول و قواعد اور تصنیف و تالیف کے اعتبار سے زمین سے آسمان تک پہنچا دیا اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب اور اپنے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقوال و اعمال اور ہر نقل و حرکت کی حفاظت و بقاء کا ایسا مستحکم نظام بنایا کہ پچھلے لوگ

انھیں اسی طرح دیکھ سکیں، جس طرح اگلے لوگوں نے دیکھا تھا، پھر آپ کے طفیل ہی دنیا میں جہاں جو کچھ ہوا، دنیا نے اسے محفوظ رکھنے کی کوشش کی، تصنیف کا قدم آگے بڑھا، تحقیقی دستاویزیں تیار کی گئیں۔

اسلام کی جہاں تاب شعاعیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ہی عرب کے حصار سے نکل کر دوسرے ممالک پر پڑنے لگی تھیں، ہندوستان سمندر پار تھا، مگر یہ بھی اس کی نورانی کرنوں سے محروم نہ رہا، پھر حضرات صحابہ کرام اور تابعین و مجاہدین، جہاد و غزوات اور علمی و تجارتی سفروں کے واسطے سے آفاق عالم میں پہونچنے لگے تو ہندوستان کی زمین کو بھی اس شرف سے حصہ ملا۔ عہد اول کے مسلمانوں نے یہاں جہاد بھی کئے، حکومتیں بھی قائم کیں، علم کی روشنی بھی پھیلائی تاریخ نے ان واقعات کا ریکارڈ بھی تیار کیا، مسلمانوں کا قدم اور قلم ساتھ ساتھ تھا۔ جہاں قدم پہونچا وہاں قلم نے بھی اپنا کام کیا، چنانچہ قاضی صاحب خود خبر دیتے ہیں کہ:

> دوسری صدی ہجری میں جب علمائے اسلام نے اسلامی بلاد و امصار اور مسلم ممالک کی فتوحات و امارات اور رجال کی تاریخ مرتب کرنی شروع کی، تو ہندوستان اور سندھ کو بھی اپنا موضوع بنایا، اور یہاں کی اسلامی اور علمی تاریخ لکھی۔ (۹)

عام فتوحات و غزوات پر تو بے شمار کتابیں لکھی گئیں اور ان کے ذیل میں ہندوستان اور سندھ کا بھی ذکر آتا رہا، لیکن قاضی صاحب اطلاع دیتے ہیں کہ ان کے علاوہ اس دور میں اسلامی ہند کے سلسلے میں خاص طور سے بھی کتابیں لکھی گئی تھیں، مگر اب وہ نا پید ہیں۔ جن لوگوں نے کتابوں کی تاریخ لکھی ہے انھوں نے اس موضوع پر متعدد کتابوں کی خبر دی ہے، مورخ کو افسوس ہوتا ہے کہ ان بنیادی وثائق میں سے اب کوئی وثیقہ محفوظ نہیں ہے۔ قاضی صاحب

ان بنیادی وثائق کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

- محمد بن عمر واقدی ۲۰۷ھ کی کتاب اخبار فتوح بلد السند، ہمارے علم وتحقیق میں خاص ہندوستان کی فتوحات پر پہلی کتاب ہے، اس کا تذکرہ قاضی رشید بن زبیر نے کتاب الذخائر والتحف میں ایک مقام پر کیا ہے[1]۔ قاضی رشید کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب پانچویں صدی تک پائی جاتی تھی[2]۔

واقدی کی کتاب کے علاوہ ایک دوسرے مورخ اور ماہر انساب علامہ ابوالحسن علی بن مدائنی متوفی ۲۲۵ھ نے بھی ہندوستان کے فتوحات وغزوات اور امارات پر تین کتابیں لکھی تھیں، علی بن مدائنی اپنے دور کے عام مورخوں میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے خصوصی عالم وماہر تسلیم کئے جاتے تھے، اور اس بارے میں اپنے معاصرین میں ممتاز درجہ کے مالک تھے، قاضی صاحب نے ابن ندیم کی مندرجہ ذیل عبارت

قالت العلماء ابو مخنف بامر العراق واخبارها وفتوحها يزيد على غيره والمدائنی بامر خراسان والهند وفارس والواقدی بالحجاز والسيرة وقد اشتركوا فی فتوح الشام (الفهرست ص۱۰۳)

علماء نے کہا ہے کہ ابو مخنف لوط بن یحیٰ عراق کے فتوحات ومعاملات کے علم میں دوسروں سے فائق ہے، اور مدائنی خراسان، ہندوستان اور فارس کے فتوحات ومعاملات میں آگے ہے اور واقدی حجاز کے غزوات وفتوحات، سیر ومغازی میں زیادہ علم رکھتا ہے، اور شام کے فتوحات میں سب کا علم برابر ہے

---

[1] قاضی رشید بن زبیر کی کتاب "الذخائر والتحف" کو حکومت کویت کے ایک ادارہ نے ۱۹۶۱ء میں شائع کر دیا ہے۔ (اسیر ادروی)

کے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

"ابن ندیم نے ہندوستان پر مدائنی کی ان تین کتابوں کا ذکر کیا ہے
(۱) کتاب ثغر الہندی (۲) کتاب عمال الہند (۳) کتاب فتح مکران
ان کتابوں کے ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلی کتاب میں ہندوستان
کے اسلامی غزوات اور فتوحات کا بیان رہا ہوگا، دوسری کتاب
میں یہاں کے حکمرانوں اور والیوں کے حالات رہے ہوں گے اور تیسری
کتاب مستقل طور سے مکران کی فتوحات پر رہی ہوگی"۔ (۸)

قاضی صاحب نے یہ کتابیں ابن ندیم کی الفہرست میں پائیں۔ ان کے ناموں سے ان کے موضوعات کا اندازہ لگایا، لیکن انھیں افسوس ہے کہ ان قدیم ترین اور صحیح ترین تینوں دستاویزوں میں سے کوئی ایک بھی ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے، ہاں اتنا ہوا کہ بعد کے مورخین نے ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے سلسلے میں مدائنی کی روایات کہیں کہیں درج کی ہیں، ان کے ذریعے سے ان کتابوں کے کچھ مندرجات کا سراغ مل جاتا ہے۔

قاضی صاحب کو جستجو تھی کہ اب جو کچھ بچا کھچا سرمایہ تاریخ کے دامن میں رہ گیا ہے، اسی سے کام لیا جائے تاریخ کی جو کتابیں ہندوستانی مصنفین نے لکھی ہیں وہ تقریباً سبھی ابتدائی صدیوں کے تذکرے سے خالی ہیں، اس لئے مورخ نے اپنی توجہ عرب مورخین اور مصنفین کی طرف برقرار رکھی، ان کی جو کتابیں دنیائے علم کی خوش قسمتی سے محفوظ رہ گئی ہیں قاضی صاحب نے وسائل کی قلت کے باوجود ان سے استفادہ کرنے کی سعی بلیغ کی، اس سلسلے کی چند بنیادی کتابوں کا تعارف سطور ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

فتوحات وغزوات کے سلسلے کی کتابوں میں علامہ بلاذری کی فتوح البلدان خلیفہ بن خیاط کی تاریخ خلیفہ یعقوبی کی تاریخ یعقوبی، اور ہندوستانی کتب تاریخ

میں چچ نامہ اور تاریخ فرشتہ سے استفادہ کیا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ رحلہ سلیمانی التاجر، مروج الذہب، اخبار الزماں، عجائب الہند، احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، رحلۃ ابی دلف کے حوالوں، کتاب الفہرست، کتاب الہند علامہ بیرونی سے بہت سے معلومات فراہم ہوئے جغرافیہ کی عام کتابوں میں کتاب البلدان، کتاب الممالک والمسالک، مسالک الممالک، الاطلاق النفیسہ، تحفۃ الالباب، معجم البلدان وغیرہ میں ہندوستان کے متعلق بہت سے معلومات درج ہیں۔ کتاب الانساب میں علامہ سمعانی نے یہاں کے بہت سے شہروں وغیرہ کے جغرافیہ کو ذکر کر کے وہاں کے اعلام و مشاہیر کے تذکرے درج کیے ہیں۔

قاضی صاحب نے عرب و ہند کے سلسلۂ تصانیف میں جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے، ان کی فہرست تو طولانی ہے، ان کی تعداد سینکڑوں تک پہونچتی ہے انھوں نے ہر کتاب کے آخر میں مراجع و مصادر کا نقشہ شامل کر دیا ہے۔ انھیں دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس موضوع پر انھیں کتنی ریاضت کرنی پڑی ہے، اس دشواری کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے، جب یہ بات سامنے آتی ہے کہ قاضی صاحب کسی بڑے تحقیقی و تصنیفی ادارے کے عظیم الشان کتب خانے میں بیٹھ کر چیونٹیوں کے منہ سے یہ دانے نہیں نکال رہے ہیں۔ اور نہ کوئی اکیڈمی یا کوئی دار التصنیف ان کے لیے ضروری کتب کی فراہمی کا کفیل ہے، اور نہ اس محنت و کاوش کے لئے انھیں کہیں سے کوئی سرمایہ میسر ہے، بلکہ خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ۔ کے مصداق بمبئی جیسے غیر علمی بلکہ علم کش شہر میں بیٹھے ہوئے ہیں، ثروت و دولت کی رونقیں ہر طرف سے نگاہوں کو خیرہ کرنے کے لیے برس رہی ہیں، لیکن وہ اپنے معمولی سے حجرے میں آنکھیں بند کیے ہوئے شب و روز کی گردش سے بے نیاز خون جگر جلا رہے ہیں، کتابیں ظاہر ہے کہ ان کے پاس نہ تھیں انکی تلاش

میں مختلف کتب خانوں میں سرگرداں رہتے تھے، بمبئی میں جہاں جہاں کتابوں کے ملنے کا امکان ہوتا، جاتے، کتابیں نکالتے، مطالعہ کرتے اپنے کام کی باتیں نوٹ کرتے، ہندوستان کے جس جس شہر میں جانا ہوتا، کتب خانوں کا پتہ ضرور لگاتے حج کے لئے جاتے تو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے کتب خانوں میں جاتے، وہاں بہت سی کام کی کتابیں اور باتیں ملتیں، انھیں لکھ لیتے، ان کی وہ کتابیں جن میں انھوں نے مختلف کتب خانوں سے اقتباس لئے ہیں، ان کی محنت و کاوش کی داستانیں خاموش زبان سے سنائی ہیں، اب آپ یہ بھی سن لیجئے کہ اتنی جگر کاوی سے جن کتابوں کی ترتیب کے لئے وہ شب و روز کی بے نہایت مشقت برداشت کرتے تھے انھیں ان سے مادی اور مالی منفعت نام کی کوئی چیز نہیں ملتی تھی، وہ اپنی کتابوں پر کوئی رائلٹی نہیں لیتے تھے، انھوں نے اپنی اس تلاش و جستجو اور کاوش کی ہلکی سی جھلک اپنی ایک غیر مطبوعہ تحریر میں دکھائی ہے۔ لکھتے ہیں:

فرصت کے اوقات میں رجال السند والہند کی تالیف اور جمع و ترتیب میں لگ گیا، صبح دس بجے سے دو بجے تک ابنا مولوی محمد بن غلام رسول سورتی تاجر کتب جامع محلہ میں بیٹھا کرتا، تاریخ و رجال اور طبقات کی کتابوں سے سندی و ہندی رجال کے حالات جمع کرتا تھا، اسی طرح شرف الدین الکتبی و اولادہ تجار الکتب محمد علی روڈ بمبئی کے یہاں مستقل طور سے بیٹھ کر وہاں کی کتابوں سے استفادہ کرتا تھا، ان دونوں کتب خانوں میں اس سلسلہ کی جو کتاب ہوتی، میں سرسری طور پر دیکھ کر اپنے مطلب کی بات نقل کر لیتا تھا، ان کے مالک میرے ساتھ بہت محبت و تعاون کا سلوک کرتے تھے، بعض اوقات کتابیں کمرے میں لاکر نقل کرتا تھا، اسی کے ساتھ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ محمدیہ سے بھی استفادہ کرتا تھا، اور محترم سید محمد صدیق صاحب قادری[1] کے

توسط سے اسمٰعیل یوسف کالج جوگیشوری کے عربی پروفیسر مرحوم
احمد بہاء الدین داور کرصاحب[(۱۰)] کے ذریعے المالک والممالک
ابن خردازبہ، مسالک الممالک اصطخری، احسن التقاسیم مقدسی
بشاری، مسالک الابصار فضل اللہ عمری اور لائڈن کی دیگر مطبوعہ کتابیں
لاکر نقل کرتا تھا، ان کتب خانوں کے علاوہ سفر و حضر میں جہاں
کوئی ایسی کوئی کتاب مل جاتی جس میں میرے موضوع کی کوئی بات
ہوتی، تو فوراً نقل کر لیتا تھا تاکہ کتاب جلد سے جلد مرتب ہو سکے[(۱۱)]"

قاضی صاحب ایک دھن کے آدمی تھے، انھیں اس موضوع کی تکمیل کرنی تھی،
اللہ تعالیٰ نے تمام دشواریوں اور حوصلہ شکن حالات کے باوجود ان کے لئے اس کو
آسان کیا، وہ اپنی وفات سے بہت پہلے عرب و ہند کے تعلقات کا دائرۃ المعارف
تیار کر گئے۔ اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے تسلسل میں جو ایک مہیب خلا
محسوس ہوتا تھا، اسے انھوں نے پُر کر دیا۔

ہمارے اس مضمون کا موضوع وہ کتابیں ہیں، جن سے قاضی صاحب
نے بنیادی طور پر کام لیا ہے، پچھلی سطروں میں جن چند کتابوں کا نام لیا گیا ہے
ان کا قدرے تعارف کرا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

فتوح البلدان

علامہ بلاذری المتوفی ۲۷۹ھ

یہ کتاب علامہ ابوالحسن احمد بن یحییٰ بن جعفر بلاذری کی بیش قیمت تصنیف
ہے، علامہ بلاذری بغداد کے رہنے والے تھے، اور عباسی خلفاء متوکل،
مستعین اور معتز کے دربار میں باریاب تھے، جغرافیہ، تاریخ، ادب، اور
روایت وانساب کے ماہر تھے، شاعر بھی تھے، فارسی زبان سے بخوبی واقف تھے
اور فارسی سے عربی میں کتابوں کا ترجمہ کرتے تھے، ان کی مشہور کتابوں میں

انساب الاشراف واخبار ہم بیس جلدوں میں ناتمام ہے ۔ اور دوسری کتاب فتوح البلدان ہے جس میں اسلامی فتوحات کا ذکر ہے ، اس سلسلے میں انھوں نے سندھ پر مسلمانوں کے حملوں کا مفصل تذکرہ کیا ہے ، اور یہاں کے متعلق بعض سیاسی اور تاریخی معلومات بھی بیان کئے ہیں ، یہ کتاب یورپ اور مصر دونوں جگہوں سے شائع ہو چکی ہے ۔ بلاذری کا انتقال ۲۷۹ھ میں ہوا ۔ [12]

قاضی صاحبؒ اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں کہ

> "علامہ بلاذری نے ۲۵۵ھ میں فتوح البلدان جیسی اہم کتاب لکھی اور اس میں فتوح السند کا مستقل عنوان قائم کر کے تیسری صدی کے وسط تک کے حالات درج کئے ، اس حصہ میں عہد فاروقی سے لے کر معتصم باللہ تک ہندوستان کے مختصر حالات موجود ہیں ، جن میں حضرت محمد بن قاسمؒ کے فتوحات نسبتاً مفصل ہیں ، ان بارہ تیرہ صفحات کو ہم اسلامی ہندوستان پر مستقل تصنیف سمجھتے ہیں ، جو فتوح البلدان کے ساتھ ہمارے پاس موجود ہے ۔ [13]

قاضی صاحب کی تحقیق ہے کہ ۱۹۸ھ کے حدود میں مامون الرشید کے عہد خلافت میں بنو سامہ کے ایک آزاد کردہ غلام فضل بن ماہان نے ہندوستان کے ایک مشہور اور مرکزی شہر سندان پر قبضہ جمایا ، یہ شہر بلاد جیمور میں شامل تھا ، بلاد جیمور کا لفظ تھانہ ، سوپارہ اور سندان پر بولا جاتا تھا [14]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نواح بمبئی میں یہ حکومت قائم ہوئی تھی ، اس حکومت کا سراغ علامہ بلاذری کی فتوح البلدان سے ملا اور اس کے بنیادی معلومات وہیں سے فراہم ہوئے ، فرماتے ہیں کہ :

> دولت ماہانیہ سندان کی پوری داستان صرف بلاذری کی اس تصریح کے رہین منت ہے [15]

پھر آگے فتوح البلدان سے تصریح نقل کی ہے، بنیادی چیز تو یہی ہے،
لیکن پھر قاضی جی نے اپنی ژرف نگاہی سے اس کے اور بھی دلائل و شواہد اشعا
عرب وغیرہ سے مہیا کئے ہیں تفصیل کے لئے دیکھئے۔۔ ہندوستان میں عربوں
کی حکومتیں۔

تاریخ خلیفہ بن خیاط المتوفی ۲۴۰ھ

فتوحات وغزوات کے سلسلے میں خلیفہ بن خیاط کی تاریخ بڑی اہمیت
کی حامل ہے، اس کی یہ پہلی جلد ۱۳۸۶ھ مطابق ۱۹۶۶ء میں دمشق میں چھپی ہے
اس کی پہلی جلد قاضی صاحب کے سامنے تھی، اس میں ۱۱۰ھ تک کے واقعات
و حوادث کا تذکرہ ہے اس میں پہلی صدی کے خاتمہ تک عالم اسلام کے بلاد و امصا
کے حالات کی طرح ہندوستان کے اسلامی حالات بھی درج ہیں سن وار تاریخ
پر یہ پہلی کتاب ہے جو نہایت معتبر و مستند ہے، اور اس میں ہندوستان کے بارے
میں نہایت نادر معلومات ملتے ہیں، اسلئے بلاذری کی فتوح البلدان کی طرح
خلیفہ بن خیاط کی تاریخ کو بھی ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے اہم ماخذ کی حیثیت
حاصل ہے (۱۶)

تاریخ یعقوبی

احمد بن یعقوب المتوفی ۲۸۶ھ

احمد بن یعقوب بن جعفر عباسی سلطنت میں دفتر انشا کا افسر تھا، اس نے
مشرق ومغرب اور اسلامی سلطنت کے اکثر ممالک کی سیر و سیاحت کی تھی، اور
ہندوستان بھی آیا تھا، اس کی دو مشہور کتابیں ہیں، ایک تاریخ میں دوسری
جغرافیہ میں۔ مگر تعجب ہے کہ اس نے جغرافیہ میں ہندوستان کا حال نہیں لکھا
البتہ تاریخ میں ہندوستان کی ان کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ جس کا عربی میں ترجمہ
ہوا ہے۔ اور مسلمانوں کے فتوحات کے ذکر میں سندھ ایران کے حملوں کا بھی

تذکرہ ہے یہ پہلا مسلمان مورخ ہے جس نے تمام دنیا کی عربی میں تاریخ لکھی ہے، تاریخ یعقوبی ۱۸۸۳ء میں لیڈن سے دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے، یعقوبی کا انتقال ۲۸۴ھ یا ۲۸۶ھ میں ہوا (۱۷)

منہاج الدین (چچ نامہ)

علی بن حامد کوفی اوشی سندھی

الور (سندھ) کے قاضی و خطیب اسمٰعیل بن علی ثقفی سندھی (موجود ۶۱۳ھ) کے آباء و اجداد میں سے کسی عالم نے ایک کتاب بنام تاریخ السند وغزوات المسلمین علیہا و فتوحاتہم، عربی زبان میں لکھی تھی، غالباً یہ کتاب تیسری صدی ہجری میں لکھی گئی تھی۔ مگر اس کا نام ہی نام باقی ہے، اس کا دوسرا نام ۔ منہاج الدین .. بھی تھا، علی بن حامد بن ابو بکر کوفی اوشی سندھی نے ۶۱۳ھ میں اسی تاریخ السند کے کچھ اجزاء حاصل کرکے ان کا فارسی میں ترجمہ کیا اور مزید اضافہ کرکے فارسی زبان میں ایک کتاب چچ نامہ مرتب کی، یہ کتاب مہاراجگان سندھ کے عہد سے شروع ہو کر محمد بن قاسم کے فتوحات تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔

اس کتاب میں سندھ کے راجہ چچ (صعصہ) سے محمد بن قاسم کی جنگوں کی تفصیلات کا زیادہ تر ذکر ہے اس لیے اس کا نام چچ نامہ ہوگیا، یہ کتاب تعلیق و تحقیق کے ساتھ شائع ہوئی ہے، مگر افسوس کہ پوری کتاب تصحیف و تحریف سے پر ہے، خاص طور سے امراء و مجاہدین کے ناموں میں بڑا الجھاؤ ہے اس کے باوجود ہندوستان کے فتوحات و غزوات پر ایک ہندوستانی عالم کی یہ پہلی کتاب ہے، قاضی اسمٰعیل کے جدامجداد، علی بن حامد کوفی اوچی کے علاوہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر اس وقت تک کسی نے خامہ فرسائی نہیں کی تھی اس لیے یہ دونوں مورخ و مصنف بہت اہم ہیں (۱۸)

المسالک والممالک

ابن خرداذبہ المتوفی ۳۰۰ھ (تقریباً)

ابن خرداذبہ کا نام عبیداللہ بن عبداللہ بن احمد بن خرداذبہ ہے کنیت ابوالقاسم ہے، اصلاً خراسان کے رہنے والے تھے بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی، ان کے دادا خرداذبہ مجوسی تھے برامکہ کے ہاتھ پر اسلام لائے، ابن خرداذبہ عباسی خلیفہ معتمد کے زمانے میں ڈاک اور خفیہ اطلاعات کے محکمہ میں افسر تھے، اور اس کے خاص مصاحبوں اور ندیموں میں ان کا شمار ہوتا تھا، ان کی کئی کتابیں ہیں، مگر مشہور اور مطبوعہ یہی المسالک والممالک ہے، جو عربی زبان میں جغرافیہ کی پہلی کتاب ہے، جس میں ہندوستان کا ذکر ملتا ہے اس میں بغداد سے مختلف ملکوں کی آمدورفت کے راستوں اور مسافتوں کے علاوہ دوسرے تاریخی معلومات بھی درج ہیں، اور ہندوستان کے بری و بحری راستوں اور یہاں کی مختلف ذاتوں کا ذکر ہے، ابن خرداذبہ اگرچہ ہندوستان نہیں آئے تھے، مگر ان کے عام معلومات کی بنیاد بطلیموس کا جغرافیہ اور خاص معلومات کا دارومدار ان کے محکمہ کے سرکاری اطلاعات پر ہے اور ان کے عہدہ کی وجہ سے اکثر تاجروں اور مسافروں سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں، اس لئے انکے یہ ذاتی معلومات ایک ہندوستانی کے معلومات سے کم نہیں ہیں، ابن خرداذبہ نے یہ کتاب تیسری صدی ہجری کے وسط میں لکھی ہے، ان کی پیدائش ۲۱۱ھ میں ہوئی اور وفات کا سال ۳۰۰ھ کے قریب ہے (۱۹)

رحلۃ سلیمان التاجر (سلسلۃ التواریخ)

موجود ۲۳۷ھ

یہ سب سے پہلا عرب سیاح ہے، جس کا سفرنامہ ہم تک پہونچا ہے، ۱۸۱۱ء میں پیرس میں سلسلۃ التواریخ کے نام سے چھپا ہے، یہ ایک سوداگر تھا

جو عراق کی بندرگاہ سے چین تک سفر کیا کرتا تھا۔ اور اس طرح یہ ہندوستان
کے پورے ساحل کا چکر لگایا کرتا تھا، اس نے اپنا یہ سفرنامہ ۲۳۷ھ میں لکھا ہے۔
یہ سب سے پہلا ماخذ ہے جس میں بحر ہند کا نام ہم کو دریائے ہرگند
ملتا ہے، اور پھر اہل عرب نے اسی نام سے اس کو یاد کیا ہے، ہرگند سمندر اس
کے حصے کو کہتے ہیں، جو جنوبی ہند کے کناروں سے بہتا ہے[۲۰]۔

رحلۃ ابی زید سیرافی

موجود ۳۰۰ھ

ابوزید حسن سیرافی تیسری صدی ہجری کا ایک سیاح اور تاجر تھا، سیراف
خلیج فارس کی مشہور بندرگاہ تھی ابوزید یہیں کا رہنے والا تھا ۳۰۳ھ میں
مشہور سیاح اور مورخ مسعودی کی اس سے سیراف میں ملاقات ہوئی تھی، اس
نے سلیمان کے سفرنامہ کو پڑھ کر اس کے ۲۰ - ۲۵ برس کے بعد اس کا تکملہ لکھا ہے
یہ بھی سیراف اور ہندوستان اور چین کے درمیان دریائی تجارتی سفر کیا کرتا تھا[۲۱]۔
اس کا یہ تکملہ بھی سلیمان تاجر کے سفرنامہ کے ساتھ پہلی مرتبہ پیرس سے ۱۸۴۵ء میں
چھپا ہے۔[۲۲]

قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ :

یہ دونوں قدیم ترین تاجر و سیاح ہیں، جنھوں نے اپنے مختصر سفرناموں
میں ہندوستان اور چین کے بارے میں پہلی بار نہایت اہم اور نادر
معلومات فراہم کئے ہیں، خاص طور سے ہندوستان کے راجوں مہاراجوں
کے عام اخلاق و عادات، اور مذہبی باتیں بیان کی ہیں[۲۳]۔

مروج الذہب

علامہ مسعودی (المتوفی ۳۴۶ھ)

علامہ مسعودی کا نام ابوالحسن علی بن حسین تھا، بغداد کے رہنے والے، ایک

بلند پایہ مورخ، جغرافیہ نویس اور سیاح کی حیثیت سے مشہور ہیں، انھوں نے
اپنی عمر کے پچیس سال سیر و سیاحت میں بسر کیے (۲۴)

انھوں نے مختلف ملکوں کی سیاحت کے ساتھ سندھ، گجرات، چیمور
وغیرہ کی سیاحت کی، اور ان جگہوں کے چشم دید حالات مروج الذہب میں
درج کیے، وہ ۳۰۴ھ میں یہاں موجود تھے اس کتاب میں یہاں کے راجوں مہاراجوں
اور مسلم حکمرانوں کے حالات نسبۃً تفصیل سے ملتے ہیں (۲۵)

اخبار الزمان

علامہ مسعودی

یہ بھی علامہ مسعودی کی ایک ضخیم کتاب ہے، جس کا ایک ٹکڑا مصر میں چھپ
ہے، اس میں بحر ہند کے جزائر کے بارے میں خاص طور سے معلومات درج ہیں
علامہ مسعودی کی وفات ۳۴۶ھ میں ہوئی۔

عجائب الہند

بزرگ بن شہریار۔ (چوتھی صدی ہجری)

بزرگ بن شہریار ناخدا رامہرمزی چوتھی صدی میں سیراف، ہندوستان
اور چین کے درمیان سمندر کے تجارتی اسفار کیا کرتا تھا، اور جہاز رانی میں بڑا
ماہر تھا، اس نے عجائب الہند کے نام سے ایک نہایت قیمتی کتاب لکھی ہے جس میں
ہندوستان کے ساحلی مقامات کی مذہبی، سیاسی، تمدنی، اقتصادی اور ثقافتی
باتیں درج کی ہیں، لیڈن میں یہ کتاب چھپی ہے، اور اب بغداد سے اس کا عکسی
فوٹو بھی شائع ہو گیا ہے۔ (۲۶)

مسالک الممالک

اصطخری (موجود ۳۴۰ھ)

ابو اسحاق ابراہیم بن محمد فارسی، اصطخری کے نام سے مشہور ہے، اصطخر

ایران کا ایک شہر ہے، بہت بڑا سیاح تھا۔ ایشیا کے اکثر ملکوں کی سیاحت
کی تھی، جغرافیہ میں اس کی دو کتابیں ہیں، کتاب الاقالیم اور کتاب مسالک
الممالک پہلی کتاب سنہ ۱۸۳۹ء میں گوتھا میں، اور دوسری سنہ ۱۸۷۰ء میں لیڈن میں
چھپی ہے، اس میں عرب، ایران، ماوراء النہر، کابلستان، سندھ اور ہندوستان
کا ذکر ہے، بحر ہند کا، جس کو وہ بحر فارس کہتا ہے، مفصل ذکر کیا ہے، وہ ہندوستان
سنہ ۳۴۰ھ مطابق سنہ ۹۵۱ء میں آیا تھا، وہ اپنے ہم عصر سیاح ابن حوقل سے یہیں
ملا تھا، اس کا کارنامہ صرف ملکوں کا حال لکھنا نہیں ہے، بلکہ دنیا کا نقشہ
تیار کرنا ہے، جس میں سندھ کا بھی نقشہ ہے، لیکن مطبوعہ کتاب میں نقشہ
نہیں ہے (۲۸)

الاعلاق النفیسہ

ابن رستہ (موجود) سنہ ۲۹۰ھ

ابن رستہ کا نام احمد بن عمر بن رستہ اور کنیت ابو علی ہے، اگرچہ یہ
ہندوستان نہیں آیا تھا، مگر اپنی مشہور کتاب الاعلاق النفیسہ میں اس نے
زمین کے عجائب اور ملکوں کے حالات کے سلسلے میں ہندوستان کے جغرافیائی حالات
و خصوصیات، بعض تعزیری و ملکی قوانین اور یہاں کی تہذیب و معاشرت اور
قربانی کے طریقوں کا ذکر کیا ہے، اس کتاب کے کئی حصے ہیں مگر ایک ہی حصہ اب تک
شائع ہوا ہے، یہ کتاب ابن رستہ نے سنہ ۲۹۰ھ میں لکھی ہے۔ (۲۹)

کتاب البلدان

ابن فقیہ ہمدانی (تیسری صدی)

ابو عبد اللہ احمد بن محمد بن اسحاق بن ابراہیم ہمدانی، ابن فقیہ کے نام سے
معروف ہے، تیسری صدی کے آخر کا انشاپرداز اور جغرافیہ داں ہے، ابن ندیم
اور یاقوت حموی نے اس کی کتاب کا ذکر کیا ہے، لیکن صرف کتاب البلدان

ہم تک پہونچی ہے اس میں مشرق ومغرب کے ملکوں کی طرح ہندوستان کے دریاؤں اور شہروں کے متعلق معلومات درج ہیں، یہ کتاب ۱۸۰۵ء میں مکتبہ جغرافیہ سے شائع ہوئی ہے (۳۰)

معجم البلدان

یاقوت حموی المتوفی ۶۲۶ھ

ابو عبداللہ یاقوت بن عبداللہ حموی رومی، بغداد میں پیدا ہوئے، انھوں نے نہایت ضخیم کتاب معجم البلدان لکھی، اس میں انھوں نے بلاد وامصار کے نام اور حالات بہت تفصیل سے ذکر کئے ہیں، اسی ذیل میں ہندوستان کے بھی شہروں اور مقامات کا جغرافیہ بیان کرکے وہاں کے علماء وفضلاء کے حالات قلمبند کئے ہیں، یاقوت کا انتقال ۶۲۶ھ میں ہوا (۳۱)

تقویم البلدان

عمادالدین بن اسمٰعیل صاحب حماۃ المتوفی ۷۳۲ھ

یہ الملک المویہ عمادالدین بن اسماعیل بن الافضل علی الایوبی کی جغرافیہ میں مفصل کتاب ہے۔ یہ صاحب حماۃ کے لقب سے معروف ہیں، انھوں نے جغرافیہ وغیرہ کی بہت سی کتابیں سامنے رکھ کر نہایت محققانہ طریقے سے اس کتاب کو مرتب کیا ہے، اور سلسلے میں ناموں، جگہوں اور طول وعرض کے باب میں جو غلطیاں راہ پاگئی تھیں، ان کی اصلاح ودرستگی کا اہتمام بلیغ کیا مصنف کی وفات ۷۳۲ھ میں ہوئی ہے۔ (۳۲)

الفہرست

علامہ ابن ندیم (بعد از ۳۸۵ھ)

علامہ ابن ندیم کا نام محمد بن اسحاق بن ابی یعقوب الندیم ہے، کنیت ابوالفرج یا ابوالفتح ہے، لیکن ابن ندیم کے نام سے مشہور ہیں، وطن بغداد تھا،

یہ کتابوں کی نقل و ترتیب اور تصحیح (وراق) کا کام کرتے تھے، انھوں نے اپنی مشہور تصنیف الفہرست ۳۷۷ھ ۹۸۷ء میں لکھی، اس میں دنیا کی مختلف قوموں کی زبانوں اور ان کے رسم الخط کا ذکر اور اسلامی علوم و فنون کے جملہ شعبوں کے متعلق تصنیفات اور مصنفین کے مختصر حالات اور ان تمام کتابوں کے بھی نام اور ان کے متعلق معلومات تحریر کیے ہیں، جو ان کے زمانہ تک کسی علم و فن میں عربی میں لکھی یا دوسری زبانوں سے ترجمہ ہوئی تھیں، ہندوستانی علوم و فنون کی کتابوں اور یہاں کے مذاہب کا بھی اس میں تذکرہ ہے، بلکہ یہ کتاب ہندوستانی مذاہب کے بارے میں نہایت قدیم اور مستند ماخذ ہے، ابن ندیم کی وفات کا صحیح سن معلوم نہ ہو سکا تاہم ۳۸۵ھ مطابق ۹۹۵ء کے بعد ان کا انتقال ہوا ہے (۲۳)

کتاب الذخائر والتحف

قاضی رشید بن زبیر (پانچویں صدی)

قاضی رشید بن زبیر پانچویں صدی ہجری کے ممتاز عالم اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی تصانیف میں ایک کتاب "کتاب الذخائر والتحف" بھی ہے جسے ڈاکٹر حمید اللہ پیرس اور ڈاکٹر صلاح الدین المنجد نے ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔

قاضی رشید نے مذکورہ کتاب میں مسلمان حکمرانوں اور دوسرے ممالک کے حکمرانوں کے تعلقات وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے، چونکہ ان کا تعلق مختلف مسلمان حکمرانوں سے رہا ہے، اس لئے مسلمان حکمرانوں اور دوسرے غیر مسلم ممالک مثلاً ہندوستان اور چین وغیرہ کے حکمرانوں کے تعلقات اور ان کے ہدایا و تحائف کے تبادلہ بعض ایسی تفصیلات اس میں موجود ہیں، جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتیں۔

قاضی رشید کی تاریخ ولادت اور وفات باوجود تلاش جستجو کے نہیں مل سکی۔ لیکن کتاب کے بعض مندرجات قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب ۴۶۲ھ کے

تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ (۳۴)

کتاب الہند

علامہ بیرونی المتوفی ۴۴۰ھ

علامہ ابو ریحان بیرونی ہندوستانی علوم و فنون پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے عقلیاتی علوم و فنون اور ریاضی و فلکیات پر بڑی جامع اور پر از معلومات کتاب لکھی، جس میں عما نیہاں کی بہت سی باتیں آگئی ہیں۔ یہ کتاب مرتب ہوئی۔ یورپ سے چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ بیرونی نے قانون مسعودی اور کتاب تحقیق ماللہند میں ہندوستان کے علوم و فنون کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں حیدرآباد میں چھپی ہیں۔ (۳۵)

مسالک الابصار فی ممالک الامصار

ابن فضل اللہ العمری المتوفی ۷۴۹ھ

مصنف کا نام احمد بن یحییٰ بن محمد کرمانی العمری ہے، شہاب الدین لقب ہے ابن فضل اللہ العمری کے نام سے معروف ہیں انھوں نے یہ کتاب بیس جلد وں میں لکھی ہے۔ کتاب دو قسموں پر مشتمل ہے۔ پہلی قسم میں زمین کا جغرافیہ بیان کیا ہے۔ اور دوسری قسم میں دنیا بھر کے باشندوں کا تذکرہ کیا ہے (۳۶)

احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم

علامہ مقدسی بشاری (چوتھی صدی ہجری)

علامہ مقدسی بشاری ایک عرب سیاح تھے۔ ان کا نام محمد بن احمد تھا۔ شمس الدین لقب۔ بیت المقدس کے رہنے والے تھے۔ اسی نسبت سے مقدسی کہلاتے ہیں مشرق و مغرب کے اکثر اسلامی ملکوں کا انھوں نے سیاحت کی تھی۔ ہندوستان بھی آئے تھے۔ علامہ مقدسی نے چوتھی صدی کے عالم اسلام پر احسن التقاسیم کے نام سے ۳۷۵ھ میں ایک نہایت عمدہ کتاب لکھی۔ جس میں سیر و سیاحت کے بعد

اہل اسلام کے حالات درج کئے ہیں۔ یہ کتاب لیڈن میں چھپ چکی ہے (۳۷)

یہ چند وہ کتابیں ہیں جو عرب و ہند تعلقات کی تاریخ میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، جن سے قاضی صاحب نے استفادہ کیا ہے۔ انکے علاوہ اور بھی بہت سی کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑی ہے، یہاں ہم قاضی صاحب کی ہدے کچھ اور کتابوں کی فہرست درج کرتے ہیں۔ جن سے قاضی صاحب نے اپنی تصنیفات میں فائدہ اٹھایا ہے، اور جن میں ہندوستان کے علماء ورجال کے حالات پائے جاتے ہیں۔ تاریخ بغداد خطیب بغدادی، کتاب الانساب علامہ سمعانی، تاریخ دمشق علامہ ابن عساکر، تاریخ جرجان سہمی، تاریخ اصفہان ابونعیم اصفہانی، اخبار الحکماء قفطی، طبقات الامم ابن ساعد اندلسی، اللباب فی تہذیب الانساب علامہ ابن اثیر جزری، شذرات الذہب ابن عماد حنبلی، دول الاسلام ذہبی، طبقات الشافعیۃ الکبریٰ سبکی، طبقات الفقہاء الشافعیہ ابواسحق شیرازی، الجواہر المضیۂ فی طبقات الحنفیہ قرشی، الدرالکامنہ ابن حجر، الضوء اللامع سخاوی، البدرالطالع شوکانی، خلاصۃ الاثر فضل اللہ محبی، الکواکب السائرہ صاحب النشر والروی علوی، یہ سب کتابیں چھپ چکی ہیں۔

انکے علاوہ عقد الجواہر والدرر فی اخبار القرن الحادی عشر محمد بن ابوبکر علوی صاحب المشروع الروی، الاثمار الجنیہ فی اسماء الحنفیہ ملا علی قاری، لطف السمر وقطف الثمر من تراجم اعیان الطبقۃ الاولیٰ من الحادی عشر نجم غزی، معجم المشائخ لسید مرتضیٰ زبیدی بلگرامی، التحفۃ البہیۃ فی طبقات الحنفیہ عبداللہ حجازی شرقاوی

قاضی صاحب ان آخرالذکر کتابوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

ان تمام کتابوں کے قلمی نسخے کتب خانہ شیخ الاسلام مدینہ منورہ میں محفوظ ہیں، اور راقم نے ان سب سے استفادہ کیا ہے (۳۸)

تاریخ نویسی میں کوئی خبر بغیر حوالہ کے مقبول نہیں، ادنیٰ سے ادنیٰ جزئی کیلئے

مستند حوالہ ضروری ہے اس کے لئے بڑی وسعتِ نگاہ اور عمیق مطالعہ کی ضرورت ہے، پھر ساتھ ہی انتہائی بصیرت اور دیدہ وری بھی لازم ہے کہ اس کے بغیر اس وادی میں قدم نہیں بڑھایا جا سکتا۔ قاضی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ان تمام خوبیوں سے نوازا تھا اس لئے اس راہ کو انھوں نے بڑے عمدہ طریقہ پر طے کیا۔

ایک بڑی اہم بات اس طرح کی کتابوں اور ان سے اخذ و استنباط میں یہ ہوتی ہے کہ ہندوستان کے متعلق معلومات کا سارا ذخیرہ عربی میں ہے، آپ پڑھ چکے ہیں کہ ہمارے ملک کی زبان میں اس موضوع پر کچھ نہ ہونے کے برابر لکھا گیا ہے جو کچھ ہے وہ عرب سیاحوں اور مورخوں نے لکھا ہے، ایک ملک، ایک خطہ جہاں کی زبان دوسری ہے، جہاں کی تہذیب الگ ہے، جہاں کے رسم و رواج جداگانہ ہیں، جہاں کی پیداوار اور مصنوعات علیحدہ ہیں، جہاں کے ناموں کی وضع کچھ اور ہے ان تمام چیزوں کو اہل عرب جب اپنے یہاں لیجاتے ہیں اور انھیں اپنی زبان اور اپنے محاوروں کے دائرے میں لاکر لکھتے ہیں تو ان کا نقشہ بدل جاتا ہے، اب انھیں ان کی اصل شکل و صورت میں پہچاننا مشکل کام ہوتا ہے، اس میں اگر دونوں زبانوں پر اور وہاں کی چیزوں پر گہری نظر اور صحیح گرفت نہ ہو تو مطلب کچھ کا کچھ ہو جائے گا، اہل علم حضرات جو مدارس میں قرآن و حدیث والی فصیح عربی پڑھے ہوئے ہیں اور انھیں بخوبی حل کر لیتے ہیں وہ ذرا ان کتابوں کی عربی عبارتیں پڑھیں، قدم قدم پر ایسا محسوس ہوگا جیسے فہم ٹھوکر کھا رہی ہو، آگے اندھیرا دکھائی دیگا، قاضی صاحب نے اپنی کتابوں میں بکثرت ایسی عبارتیں نقل کی ہیں، اور ان کے ترجمے سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی علیہ الرحمہ "عرب و ہند عہد رسالت میں" کے مقدمہ میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں اور بہت صحیح فرماتے ہیں کہ:

دوسری خصوصیتوں سے قطع نظر کتاب کی سب سے اہم خصوصیت اسکی بے شمار عربی عبارتیں ہیں جن کو معتبر اور مستند ماخذوں سے لیا گیا ہے، اور پھر ان عبارتوں کا نہایت سلیس اور شگفتہ ترجمہ کیا گیا ہے۔ فاضل مؤلف عربی زبان کے بہت اچھے ادیب ہیں اور ان کا یہ ذوق طبعی اور فطری ہے، اس لئے قدرتی طور پر بہت سی پیچیدہ اور اجنبی عبارتوں کا ترجمہ نہایت صاف اور بے تکلف کیا ہے۔

قاضی صاحب نے اپنے مقاصد اور دعاوی کے لئے عربی کے اشعار سے بھی بکثرت شہادت بہم پہونچائی ہے۔ قاضی صاحب نے اشعار کے ترجمے بھی کئے ہیں، یہ بھی ایک مشکل کام ہے، یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے۔

عرب و ہند کے تعلقات اور ہندی و سندھی رجال علم و فضل پر قاضی صاحب موصوف نے پوری ایک اکیڈمی کا کام کیا ہے اللہ تعالیٰ نے انھیں اس کام میں غیر معمولی کامیابی بخشی، پھر اللہ تعالیٰ نے قدر دانوں کی ایک جماعت بھی کھڑی کر دی چنانچہ سندھ کی ایک نیم سرکاری تنظیم فکر و نظر نے انھیں محسن سندھ کا خطاب دیا، قاضی صاحب نے بے لوث ہو کر علم کی خدمت کی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ دلوں میں قدر و منزلت کا جذبہ پیدا کر دیتے ہیں، خود خدمت کرنے والا ان خطابات و اعترافات سے بے نیاز ہوتا ہے، لیکن جو کسی وجہ سے ناواقف ہوتے ہیں، ان قدردانیوں کی بدولت انھیں بھی واقفیت اور احسان شناسی کی سعادت میں حصہ مل جاتا ہے۔

حواشی

ص ۱۵

(۱) قاعدہ بغدادی سے بخاری شریف تک ص ۲۲ (۲) حوالۂ سابق (۳) حوالۂ سابق (۴) خودنوشت آپ بیتی غیر مطبوعہ (۵) خلافت عباسیہ اور ہندوستان (۶) اکابر ہند کی عظمتِ رفتہ قاضی اطہر مبارکپوری ص ۱۵ (۷) حوالۂ سابق ص ۱۶ (۸) حوالۂ سابق

(۹) محترم سید محمد صدیق صاحب قادری، قاضی صاحب کے بہت بے تکلف دوستوں میں ہیں۔ بمبئی کے قیام کی ابتدا رہی میں ہی ان سے گہرے تعلقات قائم ہوئے، اور تادم آخر برقرار رہے، ان کا ایک تفصیلی مکتوب ماہنامہ انوار العلوم جہانا گنج مورخ اسلام نمبر میں شائع ہوا ہے۔ اور ان سے تعلقات کی داستان قاضی صاحب نے غیر مطبوعہ آپ بیتی "کاروان حیات" میں لکھی ہے۔ یہ آپ بیتی بھی مورخ اسلام نمبر میں شائع کر دی گئی ہے۔ (۱۰) وادر کر صاحب عربی و انگریزی کے بڑے عالم تھے، قاضی صاحب سے بہت اخلاص تھا (۱۱) کاروان حیات (غیر مطبوعہ آپ بیتی) (۱۲) ہندوستان عربوں کی نظر میں ج ۱ ص ۷۲ (۱۳) اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ص ۱۷ (۱۴)۔ (۱۵) عربوں کی حکومتیں ص ۲۴ - ۲۲ (۱۶) اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ص ۱۷ (۱۷) ہندوستان عربوں کی نظر میں ج ۱ ص ۱۱۲ عرب و ہند کے تعلقات ص ۹۰ (۱۸) اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ص ۱۸ (۱۹) عرب و ہند کے تعلقات ص ۲۲، ہندوستان عربوں کی نظر میں ج ۱ ص ۸ (۲۰) عرب و ہند کے تعلقات ص ۲۵ (۲۱) حوالہ سابق ص ۳۱ (۲۲) ہندوستان عربوں کی نظر میں ج ۱ ص ۵۶ (۲۳) اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ص ۱۹ (۲۴) عرب و ہند کے تعلقات ص ۳۶ (۲۵) اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ص ۱۹ (۲۶) حوالہ سابق (۲۷) حوالہ سابق ص ۲۰ (۲۸) عرب و ہند کے تعلقات ص ۲۸ (۲۹) ہندوستان عربوں کی نظر میں ص ۱۶۹/۱۷۰ (۳۰) حوالہ سابق ص ۱۵۰ (۳۱) کشف الظنون حاجی خلیفہ ص ۱۴۲۲ (۳۲) حوالہ سابق ص ۴۲۶ (۳۳) ہندوستان عربوں کی نظر میں ص ۱/۲ (۳۴) ہندوستان عربوں کی نظر میں ج ۲ ص ۹۴ (۳۵) اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ ص ۲۰ (۳۶) کشف الظنون ص ۱۹۶۲ (۳۷) کشف الظنون حاجی خلیفہ ص ۱۶ (۳۸) عرب و ہند کے تعلقات ص ۳۰ (۳۸) اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ ص ۲۲

مختلف ڈائریوں، خطوط اور اخبار کے تراشوں سے

ادارہ

آئینہ در آئینہ

قاضی صاحب کے کاغذات میں چھوٹی بڑی کاپیاں ہیں، لفافوں میں کاغذ کی بہت سی سیلپیں ان کے قلم کی لکھی ہوئی ہیں، ایک مجلد کاپی میں بہت سی معلومات ان کے بچپن کے ساتھی مولانا ساحر مبارکپوری کے قلم سے ہیں، اور بہت سے عربی اخبارات کے تراشے بھی احتیاط سے رکھے ہوئے ہیں۔

ان کی حیثیت نہ ڈائری کی ہے نہ روزنامچہ کی، مولانا ساحر کے قلم سے جتنا کچھ ہے وہ تمام کا تمام مختلف رسالوں اور اخباروں میں قاضی صاحب کی شخصیت یا ان کی کتابوں سے متعلق جو شائع ہو چکا ہے ان کی نقل ہے۔

ان اندراجات میں کسی طرح کی ترتیب نہیں ہے اور بغیر ترتیب زمانی کے ان کی افادیت بہت کم ہو جاتی ہے اور ذہنی انتشار کا باعث بھی، میرے پاس جب یہ کاغذات آئے تو میں نے سب سے پہلے صفحات کے نمبر ڈالے اور سال کتابت کی تعیین کر کے انکی مکمل فہرست بنائی اور ان پر نمبر شمار ڈالے، اس طرح میں تھوڑی بہت ان تحریروں میں ترتیب زمانی قائم کر سکا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فرصت کے اوقات میں قاضی صاحب بطور یادداشت کچھ باتیں لکھ لیتے تھے، ان کو اپنے اکابر سے عقیدت تھی، اپنے بارے میں یا اپنی کتابوں کے بارے میں ان کا ایک جملہ بھی اپنے لئے سرمایۂ سعادت سمجھتے تھے۔

اور ان کو موتیوں کی طرح چن لیتے تھے۔ اس طرح کی اگر ان کو کوئی تحریر مل جاتی تھی تو وہ چاہتے تھے کہ وہ محفوظ رہے اصل تحریر کی حفاظت کے ساتھ احتیاطاً اپنی یادداشت کی کاپیوں میں نقل بھی کر لیتے تھے، اکابر اہل علم علمی اداروں ممالک اسلامیہ کے سرکاری دفاتر سے جو خطوط آتے تھے یا عرب ملکوں سے شائع ہونے والے اخباروں اور رسالوں میں آپ کی کتابوں پر کوئی مضمون آتا تھا تو کبھی اسکو عربی میں لکھ لیتے تھے اور کبھی اس کو اُردو میں منتقل کر کے یادداشت میں درج کر لیتے تھے۔ اس طرح بیشمار خطوط اور تحریریں میرے سامنے ہیں، نہ سب کو سمیٹا جا سکتا ہے اور نہ بالکل چھوڑا جا سکتا ہے کیونکہ ان تحریروں سے قاضی صاحب کے فکر و فن پر روشنی پڑتی ہے اور ان کے علمی و تحقیقی مقام و رتبہ کی تعیین ہوتی ہے۔ اس لئے ان متفرق تحریروں کو ایکدم نظر انداز کرنا بہت بڑی غلطی ہوگی قاضی صاحب نہ شیخ طریقت تھے کہ ان کے گرد مریدوں کا کوئی حلقہ ہو جو ان کے کرامات و کمالات کا ہر محفل میں ذکر کرتا رہے، نہ کسی بڑے ادارہ کے سربراہ، مہتمم یا شیخ الحدیث کہ ان کے تلامذہ اور حلقہ بگوشوں کی فوج ظفر موج ان کے بعد ان کی شخصیت کے گرد ایک نور کا ہالہ بنا دے جس میں روشنی ہی روشنی ہو، معمولی معمولی باتوں اور کاموں کو اتنی اہمیت و عقیدت سے بیان کرے کہ اس سے اہم اور قیمتی نہ کوئی بات ہے نہ کام، قاضی صاحب کو شہرت کی فضاؤں میں پرواز کیلئے اس طرح کا کوئی شہپر جبرئیل حاصل نہ تھا ان کے علمی مقام کا تعارف خود ان کی کتابوں نے کرایا ہے اور آج اسلامی دنیا میں جو عزت و احترام اور مقام و مرتبہ حاصل ہے اس میں نہ کسی پروپگنڈے کا کوئی دخل ہے نہ ذوق و غالب اور عرفی نظیری کی طرح کے قصائد مدحیہ کا، اس لئے قاضی صاحب کو اسی آئینہ میں دیکھنا چاہئے جو ہندوستان، پاکستان اور مصر و حجاز کے اہل علم و تحقیق نے ان کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد ہمارے سامنے

رکھ دیا ہے۔ اس یادداشت میں یہ آئینے موجود ہیں جن میں آپ قاضی صاحب کی شخصیت اور ان کے علمی مقام و مرتبہ کو صحیح خدوخال کے ساتھ دیکھ سکیں گے۔

اس یادداشت کا بہت مختصر سا حصہ ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔

——— اسیر ادروی

معارف القرآن۔

مولانا عبد الماجد دریا آبادی صدق جدید مورخہ ۹ر نومبر ۱۹۵۹ء میں لکھتے ہیں:

قاضی اطہر مبارکپوری صاحب ایک کہنہ مشق صاحب قلم ہیں بمبئی کے اخبارات و جرائد میں ان کے قلم سے دینی، اسلامی، اصلاحی عنوانات پر مضامین سالہا سال سے نکل رہے ہیں یہ ان کے اس قسم کے مختصر مضامین کا مجموعہ ہے اور ہر مضمون کا تعلق قرآن مجید کی کسی نہ کسی آیت سے ہے جلی عنوانات، توحید، رسالت، کتاب اور دینی زندگی نظر آئے۔ ... حالات حاضرہ پر اشارے مصنف جابجا کرتے گئے ہیں جو اکثر صورتوں میں مفید بھی ہیں اور پر لطف بھی مثلاً ص ۴۳ و ۴۵ پارہ ۲۱ رکوع ۱۲ کے حوالے سے "واذا قیل لہم اتبعوا ما انزل اللہ" کی تشریح اور اسکے ضمن میں آج کل کے اجار سنگ تراشی، بت سازی رقاصی وغیرہ کی تحریک پر تبصرہ۔

حج کے بعد

اخبار الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن ۱۶ر ستمبر ۱۹۵۷ء نے رسالہ "حج کے بعد" پر تبصرہ کیا:

"قاضی اطہر صاحب مبارکپوری صاحب قلم اور عالم فاضل ہونے کے ساتھ

اہل دل بھی ہیں، انھوں نے اس کتاب میں دل کے ٹکڑے نکال کر رکھ دیے ہیں، تبصرہ نگار نے کتاب کا پورا تعارف کرایا ہے۔ اس طرح مسلم گزٹ ویکلی (سورت)، نے ۲۵ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کی اشاعت ایک تفصیلی تبصرہ شائع کیا ہے اس چھوٹی سی کتاب کو اہم ترین کتاب بتایا ہے، ایک تیسرے اخبار سیاست جدید کانپور نے ۔ار اکتوبر ۱۹۵۸ء میں حج کے بعد کا مفصل تعارف کرایا ہے اور بتایا ہے کہ حضرت قاضی صاحب نے اپنے سفر حج کے موقعہ پر مظفری جہاز پر جو تقریر کی تھیں انھیں کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔

رجال السند والهند

مولانا عبد الماجد دریا آبادی ۔ صدق جدید ، ۱۲ر جون ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں لکھتے ہیں :

۔ قاضی اطہر مبارکپوری کا نام پڑھے لکھوں کیلئے نامانوس نہیں ، مدتوں سے وہ اسلامی، تاریخی، ملی عنوانات پر برابر لکھ رہے ہیں اور اب تک مقالات و مضامین کا پورا انبار لگا چکے ہیں۔

مزید لکھتے ہیں کہ :

زیر نظر کتاب ساتویں صدی ہجری تک کے ہندوستانی پاکستانی مشاہیر اسلام کا تذکرہ ہے، ایسے کاملین کا تذکرہ کوئی تین سو سے اوپر کا اس جلد میں آ گیا ہے .... سب سے آخر میں ایک لمبی فہرست ماخذوں کی ہے جس میں حدیث رجال، تاریخ، جغرافیہ، ادب تذکرہ صوفیا وغیرہ کتابوں کے نام ہیں۔

اپنے تبصرے کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں :

قاضی صاحب نے یہ کتاب تیار کر کے ہندوستانی اہل قلم کا سر دنیائے اسلام میں بلند کیا ہے اس پروہ اور ان کے پبلشر دونوں قابل مبارکباد ہیں کاش قاضی صاحب کو اتنی فرصت و اطمینان نصیب ہو کہ کتاب کی آئندہ جلد وں کو چودہویں صدی ہجری تک کے مشاہیر تک لکھ سکیں۔

روزنامہ۔ الندوۃ۔ مکہ مکرمہ نے ، ۲ ر شعبان ۱۳۸۰ھ کی ایک اشاعت میں تین کالموں میں نظرۃ فی کتاب رجال السند والہند کے عنوان سے کتاب کی اہمیت وافادیت پر ایک مفصل مضمون شائع کیا ، اس نے لکھا کہ :

جب اسلام کی روشنی ہندوستان میں پہونچی اور غزوات و فتوحات کا سلسلہ چلا اس وقت اسلام کی بہت سی جلیل القدر شخصیتیں ہند و سندھ میں پہونچیں جن میں صحابہ کرام اور تابعین کی مقدس جماعتیں تھیں اس عہد زریں کی مفصل تاریخ اکابر رجال کے مستند تراجم ہندوستان کے ایک عظیم المرتبت محقق عالم اور اسلامی مورخ القاضی ابوالمعالی اطہر مبارکپوری نے لکھے ہیں ان کی کتاب رجال السند الہند کے نام سے شائع ہوگئی ہے اس کتاب کو دیکھ کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ مصنف نے اسکی تالیف میں کتنی مشقت و محنت اٹھائی ہوگی تاریخ و سیر کی کتنی کتابوں کو کھنگالا ہوگا اور بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہوگا ؟ غزوات کی تحقیق اور کمیاب تراجم کی تلاش و جستجو اور ان کو پوری تحقیق کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

سعودیہ عربیہ کے مشہور جغرافیہ داں جن کو ان کے علم و فن پر فیصل ایوارڈ دیا گیا ہے۔ میں نے ان کو اپنی چند تصانیف ہدیتاً ارسال کیں تو اس کے جواب میں موصوف نے راقم کو مندرجہ ذیل خط لکھا :

حضرۃ صاحب الفضیلۃ العالم الجلیل المحقق المورخ الاسلامی الہندی القاضی ابوالمعالی اطہر المبارکفوری۔

امابعد : میں حیرت زدہ ہوں کہ ایسے جلیل القدر عالم کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں جنھوں نے بغیر ذاتی تعارف کے اتنی عظیم ترین تصنیفات مجھے ہدیہ میں بھیجی ہیں سوائے اس کے کہ میرا اور ان کا ذہنی و فکری تعارف ہے میرے خیال میں اس دنیا میں اس سے بہتر کوئی دوسرا تعارف ہو بھی نہیں سکتا۔

محترمی ! آپ کا بہترین تحفہ رجال السند والہند، الی القرن السابع، العرب والہند فی عہد الرسالۃ، العقد الثمین تاریخ اسماء الثقات لابن شاہین کی شکل میں مجھے ملا، خدا آپ کو اس کا جزا خیر دے میں سوائے شکریہ ادا کرنے کے اور کیا کر سکتا ہوں دل یہ چاہتا ہے کہ میں اپنی تصانیف بھی آپ کی خدمت میں پیش کروں لیکن پریشانی یہ ہے کہ میرا موضوع جغرافیہ جزیرۃ العرب ہے اور اسی موضوع پر میری کتابیں ہیں معلوم نہیں آپ کے ذوق کے مطابق کون سی کتاب ہوگی اسلئے، میں کتابوں کے نام اس کے ساتھ بھیج رہا ہوں ان میں سے جو کتابیں آپ منتخب فرمائیں میں انھیں اولین فرصت میں آپ کو بھیجکر خوشی حاصل کرسکوں۔ آخر میں آپ کی عنایت کا ایکبار اور شکریہ ادا کرتا ہوں۔

حمد الجاسر، شارع حمد الجاسر حی الورود السلیمانیہ

الریاض المملکۃ السعودیۃ

رجال السند والہند پر عرب و مصر کے علماء کی متعدد رائیں دستیاب ہوئیں جن کو اختصار کے ساتھ یہاں درج کرتا ہوں :

شیخ عبدالمنعم النمر عضو بعثۃ الازہر و موتمر اسلامی نے تحریر فرمایا:

ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی و دینی ہستیوں کے حالات میں بہت بڑی کوشش ہے اور ہر پڑھنے والا اسکی قدر کرے گا۔

شیخ عبدالعالی عقبادی عضو بعثۃ الازہر و موتمر اسلامی لکھتے ہیں:

یہ کتاب اپنے موضوع پر واحد اور نادر ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں کس قدر اہم ہستیاں گذری ہیں اور انھوں نے کیا کیا اسلامی خدمت کی ہے

استاد احمد سباعی کی مصنف تاریخ مکہ نے تحریر فرمایا:

مصنف نے جیسے جیسے نادر و نایاب ماخذوں اور کتابوں سے ہندوستان کے قدیم علماء کے حالات جمع کئے ہیں جن کا ملنا دشوار ہے، اللہ تعالےٰ اس جیسی کتاب سے ہمیں محروم نہ کرے

علامہ شیخ سلمان دمشقی استاد جامع بنی اُمیہ دمشق لکھتے ہیں:

اس میں شک نہیں کہ مؤلف نے اس حق کو ادا کر دیا ہے جو ہمارے اوپر علماء امت کی طرف سے واجب تھا۔

حضرت مولانا ابوالوفا افغانی رئیس لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد نے [illegible] فرمایا:

مصنف نے یہ کتاب لکھ کر ایک ایسے گوشے کو پُر کیا ہے جو اب تک خالی تھا، کسی نے بھی اسکی طرف توجہ نہیں کی تھی۔

رسالہ معارف دارالمصنفین اعظم گڈھ نے جولائی ۱۹۵۰ء میں کتاب کے بارے [illegible] لکھا۔

فاضل مصنف نے بڑی محنت اور جستجو کے بعد یہ کتاب لکھی ہے اور سیکڑوں مخزنوں کو کھنگال کر معلومات کے جواہر کو جمع کیا ہے اس کتاب کی اشاعت

ہے ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی تاریخی اسلامی طبقات وتراجم میں
ایک بیش قیمت کتاب کا اضافہ ہوا ہے جسکے لئے فاضل مؤلف
مبارکباد کے مستحق ہیں۔

حضرت مولانا محمد شفیع صاحب عثمانی مفتی اعظم پاکستان اپنے خط میں تحریر
فرماتے ہیں جس پر ۹ رشوال ۱۳۸۷ھ کی تاریخ درج ہے۔

آپ کا علمی تحفہ خود ہی اس کا مقتضی تھا کہ اس پر کچھ لکھا جائے مگر
فرصت کم ہونے کی وجہ سے تاخیر ہوئی، حقیقت تو یہ ہے کہ مجھ جیسے کم علم
کو اس کا حق بھی نہیں کہ اس عظیم تصنیف پر کوئی تقریظی کلمات لکھے مگر
اظہار مسرت اور تعمیل حکم کے لئے چند کلمات لکھدیے جو اسی خط کے ساتھ
مرسل ہیں
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۹ رشوال ۱۳۸۷ھ

حضرت مفتی صاحب نے تحریر فرمایا:

حضرت العلامہ قاضی ابو المعالی اطہر مبارکپوری کی تصنیف "رجال
السند والهند" کے مطالعہ سے مستفید اور محظوظ ہوا اللہ تعالیٰ موصوف
کو جزائے خیر عطا فرمائے آپ نے ہندوسندھ کے مایۂ فخر و امتیاز مگر تاریخی
مظلوم گروہ کے تراجم اور تذکرہ کو ایک منظم صورت میں پیش کرکے ایک
بڑے خلا کو پورا فرمایا، آپ کی تحریر کے مطابق یہ بالکل صحیح ہے کہ
ان ملکوں میں صوفیائے کرام اور اولیاء کے تذکرے اور سوانح حیات اور
ان کے ملفوظات تو بڑی سرگرمی اور استیعاب کے ساتھ جمع کیے گئے
یہاں تک کہ بہت سے سوانح و تواریخ میں غلو اور مبالغے تک نوبت پہنچی
مگر علماء، مفسرین، محدثین، فقہاء، اُدباء، فاسفروں کے حالات و

مقالات محفوظ رکھنے کا کوئی اہتمام ان ملکوں کی تاریخ لکھنے والوں نے نہیں کیا۔

حضرت مفتی صاحب نے آخر میں تحریر فرمایا:

اللہ تعالیٰ مصنف علام کو توفیق مزید عطا فرمائیں کہ اپنے وعدے کے مطابق ان رجال کا تذکرہ بھی جمع فرمادیں جو اگرچہ ہندوستان میں پیدا نہیں ہوئے مگر ان کا طویل قیام، استفادہ یا افادہ کی صورت میں ان ملکوں میں رہا ہے اللہ تعالیٰ ناشر کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے جس نے اس مفید علمی سرمایہ کو بصورت طباعت شائع کرکے علمی دنیا کے لئے نہایت اہم تحفہ مہیا فرمادیا۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
دارالعلوم کراچی ۱۵ اپریل ۱۹۵۹ء

"علی و حسین"

مولانا عبدالماجد دریا آبادی "صدق جدید" لکھنؤ کے ۵ اگست ۱۹۶۰ء کے شمارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"محمود عباسی صاحب کی معلوم و معروف کتاب "خلافت معاویہ و یزید" کی تردید میں اہلسنت کے عالموں نے بھی بہت کچھ لکھا، ان سب میں زیادہ جامع و سنجیدہ مضمون وہ تھا جو قاضی اطہر صاحب مبارکپوری کے قلم سے روزنامہ "انقلاب" بمبئی میں قسط وار مدتوں نکلتا رہا اور بعد میں نظر ثانی کرکے کتابی صورت میں شائع ہوا

مشہور شاعر و مدیر رسالہ فاران کراچی ماہر القادری ستمبر ۱۹۶۰ء کے شمارے میں لکھتے ہیں:

محمود عباسی کی ناپسندیدہ کتاب ۔ خلافت معاویہ و یزید ۔ نے
مسلمانوں میں جو فتنہ کھڑا کر دیا ہے اس کی رد میں اب تک جتنی کتابیں
آئی ہیں ان میں مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کی یہ کتاب ۔ علی و حسین ۔
سب سے زیادہ مدلل اور جامع ہے اور باوقار ہے ۔

مولانا سید احمد اکبر آبادی صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ برہان دہلی
کے ستمبر کے شمارے میں تحریر فرماتے ہیں :

محمود عباسی کی کتاب ۔ خلافت معاویہ و یزید ۔ نے اگرچہ ہند و پاک کے
مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا کیا لیکن اس کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا
بعض اہل قلم حضرات اور سنجیدہ حضرات نے کتاب مذکور کے مضامین کا
علمی اور سنجیدہ رد لکھا اور اس کی وجہ سے اصل مبحث کے متعلق اردو
میں اچھا خاصا مواد جمع ہو گیا انہیں گنتی کے چند مصنفوں میں قاضی اطہر
ہیں ، موصوف نے اس کتاب میں جو ان کے مسلسل مضامین کا مجموعہ ہے
پہلے ان تدلیسات و تلبیسات کا پردہ چاک کیا ہے جو عباسی صاحب نے
اختیار کی تھیں اسکے بعد حضرت علی اور انکے دور خلافت پر امام حسین کی
شخصیت اور مقام و موقف پر ، پھر یزید کی ولیعہدی اور اس کے عہد امارت
کے واقعات پر علمی سنجیدگی اور کمال احتیاط سے روشنی ڈالی ہے اور
دوسرے ماخذ کے علاوہ حافظ ابن تیمیہ ، ابن خلدون ، اور ابن کثیر
وغیرہم کے ان ماخذوں سے بھی استدلال کیا ہے جن پر عباسی صاحب
کو بڑا بھروسہ تھا ، اسکے بعد متفرق مگر مفید مباحث مثلاً حدیث
ملک عضوض ۔ قاتل حسین عمر بن سعد ، حدیث غزوہ مدینہ اور یزید پر
گفتگو کی ہے ، غرض کہ عباسی صاحب کی کتاب کے رد میں ابتک جو
کتابیں ہماری نظر سے گذری ہیں زیر تبصرہ کتاب جامع اور معتدل

نقطۂ نظر اور سنجیدہ تحقیق و زبان کی حامل ہونے کے اعتبار سے
سب سے بہتر ہے۔

مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مدینہ بجنور کی اشاعت ستمبر ۱۹۶۰ء کے ایک شمارے
میں اظہار رائے کرتے ہیں متنازع فیہ کتاب کے ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے
قاضی صاحب کی کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عنایت فرمائے جناب قاضی اطہر مبارکپوری کو
کہ انھوں نے جذبات سے بالاتر ہو کر "خلافت معاویہ ویزید" کا جواب
جیسا چاہیے تھا، لکھا اور خوب لکھا۔ موصوف نے عباسی کی ترجمہ، ماخذ
اور اقتباسات کی غلطیوں، عبارت کی کتر بیونت کو اس عمدگی کیساتھ
اجاگر کیا ہے کہ دوسرے کے بس کا کام نہیں تھا، قاضی صاحب نے یہاں تک
کیا کہ اصل ماخذ اور نام نہاد ماخذ کو بھی بتلادیا، کتاب کے شروع کے
۲۲ صفحات بطور مقدمہ جواہرات سے تولنے کے قابل ہیں جن میں موصوف
نے کچھ تاریخی اصول بیان کئے ہیں، میرے نزدیک قاضی صاحب کی
عجوبہ روزگار کتاب کو بار بار شائع ہونا چاہیے، کیا ہمدردان علم و
حسین اس طرف توجہ کریں گے؟

ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں۔

یہ خبر باعث مسرت ہے کہ اس کتاب کا عربی ترجمہ بھی جامع ازہر قاہرہ کے
مجمع البحوث الاسلامیہ کی طرف سے الاستاذ عبدالعزیز عزت نے شروع
کردیا ہے، موصوف اس سے پہلے راقم کی کتاب "عرب و ہند عہد رسالت میں"
کا عربی ترجمہ اسی ادارہ کی طرف سے مکمل کرچکے ہیں اور ماہ دو ماہ میں طبع ہو کر
شائع ہونے والی ہے، اب یہ دوسری کتاب ترجمہ ہورہی ہے اللہ تعالیٰ نے

ان کتابوں کو شرف مقبولیت سے نوازے۔ راقم نے جس بے سروسامانی میں یہ کتابیں لکھی ہیں یہ اسی کا کرم ہے کہ نہ صرف ہند و پاکستان میں بلکہ عرب ممالک میں مقبول ہو رہی ہیں۔ اور عربی زبان میں ترجمے شائع ہو رہے ہیں۔ ہماری تیسری کتاب العقد الثمین جو عربی میں ہے اس کے بارے میں جدہ کے مجلہ المنہل میں اعلان آچکا ہے۔ یہ کتاب بھی الحمد للہ چھپ رہی ہے دو تین ماہ میں چھپ کر شائع ہو جائیگی۔ (انقلاب بمبئی)

حکومت کو مبارکباد۔

حکومت کویت کی جانب سے ایک مکتوب ہوائی ڈاک سے موصول ہوا جس میں یہ خوشخبری تھی کہ ہم اپنی سرکاری مطبوعات ڈاک سے آپ کے پاس روانہ کر رہے ہیں اس کو قبول فرما کر شکریہ قبول فرمائیں۔

الحمد للہ کہ علمی ہدیہ ۲ جنوری ۱۹۶۱ء کی ڈاک سے چار نہایت ہی نادر و نایاب اور قیمتی کتابوں کی شکل میں حکومت کویت کی طرف سے موصول ہو گیا حکومت نے پچھلے سال سے ایک ادارہ "دائرۃ المطبوعات والنشر حکومت کویت" کے نام سے قائم کیا ہے جس کیلئے ایک عالی شان پریس خریدا ہے اور مسلمانوں کی نادر و نایاب کتابوں کو اعلیٰ پیمانہ پر چھاپنے کا کام ہو رہا ہے۔ ایک سال گذرتے گذرتے اس ادارہ کی طرف سے کئی نہایت اہم کتابیں شائع ہوئی ہیں جو اعلیٰ قسم کے سفید ولایتی آرٹ پیپر پر نہایت جلی اور روشن عربی ٹائپ میں ہیں، عالم اسلام کے مستند علماء نے ان کی تحقیق کی ہے ان کتابوں کا مختصر تعارف یہ ہے۔

۱۔ کتاب الذخائر والتحف۔ بڑے سائز کے ۳۰۸ صفحات پر مشتمل ہے جو چھٹی صدی ہجری کے ایک زبردست مورخ و ادیب قاضی رشید بن زبیر مصری متوفی ۵۶۳ھ کی تصنیف ہے اس کا صرف ایک قلمی نسخہ ترکی کے

کتب خانے میں تھا، اسی سے یہ کتاب چھاپی گئی ہے۔

۲۔ کتاب الاضداد فی اللغۃ۔ ۴۱۶ صفحات کی ہے اور مشہور امام لغت ابوبکر محمد بن قاسم انباری بغدادی متوفی ۳۲۸ھ کی تصنیف ہے۔

۳۔ کتاب المصون فی الادب۔ یہ کتاب ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے اس کے مصنف امام ادب ابو احمد عسکری متوفی ۳۸۲ھ ہیں جو ابو ہلال عسکری کے استاد ہیں، دنیا میں اس کتاب کے صرف دو قلمی نسخے موجود تھے۔

۴۔ کتاب العبر فی خبر من غبر۔ ۵۰۰ صفحات میں ہے یہ کتاب مشہور محدث امام شمس الدین ذہبی متوفی ۷۴۸ھ کی تصنیف ہے اور پہلی صدی ہجری سے لیکر امام ذہبی تک کے خاص خاص واقعات ورجال کے حالات پر مشتمل ہے اس کا ایک قلمی نسخہ حلب کے کتب خانے میں تھا اس کی مدد سے یہ کتاب چھاپی گئی ہے۔

خلیج عرب کی اس حکومت کا یہ علمی نشاط اس کے حکمراں حضرت سمو الشیخ عبداللہ السالم آل صباح کی علمی ودینی دلچسپی کا نتیجہ ہے موصوف اپنے اس عظیم کارنامہ کے باعث پورے عالم اسلام کی طرف سے مبارکباد اور دعا کے مستحق ہیں جو لوگ اس ادارہ کے مسئول ہیں ان کی سلیقہ مندی اور حسن انتظامی قابل داد ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے دو ملاقاتیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے دو مرتبہ ملاقات کا موقع ملا، ایک مرتبہ اگست ۱۹۴۶ء میں لاہور میں جب کہ مولانا کانگریس کے صدر تھے اور میں اخبار زمزم لاہور میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ زمزم کمپنی کی فرمائش پر منتخب التفاسیر جمع کر رہا تھا، مولانا بحیثیت صدر کانگریس لاہور آئے ہوئے تھے

تیلیس ہوٹل میں شاہانہ ٹھاٹھ کے ساتھ قیام پذیر تھے " غبار خاطر " کا مسودہ ساتھ لائے تھے اس کی طباعت کا مرحلہ مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر کے ذریعہ طے فرمارہے تھے، نیز ترجمان القرآن جلد ثانی کی طباعت کا معاملہ بھی زمزم کمپنی لاہور سے طے کر رہے تھے اسی سلسلہ میں جب مولانا کو معلوم ہوا کہ میں قرآن کریم کی خدمت کے سلسلہ میں کام کر رہا ہوں تو دعا دیتے ہوئے فرمایا اللہ جزائے خیر دے آمین ۔

دوسری ملاقات ۱۹۵۲ء میں بمبئی کے تاج محل ہوٹل میں ہوئی تھی جسے صرف ملاقات کہا جا سکتا ہے ان کی زبان سے مسلمانان ہند کے بارے میں بڑے دلگیر الفاظ سننے میں آئے تھے ۔

تصاویر رسول کے مسئلہ پر

اگست ۱۹۶۳ء کے اخیر میں ہم نے ایک مصری کتاب بحاب وضاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر کے بارے میں احتجاج کیا تھا جس کا فوری جواب محترم استاد احمد فرید یمانی صاحب نے دیا اور مرکز ثقافی کے مدیر نے ایک بیان دیا نیز عزیز محترم شیخ عبدالعزیز عزت مبعوث الازہر نے مختصر بیان دیا اور مرکز ثقافی بمبئی کے مدیر نے ایک تحریر کے ذریعہ قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دی مگر محترم الاستاد ممدوح عزت قنصل جمہوریہ عربیہ متحدہ بمبئی نے بڑی سنجیدگی سے ہمارے اعتراضات کو سرکاری سطح پر علمار مصر کے پاس بھیجا اور ان سے اس بارے میں جواب طلب فرمایا ، ہم نے وعدہ کیا تھا کہ جو جواب علمار ازہر کی طرف سے آئیگا ہم اسے شائع کرکے اگر ہمارے نزدیک قابل قبول ہوگا تو ٹھیک ہے ورنہ پھر اس جواب کے جواب میں دوبارہ لکھیں گے تاکہ استاد ممدوح عزت پھر اسے علمار ازہر کے پاس روانہ کرکے ان سے جواب حاصل فرمائیں ۔

حضرت الاستاد مولانا الحاج محمد اسماعیل صاحب سنبھلی شیخ الحدیث جامعہ عربیہ آنند گجرات اپنے ایک گرامی نامہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ماہنامہ البلاغ بمبئی مجریہ مارچ ۱۹۶۳ء میں اتفاق سے آپ کا ایک مضمون بعنوان تصاویر رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی بحث پر علماء جامعہ ازہر قاہرہ کا جواب اور ہمارا جواب الجواب نظر نواز ہوا۔

درحقیقت آپ نے اس مضمون میں حق ادا کیا ہے، رسول اللہ کی تصاویر کے بارے میں آپ کا احتجاج کرنا اور پھر علماء ازہر کی ایک خاص علمی مجلس کا منعقد ہونا اور اس میں اس مسئلہ پر بحث و مباحثہ اور پھر ان کی رکیک توجیہات پر آپ نے جو مواخذات فرمائے ہیں وہ نہایت فاضلانہ اور جرأتمندانہ ہیں فی الواقع آپ نے تمام علماء کی طرف سے ایک بہت بڑا فرض ادا کیا ہے جس کیلئے ہر طرح قابل مبارکباد ہیں اور آپ کی یہ سعی لائق تحسین ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے مراتب عالیہ میں ترقی عطا فرمائے خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان میں اور ہماری جماعت میں بھی ایسے علماء موجود ہیں جو بلا خوف و خطر اظہار حق کے لئے سربکف میدان میں ہیں اور مجھ کو تو سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ آج جب کہ ہمارے مراکز کتابوں کے تراجم میں لگے ہوئے ہیں مگر اس قسم کی چیزوں کی طرف قطعاً توجہ نہیں کرتے آپ نے بروقت اس اہم چیزوں کی طرف توجہ فرمائی ہے۔

جزاک اللہ خیرا الجزاء فی الدین والآخرہ

دائرہ ثقافت اسلامیہ کی تجویز (۱۹۶۵ء)

حضرت العلامہ محدث العصر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی زید مجدہم اور مولانا عبداللطیف نعمانی مہتمم جامعہ مفتاح العلوم مئو، اور میں، ہم تینوں بہت دنوں سے

ایک ایسے ادارے کے قیام کو سوچ رہے تھے جو قدما کی خالص علمی اور دینی کتابیں زمانہ کی ضرورت کے مطابق شائع کرے اور صدر اسلام کے علمار و محدثین اور فقہار رحمہم اللہ کی اہم غیر مطبوعہ کتابوں کو تعلیق و تحشیہ کے ساتھ آج کی علمی و تحقیقی اور دینی دنیا کے سامنے پیش کرے، ساتھ ہی موجودہ دور کے جدید تقاضوں کی روشنی میں اسلام کے ان فقہی اور جزئی مسائل کے بارے میں تحقیق کرے جن کے حل کرنے کی شدید ضرورت ہے، اس سلسلہ میں ایک وسیع پروگرام کے تحت نہ صرف ہندوستان و پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام کے مستند علمار دین سے استصواب کرکے ایسے مسائل کی تحقیق و تنقیح کرے، نیز دینی اور علمی ضرورت کے ماتحت تالیف و ترجمہ اور تصنیف کا کام بھی اس ادارے سے ہو اور اس کے تمام علمی و دینی کاموں کو حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کی سرپرستی حاصل ہو، اس سلسلہ میں ہم تینوں کی ایک غیر رسمی نشست مفتاح العلوم مئو میں ۱۵ر مئی ۱۹۶۵ء کو ہو چکی تھی، دوسری نشست کیلئے ۲۷/۲۸ رمئی مقرر ہوئی، اس دوران مولانا عبد الباری قاسمی مہتمم جامعہ احیار العلوم مبارکپور کی زیر صدارت قصبہ گھوسی کے ایک مدرسہ کے سالانہ جلسہ کی تاریخ ۲۷، ۲۸ رمئی مقرر ہوئی، ہم دونوں مبارکپور سے مئو گئے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی اور مولانا عبد اللطیف صاحب نعمانی ادری تشریف لے گئے ہیں۔ اسلئے ہم دونوں شدید گرمی اور دھوپ میں ایک بجے ادری پہونچے۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ کی دوسری میٹنگ ادری کے ایک مدرسہ میں ہوئی جس میں ہم چاروں کے علاوہ مولانا اسیر ادروی اور مولانا محمد شمیم قاسمی بھی شریک ہوئے دوسری نشست بہت کامیاب رہی، دائرہ کے قیام کی صورت، کتابوں کی اشاعت اور دوسرے امور و معاملات پر کھل کر بحث ہوئی اور بعض ابتدائی کام شروع کرنے کی تجویز ہوئی۔[1]

---

[1] مگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا — ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال ست۔ (اسیر ادروی)
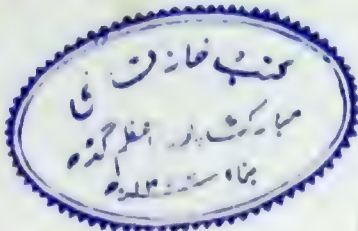
...وت الازہر کا خط

السید الفاضل استاذی الکبیر !

میں ایک مدت کے بعد یہ خط لکھ رہا ہوں جس کا مجھے افسوس ہے میں اس
... فروری میں کراچی پہونچا اور کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات میں
...ر کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ مصر سے یہ خبر آئی ہے کہ آپ کی کتاب۔ عرب
...ند عہد رسالت میں ،، کا جو ترجمہ میں نے العرب والھند فی عھد
...سالۃ کے نام سے کیا تھا وہ اگلے مہینوں میں طبع ہو کر منظر عام پر آ رہی ہے، کئی
...وں کی کتابت روک کر اس کی طباعت ہو رہی ہے چونکہ یہ کتاب اپنے موضوع
...اعتبار سے بہت اہم اور نادر ہے اسلئے اس نے خود اپنی راہ بنالی ہے اسے
...ی ادارہ ،، دار الکاتب العربی ،، شائع کر رہا ہے، یہ علامہ سید سلیمان ندوی
...تاب۔ عربوں کی جہاز رانی ،، کا ترجمہ الملاحۃ العربیہ کے نام سے مکمل کر چکا
اسی طرح علامہ شبلی نعمانی کی کتاب ،، اسلام کی عالمگیر خدمات ،، کا ترجمہ بھی
...ا ہوں۔ آپ کی کتاب ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ،، کا ترجمہ الحکومات
...بیہ فی الھند کے نام سے قریب قریب ختم کر چکا ہوں اس میں شک نہیں
...کتاب دنیائے تاریخ میں ایک علمی و تحقیقی انقلاب برپا کرے گی اور عربی
...خانوں کے لئے ایک بیش بہا تحفہ ہو گی نوعیت کے لحاظ سے یہ آپ کی پہلی
...ال علمی خدمت ہو گی ـــــ والسلام الاستاذ عبدالعزیز عزت کراچی

...وب مدینہ

عزیزم مولوی خالد کمال سلمہٗ مدینہ منورہ سے اپنے ۹ جون ۱۹۶۶ء کے خط
...لکھتے ہیں۔ جمعرات کو ،، البلاد ،، میں یہ خبر آئی کہ :

. ہندوستان کے ممتاز ترین مصنف شیخ القاضی اطہر مبارکپوری
کے اعزاز میں ہندوستانی سفارتخانہ نے ایک پر تکلف عشائیہ
کا انتظام کیا

جریدہ ,, المنہل ،، (جدہ) میں آپ کا من الذا رجیل الی النخیل، والا مضمون نظر آیا یہ پہلی قسط جمادی الثانی ۱۳۸۵ھ میں ہے جو ص ۴۲۹ سے ۴۰۷ تک ہے آخر میں تصریح کر دی ہے کہ یہ مضمون ,, ثقافۃ الھند ،، سے لیا گیا ہے دوسری قسط رجب کے شمارے میں ص ۴۷۰ سے ص ۴۷۵ تک ہے تیسری قسط ذی الحج کے شمارے میں ص ۱۰۵۶ سے ص ۱۰۵۹ تک ہے آخر میں ,, یتبع ،، ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی اور شائع کرے گا دوسری قسط کے آخر میں لکھا ہے کہ یہ المنہل کا شعار ہے کہ اس قسم کے تاریخی دستاویز تلاش کر کے چھاپتا ہے اور مولفین کے علمی کارناموں سے ناظرین کو مستفید کرتا ہے۔

اگر مدیر مجلہ عبد القدوس انصاری آپ سے ملنے کے لئے بے قرار تھے تو بیجا نہ تھا شیخ ابن باز شیخ عبودی اور شیخ عمر افریقی ہر ایک کو آپ کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع کم ملنے کا شکوہ ہے ہاں پرسوں مکتبہ شیخ الاسلام میں مکہ مکرمہ کے شیخ سید علوی مالکی کے لڑکے سے ملاقات ہو گئی انھوں نے بتایا کہ تمہارے والد سے مکہ مکرمہ میں پھر ملاقات نہ ہو سکی، والد صاحب پوچھتے تھے کہ وہ کہاں رہتے ہیں ملنے کی کوشش کرو، اس وقت حج کی بھیڑ بھاڑ تھی، اطمینان ہوا تو انتظار کیا، والد صاحب نے کچھ اپنی کتابیں اور کچھ دوسروں کی ہدیہ کرنے کیلئے جمع کر رکھی تھیں مگر قاضی صاحب ایسا گم ہوئے کہ پھر نہیں ملے، ہندوستانی یا پاکستانی طلبہ اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔

مختلف زبانوں میں ترجمے

حضرۃ الاستاذ سید عبدالعزیز عزت رکن مجمع البحوث الاسلامیہ قاہرہ کے ایک تازہ مکتوب گرامی سے یہ خوشخبری ملی کہ راقم کی کتاب جسے استاد موصوف نے العرب والهند فی عهد الرسالة کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا ہے آئندہ ماہ دارالکاتب العربی قاہرہ سے چھپ کر شائع ہو رہی ہے نیز مجمع البحوث الاسلامیہ کی طرف سے راقم کی دوسری تصنیف ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں۔ کا ترجمہ بھی استاد موصوف نے اپریل میں شروع کر دیا ہے دول العرب فی الهند۔ کے نام سے مجمع البحوث الاسلامیہ قاہرہ کی طرف سے شائع ہوگی۔

راقم کی کتاب ۔ عرب و ہند عہد رسالت میں ۔ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی مقبولیت دی جب اس کے کچھ اجزا رسالہ معارف اعظم گڈھ میں شائع ہوئے تو ان کا عربی ترجمہ حکومت ہند کے سرکاری رسالہ ۔ ثقافة الهند ۔ میں شائع ہوا جن کو سعودی عرب کے مشہور و قدیم علمی و ادبی مجلہ المنہل جدہ نے کئی قسطوں میں شائع کیا نیز اس کا گجراتی ترجمہ رسالہ ۔ القلم ۔ میں چھپا پھر حکومت مصر کی جانب سے مجمع البحوث الاسلامیہ قاہرہ کے زیر اہتمام محترم الاستاد عبدالعزیز عزت نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا جو عنقریب شائع ہوگا اور اب میسور یونیورسٹی کے عربی فارسی کے لکچرار صدر شعبہ تحقیق کے اردو کے مشرف عالیجناب میر محمود حسن صاحب ایم اے نے اس کتاب کے انگریزی ترجمہ کی اجازت طلب فرمائی ہے۔

شبلی سے اطہر تک

کئی ماہ ہوئے ، راقم کی ایک تصنیف ۔ العقد الثمین فی فتوح الهند

دمن ورد فیہما من الصحابۃ والتابعین " عربی زبان میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے جس میں عہد خلافت راشدہ اور عہد خلافت امویہ تک کی ہندوستان میں اسلامی فتوحات کا ذکر ہے اور اس دور میں یہاں پر جو صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین تشریف لائے ان کے حالات درج ہیں، اسی کتاب پر حضرت مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے اپنے اخبار صدق جدید لکھنؤ ۱۸ / اپریل ۱۹۶۸ء میں حسب ذیل تبصرہ فرمایا :

اعظم گڈھ کا نام مولانا شبلی سے زندہ ہے اور شبلی کا خاص کارنامہ تاریخ امت و مشاہیر امت ہے، شبلی کی خلافت سلیمان ندوی کو ملی اور سلیمان ندوی نے علاوہ دوسری خدمتوں کے ایک بڑی خدمت ہند و عرب کی مشترک تاریخ لکھ کر انجام دی اب اسی سلسلہ کی ایک شاخ کی آبیاری اسی ضلع کے قاضی اطہر مبارکپوری کر رہے ہیں اور ہند کے ابتدائی عربی عہد کی تاریخ سند و استناد کے ساتھ دلچسپ و شگفتہ انداز میں عربی میں مرتب کرتے جا رہے ہیں، ان کی رجال السند والہند اور ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، وغیرہ اسی زنجیر کی طلائی کڑیاں ہیں اور اس کی ایک تازہ ترین قسط یہ پیش نظر کتاب ہے کتاب کا موضوع نام سے ظاہر ہے یعنی فتح ہند کے سلسلہ میں صحابہ اور تابعین ہندوستان میں غازی یا داعی کی حیثیت سے آئے ان کا تذکرہ اور سندھ، مکران، گجرات کے صوبوں اور بھڑوچ تھانہ وغیرہ مختلف شہروں کی خاصی تاریخ آگئی ہے۔ ارکان حکومت کی نظر سے اگر یہ سطریں گذر سکیں تو عرض ہے کہ یہ کتابیں ہند و عرب دونوں حکومتوں کی سرپرستی و قدردانی کی مستحق ہیں۔

مولانا عبدالعزیز میمن راجکوٹی سے ملاقات

حاجی ابراہیم موتی والا (بمبئی) کے وطن دھوراجی (کاٹھیاواڑ) ان کے اصرار کی وجہ سے جانا پڑا وہ تاریخ ادب کا بہت ستھرا ذوق رکھتے ہیں بچپن سے دارالمصنفین کی مطبوعات اور رسالہ معارف کے خریدار ہیں ان کا ذاتی کتب خانہ عربی فارسی اردو، گجراتی اور انگریزی کتابوں سے بھرا ہوا ہے جس سے چار روزہ قیام میں استفادہ کا موقعہ ملا، انھوں نے اپنے ایک دوست سے راقم کا تعارف کراتے ہوئے کہا:

کراچی میں مولانا عبدالعزیز میمن راجکوٹی نے ایک علمی مجلس میں فرمایا کہ اس ہندوستان میں عربی کے دو عالم اور مصنف قابل ذکر ہیں ان میں ایک مولانا قاضی اطہر مبارکپوری ہیں:

مولانا عبدالعزیز میمن راجکوٹی سابق پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور ابوالعلاء اِل وما الیہ کے مصنف ابو علی مالی بغدادی کی کتاب الامالی کے حاشی و شارح اور عربی زبان وادب کے عالمی شہرت کے مالک عالم ہونے کی وجہ سے عرب ممالک اور مستشرقین یورپ تک میں علمی و تحقیقی شہرت کے مالک ہیں پاکستان کے سرکاری ادارہ تحقیقات علمیہ کے صدر ہیں۔

میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔ مجھے ایک دن معلوم ہوا کہ صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ سینڈہرسٹ روڈ بمبئی میں آج شام کو عربی شاعری اور فارسی زبان کے موضوع پر مولانا موصوف ایک مجلس مذاکرہ میں گفتگو کریں گے میں دیر سے پہونچا۔ وہاں لیکچروں پروفیسروں اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور مولانا اپنے خاص انداز میں باتیں کر رہے تھے، جگہ نہ ہونے کی وجہ سے میں ایک کونے میں میز ہی پر بیٹھ گیا۔ مجھے تنہا دیکھ کر انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل

جناب شہاب الدین دسنوی صاحب بھی میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور جب مجلس مذاکرہ ختم ہوئی تو دسنوی صاحب نے مولانا موصوف سے میرا تعارف کرایا، مولانا نام سنتے ہی لپٹ گئے اور نہایت شفقت اور ہمت افزائی کے انداز میں فرمایا کہ ارے بھائی! میں نے آپ کی کتاب رجال السند والہند اور مقالہ دولت ماہانیہ سنداں پڑھا ہے ماشاء اللہ خوب داد دی ہے اور بڑا کام کیا ہے پھر اس کے بعد ہاتھ پکڑے ہوئے باتیں کرتے رہے آگے پیچھے جدید تعلیم یافتہ ادبار و محققین مولانا سے گفتگو کرنا چاہتے تھے مگر مولانا کی دلچسپی نے ان کو دوسری طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں دی، چلتے چلاتے کہا کہ میں آنند صاحب واشنگ افیسر کے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں آپ وہاں ضرور آئیے اس کے بعد تین دنوں تک مولانا وہاں رہے اور میں برابر آتا جاتا رہا۔

علی گڈھ کے سیمینار میں۔

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی اسٹوڈنٹس یونین کے زیر اہتمام ۱۴/۱۵/۱۶/ مارچ ۱۹۶۹ء کو "اسلام اور دور جدید کے تقاضے" کے موضوع پر کل ہند ایک اہم سیمینار ہوا جس میں شرکت کی دعوت پہ علی گڈھ جانا ہوا، یونین کے دعوتنامہ کے علاوہ مولانا محمد تقی امینی ناظم دینیات اور ڈاکٹر ممتاز احمد خاں شروانی لیکچرار فارسی اور دوسرے پرخلوص احباب کا اصرار بھی تھا کہ اس موقعہ پر ضرور آؤں مجھے سیمینار کے موضوع سے متعلق کوئی مقالہ تیار کرنا چاہئے تھا مگر ان دنوں امام ابو الفیض قاسمی مکی کی کتاب "جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول" کی تعلیق و تصحیح اور مقابلہ میں بے حد مصروف تھا نیز اخبار اور رسالہ کی مصروفیات کے علاوہ بعض دوسرے علمی کاموں میں مصروف تھا اس لئے کوئی مقالہ تیار نہ کر سکا اور خیال ہوا کہ اگر مقالہ ہی پڑھنا ضروری ہوا تو وہیں جاکر وقت کے وقت تیار کر لوں گا، مگر علی گڈھ پہنچنے پر

ذمہ داران نے مجھ سے کہا کہ میں "ہندوستان میں اسلام کی آمد" پر تقریر کروں چونکہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ میرا پسندیدہ موضوع رہا ہے اور اس پر میری متعدد کتابیں عربی اور اردو میں نکل چکی ہیں اس لئے اس پر تیاری کا کوئی سوال ہی نہیں تھا اور ۱۶ / مارچ کو سہ پہر میں یونین ہال میں پروگرام کے مطابق یہ تقریر ہوئی جو ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ ضبط کر لی گئی بعد میں اسی تقریر کو صاف کر کے مقالہ کی صورت دی گئی، یہ تقریر الحمدللہ بے حد مقبول ہوئی حاضرین نے حیرت و استعجاب کے ساتھ سنا، ان کے تاثرات کو دیکھ کر بہت زیادہ اطمینان ہوا کہ جدید طبقہ کے فضلا و محققین کی اس بھری محفل میں قدیم طبقہ کی ترجمانی بڑی پُروقار رہی اور اندازہ ہوا کہ علم و تحقیق، تاریخ و تنقید اور تحریر و تقریر کے میدان میں بھی یہ طبقہ اگر آئے تو کسی سے پیچھے نہ رہے بلکہ اسے اپنی ٹھوس استعداد اور وسعت مطالعہ سے علم و تحقیق کی بزم میں اقرار و اعتراف کی جگہ مل سکتی ہے۔

قیام کا انتظام سیمنار کی طرف سے تھا مگر ہم چند ہم ذوق مولانا محمد تقی امینی صاحب کے یہاں ٹھہرے، مولانا امینی صاحب کے حسن اخلاق ان کے علمی و دینی ذوق کی وجہ سے یہ مجلس بہت باغ و بہار رہی وہ اپنی ذات سے انجمن تھے، مولانا سعید احمد اکبر آبادی قدیم و جدید کے مجمع البحرین ہیں ان کی شگفتہ مزاجی اور علمی مجلس بڑی معلوماتی اور پرخلوص ہوتی ہے ان سے خوب خوب ملاقاتیں رہیں بڑی شفقت سے پیش آتے تھے نیز دوسرے بہت سے اساتذہ سے ملاقات و تعارف کا موقعہ ملا اور مسلم یونیورسٹی کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔

راقم نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے لئے اپنی عربی تصانیف ہدیہ کی تھیں جس کے جواب میں امین عام جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ شیخ محمد بن ناصر العبودی کا مکتوب گرامی ۲ / ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ کا لکھا ہوا موصول ہوا۔ موصوف نے

تحریر فرمایا کہ!

آپ کے مکتوب گرامی کے ساتھ آپ کا ارسال کردہ علمی تحفہ موصول ہوا جس کیلئے ہم شکر گذار ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید علمی و تحقیقی کاموں کی توفیق عطا فرمائے ہماری دلی تمنا ہے کہ آپ سے مدینہ منورہ میں تفصیلی ملاقات ہو خدا ہماری تمنا کو پورا کرے۔ والسلام

آج شیخ عمر بن محمد الفلاتی مساعد الامین العام للجامعۃ الاسلامیہ و مدیر دارالحدیث مدینہ منورہ کا مکتوب گرامی موصول ہوا، موصوف نے تحریر فرمایا۔

آپ کا مکرمت نامہ اور اس کے ساتھ آپ کی بے مثال تصنیف العقد الثمین۔ موصول ہوئی۔ میں نے اسے بہت غور سے پڑھا اس کے مقدمہ کو دیکھا اس کے بعض مباحث کا مطالعہ کیا اور جب اس کے ماخذ و مراجع پر نظر ڈالی تو میں حیرت زدہ رہ گیا اسکے بعض عنوانات پر جو نادر معلومات آپ نے فراہم کی ہیں حق یہ ہے کہ دوسروں کے بس کی بات نہیں، آج ملت اسلامیہ کو اسی طرح کی تحقیقی کتابوں کی ضرورت ہے لیکن اس دشوار گذار راہ پر چلنے والے بہت کم لوگ ہیں ہماری خدا سے دعا ہے کہ خدا آپ کو صحت و سلامتی سے رکھے تاکہ ملت اسلامیہ آپ کے علمی و تحقیقی کارناموں سے زیادہ سے زیادہ مستفیض ہو سکے۔

مشہور عرب صحافی مجلۃ المنہل جدہ کے مدیر محترم الشیخ عبدالقدوس انصاری کا ایک حوصلہ افزا مکتوب گرامی موصول ہوا موصوف تحریر فرماتے ہیں:

آپ کا بیش قیمت ہدیہ العقد الثمین پاکر بیحد خوشی ہوئی آپکی یہ تصنیف بے مثال ہے اس نے تاریخ اسلام کے ایک بہت بڑے خلا کو پُر کر دیا ہے میں نے کتاب ہاتھ میں لیتے ہی ابتدا سے انتہا تک حرفاً حرفاً پڑھ ڈالی مجھے ایسی اہم اور نادر معلومات حاصل ہوئیں جو بڑی بڑی کتابوں سے بھی شاید نہ حاصل ہوتیں یہی نہیں بلکہ میں نے اس سے بہت سے اقتباسات نوٹ کر لیے ہیں جو اسی سال کے دوسرے شمارے میں انشاء اللہ آئیں گے قارئین المنہل کے لیئے یہ ایک لاجواب تحفہ ہوگا، خدا آپ کو تادیر امن و عافیت سے رکھے ۔ (۱۰ ارجون ۱۹۶۹ء)

مولانا سعید احمد اکبرآبادی - برہان ، دہلی اگست ۱۹۶۹ء کے شمارے میں العقد الثمین پر اظہار رائے فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں :

فاضل مصنف برصغیر ہند و پاک کے نامور محقق ، عالم اور مصنف ہیں انکی تحقیقات کا موضوع خاص ہندوستان سے اسلام کا تعلق رہے چنانچہ ابتک اس سلسلہ میں متعدد کتابیں عربی اور اردو میں ان کے قلم سے نکل کر ارباب علم و نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں زیر تبصرہ کتاب بھی اسی زنجیر طلائی کی ایک کڑی ہے ، اس میں موصوف نے بڑی تفصیل و تحقیق سے بتایا ہے کہ ہندوستان سے عربوں کا تعلق کب ہوا اور دونوں ملکوں پر اس تعلق کے اثرات کیا پڑے عہد نبوت ، عہد خلافت راشدہ اور پھر عہد بنو امیہ میں اس تعلق کی نوعیت کیا رہی ؟ فتوحات یا تجارت و تبلیغ و اشاعت اسلام کی نیت سے ہندوستان میں صحابہ ، تابعین میں سے کون کون سے

بزرگ تشریف لائے، اور ان کی وجہ سے اس ملک کی تہذیب و ثقافت اور مذہب وسیاست میں کیا انقلاب ہوا، زبان بڑی شستہ اور رواں ہے، آخر میں مضامین و ماخذ کی الگ الگ فہرستیں ہیں غرضکہ بڑی ہی دلچسپ معلومات افزا اور بصیرت افروز ہے فجزاہ اللہ احسن الجزاءِ ہندوستان اور عرب کی تاریخ کا کوئی طالبِ علم اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

رسالہ معارف دار المصنفین اعظم گڈھ کے مدیر نے دسمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں اس طرح کتاب کا تعارف کرایا ہے، مدیر محترم لکھتے ہیں:

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے عرب و ہند خصوصاً ان کے ابتدائی اسلامی عہد کے تعلقات پر عربی اُردو میں کئی کتابیں لکھ دی ہیں یہ عربی کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے اس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم خلفاء راشدین اور بنی اُمیہ کے زمانہ میں دونوں ملکوں کے تعلقات اور خلافت راشدہ اور اموی دور میں ہندوستان کی سرحدوں اور بعض علاقوں میں مسلمانوں کی فتوحات کا تذکرہ اور غزوات وفتوحات یا دعوت وتبلیغ وغیرہ کی غرض سے یہاں آنے والے صحابہ تابعین و تبع تابعین کے تراجم قلمبند کئے گئے ہیں اور آخر کے ایک باب میں اسی زمانہ کے مشہور ہندوستانی علماء و محدثین کا اجمالی تذکرہ بھی ہے۔

اس کتاب سے مسلمانوں کے ہندوستان پر ابتدائی حملہ اور قبضہ کی روداد، قرن اول اور قرن ثانی کے ان مجاہدین اُمراء عساکر حکام اور والیان ریاست کے جو یہاں آئے اور مختلف مناصب پر فائز ہوئے یا داعیوں اور معلموں یا جن کا کسی نوع کا بھی یہاں سے

تعلق رہا ہے کے حالات وغیرہ معلوم ہوتے ہیں، یہ کتاب عرب وہند
کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے زبان
وبیان دلکش اور سلیس ہے۔

دنیائے اسلام کے مشہور محقق عالم جامع امام محمد کے شیخ الحدیث عبدالفتاح
ابو غدہ کی خدمت میں رفیق عزیز ڈاکٹر مصطفےٰ الاعظمی کے ذریعہ بعض کتابیں ہدیۃً
پیش کی تھیں موصوف نے اس تقریب سے مجھے گرامی نامہ تحریر فرمایا:

آپ کا بیش قیمت ہدیہ رجال السند والہند اور العقد الثمین
کی صورت میں موصول ہوا جس کے لیے بیش از بیش شکریہ، میں اس
دشوار طلب مرحلے کو کامیابی سے طے کرنے پر دلی مبارکباد پیش کرتا
ہوں یہ دونوں کتابیں انشاء اللہ آپ کے لیے دائمی اجر وثواب کا
ذریعہ ہوں گی انشاء اللہ عنقریب آپ کے وطن میں حاضری کے
وقت آپ سے ملاقات ہوگی۔

تعلیمی وتبلیغی سرگرمیاں عہد سلف میں

مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے اپنے اخبار صدق جدید لکھنؤ کی اشاعت
مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۷۰ء میں اپنی مختصر سی کتاب تعلیمی وتبلیغی سرگرمیاں عہد سلف
میں۔ پر دو سطروں میں اظہار خیال فرمایا:

اس دعویٰ کا ثبوت کہ عہد سلف میں مسلمانوں کے مدرسے، مسجدیں
بازار سارے ہی مقامات تبلیغ وتعلیم کے میدان ہوتے تھے، مصنف
کی وسعت نظر اور وسیع معلومات ہر صفحہ سے نمایاں۔

رسالہ دارالعلوم دیوبند جون ۱۹۷۰ء کے شمارے میں انظر شاہ کشمیری لکھتے ہیں:

"اسلام کے ان مبارک ادوار کی ایک علمی تاریخ جس عہد کی وجہ سے اسلام اور مسلمان دونوں عالم انسانیت کے ممتاز مذہب اور افراد تھے دنیا کو علم و فضل دانش و آگاہی سے واقف کرنے میں انھوں نے جو عظیم کارنامے انجام دیئے اور جن کی تفصیل اب کتابوں کی زینت اور تاریخ کا ایک حسرت انگیز باب ہے اسی تفصیل کو "دریا بکوزہ" کیا گیا ہے عجب نہیں کہ یہ داستانیں آج بھی آسودۂ منزل کاروان کیلئے گرمیٔ رفتار کا ذریعہ بن سکیں لکھنے والے قلم نے تو اس کلدستہ کو اسی نیت سے آراستہ کیا ہے مختصر ہونے کے باوجود منضبط انضباط میں بانکپن اس مجموعہ کی خصوصیت ہے۔

ضیاء الدین اصلاحی مدیر معارف جون ۱۹۷۰ء کے شمارے میں اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

زیر نظر کتاب میں حدیث و سیر، طبقات و رجال اور تاریخ کی کتابوں سے ابتدائی چند صدیوں کے مسلمانوں کے علمی و تعلیمی انہماک، دعوتی و تبلیغی سرگرمی کے واقعات ذکر کرکے دکھایا گیا ہے کہ اس عہد میں مسجدوں اور گھروں کے علاوہ بازاروں راستوں اور ان تمام مجالس و محافل میں بھی جو مادی کاروبار کے لئے مخصوص سمجھی جاتی ہیں درس و تدریس اور افادہ و استفادہ کا سلسلہ جاری رہتا تھا، یہ سب تحریریں البلاغ بمبئی میں شائع ہوئی تھیں انکو کتابی صورت میں شائع کرکے ناشر نے ایک مفید دینی و تبلیغی خدمت انجام دی ہے۔

اسلامی ہند کی عظمت رفتہ

مولانا عبد الماجد دریا آبادی صدق جدید لکھنؤ کی ۲ر جنوری ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"قاضی اطہر مبارکپوری مدیر ماہنامہ البلاغ، بمبئی ملک کے ایک معروف و مستند اہل علم ہیں جنھیں ان کے افادات کے لحاظ سے بے اختیار نذر ان کہدینے کو جی چاہتا ہے، دنیائے عرب میں بھی وہ متعارف ہو چکے ہیں، اور اُردو میں ان کے مقالات و تصانیف کا ذخیرہ اب خاصا ضخیم ہو چکا ہے۔ پیش نظر کتاب ان کے آٹھ مقالوں کا مجموعہ ہے اور ہر مقالہ ہندوستان کی قدیم تاریخ سے تعلق رکھنے والا اور اپنے موضوع پر فاضلانہ بحث کرنے والا قدیم فاتحین ہند اور قدیم ہندی علماء، فضلاء اور عربی، ہندی سیاسی، ثقافتی تعلقات ان سب موضوعوں پر اس کتاب کے اندر اچھے خاصے تاریخی معلومات مل جائیں گے۔

العقد الثمین کے بارے میں

البلاغ بمبئی کی اشاعت جون جولائی ۱۹۷۰ء کے مشترکہ شمارے میں یہ ذکر ہے:

العقد الثمین فی فتوح الهند ومن ورد فیها من الصحابة والتابعین۔ پر بمبئی اور ملک کے معتمد ذمہ دار رسائل و مجلات میں اس پر شاندار تبصرے شائع ہوئے ... جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے رئیس محترم الشیخ عبداللہ بن باز نے علی حساب الجامعہ اس کے

مستند نسخے طلب فرمائے، مکتبہ مثنیٰ بغداد نے کئی سو نسخے طلب کئے حلب وشام میں دو سو سے زائد نسخے گئے، اور اب بغداد، حلب اور دیگر امصار کے کتب خانوں سے پورے عالم اسلام اور یورپ میں پہونچ رہے ہیں اور وہاں سے مزید کی شدید طلب ہو رہی ہے مگر اب کتاب ختم ہو گئی ہے۔

مخدومی و محترمی حضرت مولانا ابوالوفا افغانی رئیس لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد اپنے مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں۔

عزیزم قاضی اطہر مبارکپوری!

زمانہ ہوا کہ آپ کی خیریت سے ناواقف ہوں امید کہ آپ بعافیت ہوں گے۔ چند کتب کی ضرورت ہے مگر بازار میں موجود نہیں ہیں۔ کیا آپ ان میں سے کسی کا پتہ لگا سکتے ہیں؟ فوائد الفواد، تذکرہ علماء ہند، لطائف اشرفی، سیدالعارفین، گلزار ابرار یا اس کا ترجمہ، اذکار الابرار، خیر المجالس بتصحیح پروفیسر خلیق احمد ان کے سوا اولیاء ہند کے ملفوظات اصل یا تراجم ہوں اور میسر آسکتے ہوں آپ ان کی راہ پیدا کریں تو ممنون ہونگا۔ بمبئی میں علماء کا اجلاس ہو رہا ہے مجھے بھی دعوتنامہ ملا ہے لیکن میں اپنے امراض وضعف کی وجہ سے شریک نہ ہو سکوں گا۔

(ابوالوفاء، ۱۱ر ذی قعدہ ۱۳۹۲ھ)

اس خط کے جواب میں راقم نے مولانا موصوف کو لکھا:

مخدومی و محترمی! السلام علیکم۔ میں قبل رمضان وطن چلا گیا تھا تقریباً ۲½ ماہ کے بعد واپسی ہوئی۔ آپ کے مسلم پرسنل لا کنونشن

بمبئی میں شریک نہ ہونے پر افسوس ہے اللہ تعالیٰ آپ کو تا دیر
علوم اسلامیہ کی خدمت کیلئے زندہ رکھے ۔

گزارش یہ ہے کہ ۔ تذکرہ علماء ہند ۔ اب بالکل نایاب ہو چکی
ہے اس کا ایک نسخہ زائد میرے پاس ہے میں اسے آپ کی نذر کرتا ہوں
آجکل میں رجسٹری کے ذریعہ روانہ خدمت کر دوں گا قبول فرمائیے،
محمد حسن عوثیؒ ہندوی کی کتاب گلزار ابرار اب تک غیر مطبوع اور قلمی
ہے مجھے معلوم نہیں کہ اس کا اصل نسخہ کہاں ہے ؟ البتہ اس کا
اردو ترجمہ گلزار ابرار ایک زمانہ میں آگرہ میں چھپا تھا اپنے متعدد مقالات
میں اس سے مدد لی ہے مگر میرے پاس نہیں ہے ۔ لطائف اشرفی
(ملفوظات و حالات حضرت سید اشرف سمنانی کچھوچھوی) کا اصل
فارسی نسخہ زمانہ ہوا دہلی میں چھپا تھا اس کا ایک بوسیدہ نسخہ مبارکپور
میں ہے میں نے اسی سے استفادہ کیا ہے ، بوقت ضرورت آپ
کے لیے مطلوبہ چیزیں روانہ کر سکتا ہوں ، فوائد الفواد مطبوع
ہے مگر نایاب ہونے کے باوجود کہیں سے مل جائیگی ، سیر العارفین
بھی چھپ چکی ہے ، خیر المجالس کیلئے پروفیسر موصوف سے
مراجعت فرمائیں ، ان کتابوں کے علاوہ اولیاء ہند کے حالات و ملفوظات
میں میرے کتب خانے میں مشکوٰۃ النبوۃ ، خلاصۃ الاصفیاء ، کرامات
الاولیاء ، ملفوظات قادری ، معدن المعانی کے قلمی نسخے موجود ہیں ،
بحر ذخار ۔ کا نادر نسخہ سنا ہے کہ حیدرآباد میں ہے ، ایسے ہی ایک نسخہ
جونپور میں بھی ہے ، اسی طرح مرأۃ الابرار کا نادر نسخہ دارالمصنفین
اعظم گڈھ میں ہے ۔ والسلام ۔

پروفیسر ڈاکٹر ایم ایس خان کلکتہ سے تحریر فرماتے ہیں :

میں ایک خالص علمی سوال کر رہا ہوں امید کرتا ہوں کہ آپ جلد از جلد اس کا جواب دیکر عنداللہ ماجور ہوں گے ۔ اکتوبر سالِ رواں کے معارف (اعظم گڈھ) ص ۳۰۵ میں آپ کا موقر مضمون الھند فی العھد الاسلامی پڑھا اس کے صفحہ ۳۰۶ پر آپ نے لکھا ہے کہ ۔ اسی طرح فضل اللہ عمری کی کتاب مسالک الامصار میں تغلق دور کے بارے میں بہت قیمتی معلومات درج ہیں مگر اس کا یہ حصہ ابھی تک مخطوطہ ہے ۔ مجھے اس حصہ سے کافی دلچسپی ہے اور میں آپ سے گذارش کروں گا کہ آپ اس کا پورا حوالہ لکھ دیں اور اپنے ماخذ بھی، یہ معلومات آپ نے کہاں سے حاصل کئے ہیں کیا آپ اس مخطوطہ کی نشاندہی کر سکتے ہیں ؟ وہ کس لائبریری میں ہے ؟ ہو سکتا ہے کہ میں اُسے حاصل کر کے ایڈٹ کر دوں

(ایم، ایس خان ۸ر دسمبر ۱۹۷۰ء)

میں نے ان کو جواب میں لکھا :

مکرمی : مسالک الابصار فی ممالک الامصار فضل اللہ العمری کی کتاب کا پہلا حصہ مدت ہوئی نہایت آب و تاب سے مصر میں چھپ کر شائع ہوا ہے میں نے اس سے استفادہ کیا ہے باقی جلدیں دارالکتب المصریہ میں قلمی موجود ہیں ، ڈاکٹر خورشید دہلی ، نے وہاں سے وہ حصے جو ہندوستان سے متعلق تھے نقل کر کے اصل مع ترجمہ کے مرتب کیا ہے ندوۃ المصنفین دہلی اضواء جدیدۃ علی تاریخ الھند کے نام سے شائع ہوا ہے آپ وہاں سے یہ کتاب طلب کر کے ملاحظہ فرمائیں اس سلسلہ میں باقی معلومات اس کے مقدمہ میں مل جائیگی والسلام

——— قاضی اطہر مبارکپوری ۲۵ دسمبر ۱۹۷۰ء

صدق جدید لکھنؤ ۵ رمئی ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے بعنوان "شاہ نعمت اللہ ولی اور ان کے قصیدے" کے عنوان سے ایک آرٹیکل تحریر فرمایا ہے اس مختصر مضمون میں آپ نے تحریر فرمایا:

"صدق" میں جو ایک مراسلہ مع ادارتی تبصرہ کے ۱۲ر مارچ ۱۹۶۲ء کے پرچہ میں نکلا تھا الحمدللہ کہ اس پر ملک کے مشہور ماہر اسلامیات قاضی اطہر صاحب مبارکپوری کو توجہ ہوئی اور انھوں نے اپنا وقت نکال کر "صدق" کے لئے کئی سلپ لکھ بھیجیں، ان سے فاضل تر کوئی وکیل شاہ کو مل ہی نہیں سکتا تھا، لیکن شروع ہی میں قاضی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ جہاں تک ان کی جانب منسوب فارسی قصائد اور انکی پیشگوئیوں کا تعلق ہے ان کی لغویت ظاہر ہے اور ان کے کذب میں کوئی شبہ نہیں"

"صدق" و ناظرین صدق کی دلچسپی انھیں حدود تک محدود تھی، باقی ان کے حالات و کمالات جو کچھ بھی ہوں، ہوا کریں۔ قاضی صاحب نے نہ جانے کتنے کتب خانے کھنگال کر ان کا پتہ دو عربی تذکروں میں چلایا، وہ ہندوستان سے مکہ معظمہ غالباً ۱۰۱۲ھ میں چلے گئے، اور وہیں ۱۰۲۹ھ میں وفات پائی، تذکروں میں ذکر ان کی کرامات کا بھی ملتا ہے اور ایک بڑی کرامت یہ تھی کہ جس سے خفا ہوتے تھے اس پر بخار مسلط کر دیتے تھے (گویا بزرگی اگر تھی تو حضرت سید جیلانی اور حضرت خواجہ اجمیری کے رنگ کی نہیں بلکہ اس لائن کی جس کے لئے شیخ سندو مشہور ہوئے ہیں) اور وہ بیچارہ بخار میں پڑ جاتا، ایک اور کمال یہ تھا کہ جنات ان کے قابو میں تھے، اس قسم کی روایتوں کے سوا کسی قسم کے اور حالات و کمالات (پیروی رسول) کا کوئی پتہ قاضی صاحب کے بے ریسرچ

اسکار کو بھی نہ مل سکا، مقالہ میں ایک معاصر صوفی سے روحانی
کشتی کا بھی ذکر آیا ہے، قاضی صاحب کی مشقت ضائع ہوتے
دیکھ کر دل کو قلق ہوتا ہے، یہ انکی تحقیق کی ناقدری ہے، لیکن
اس کیلئے جگہ نکالنا بھی آسان نہیں ہے، یہ سلیس سردست محفوظ
رکھ لی ہیں اگر کچھ گنجائش نکل سکی تو درج کردی جائیں گی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مکتوب گرامی

رائے بریلی
۲۲ر جون ۱۹۷۰ء

فاضل گرامی محب سامی زیدت معالیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا اور تمام علمی و
تالیفی مشاغل جاری، نفع اللہ بکم وبعلومکم،
افسوس ہے کہ ۸ر جون کو جب میں بمبئی واپس ہوا تو آپ سے ملاقات نہ ہوسکی
صرف چند گھنٹے قیام رہا، ایک خاندانی حادثہ کی اطلاع پاکر بہ عجلت وہاں سے روانہ
ہوگیا، محمد بھائی کے یہاں آپ کا لفافہ ملا جس میں "انقلاب" کے دو تین تراشے
تھے، پڑھ کر بہت خوشی ہوئی یہ پہلی مرتبہ آپ کے قلم سے الہند فی العہد الاسلامی
کا ایک کثیر الاشاعت اخبار میں نام آیا اور اس کا مختصر مگر وقیع تعارف بھی ہوگیا
اس کا ایک فوری فائدہ تو یہ ہوا کہ لکھنؤ کے قومی آواز میں ادارتی صفحہ پر ایک
اچھا نوٹ اس کتاب کی اشاعت کے متعلق دیا گیا جو اول سے آخر تک آپ ہی
کے مضمون پر مبنی اور اس سے ماخوذ تھا اگرچہ بظاہر یہ ہوتا تھا کہ ان کو براہ راست
اس کتاب کی اشاعت کی اطلاع ملی ہے اور وہ اس کو ایک علمی خبر کے طور پر شائع
کررہے ہیں، اس سے بھی بہت سے اہل علم اور اہل ذوق کو کتاب کے مکمل

ہونے کی خبر مل گئی، یہ کتاب کا پہلا مطبوعہ نسخہ تھا جو میں نے آپ کی خدمت میں
پیش کیا تھا، میری اس وقت بھی نیت ہدیہ کی تھی، معلوم نہیں آپ کو کیوں تردد رہا،
ابھی تک میرے پاس اس کا کوئی دوسرا نسخہ نہیں پہونچا، بمبئی سے اطلاع ملی ہے کہ
پانچ نسخے وہاں پہونچے ہیں اب دیکھئے کب تک لکھنؤ پہنچتے ہیں۔

مجھ کو پہلے تو یہ خیال نہ تھا اور نہ کتاب پیش کرنے کے وقت یہ نیت تھی کہ آپ
سے اس کتاب پر کچھ لکھنے کی فرمائش کروں، لیکن آپ کے اس مختصر مضمون کو پڑھ کر
دل میں یہ تحریک پیدا ہوئی کہ آپ سے اس کتاب پر ایک مفصل مضمون اور تبصرہ کی
درخواست کروں جس کو آپ اشاعت کیلئے "معارف" کو بھیجیں، ہندوستان
میں اس کتاب پر تبصرہ کرنے کا جن چند گنی چنی شخصیتوں کو حق ہے ان میں آپ
ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں، اس لئے کہ آپ کی ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ
پر گہری نظر بھی ہے اور آپ کا یہ موضوع بھی ہے، آپ مصنف کی کاوش و
محنت کا پورا اندازہ کر سکتے ہیں، پھر آپ کا قلب اور قلم "گروہی عصبیتوں" سے
بھی پاک ہے، جو ہمارے اہل علم اور اہل قلم کا پرانا مرض ہے، اس لئے اگر آپ
کی طبیعت پر بار نہ ہو تو آپ پوری کتاب پر نظر ڈال کر ایک علمی مضمون "معارف"
کے لئے سپرد قلم فرمائیں جس میں اس کتاب کا علمی جائزہ لیا گیا ہو اور اس کا مقام
متعین کیا جائے۔ خاص طور پر ہندوستان کے نظم مملکت، انتظامی ڈھانچے، اس
عہد کے متعلق بیش قیمت معلومات اور خطط و آثار کے حصے پر فاضلانہ اور منصفانہ
تبصرہ ہو، یہ ان رسمی تبصروں سے ہزار درجہ بہتر ہوگا جو ایڈیٹر صاحبان جستہ جستہ
نظر ڈال کر لکھ دیا کرتے ہیں اور جن سے کتاب کی قدر و قیمت کا کوئی اندازہ نہیں
ہوتا۔

یہ میری آپ سے پہلی فرمائش ہے جس کی جرأت مجھے اس عزیزانہ تعلق کے علم کے
بعد ہوئی جو میرے نانا صاحب اور آپ کے نانا صاحب کے درمیان تھا امید ہے کہ

آپ اس کو رد نہ فرمائیں گے، آپ مضمون جب لکھ لیں یا تو براہ راست بھیجدیں اور مجھے اطلاع کردیں یا میرے پاس روانہ کردیں میں شاہ صاحب کو بھجوا دونگا۔

آخر میں عرض ہے کہ اس کو کتاب کے ہدیہ کی قیمت ہرگز نہ سمجھیں اور طبیعت پر جبر بھی نہ کریں، آپ کے مضمون کے بعد ہی اس کا خیال آیا اور اس کو بے تکلف عرض کردیا، افسوس ہے کہ آپ لوناولہ تشریف نہ لائے، میں نے محمد بھائی اور اسماعیل بھائی سے ذکر بھی کیا مگر وقت کم رہ گیا تھا، اور قاری صاحب بھی بمبئی تشریف لائے ہوئے تھے ورنہ تھوڑا سا وقت آپ کی وجہ سے اچھا گذر جاتا۔

معلوم ہوا کہ بمبئی میں بارش شروع ہوگئی ہیں، گویا ہمارے ہی جانے کا انتظار تھا، یہاں تو شدت کی گرمی پڑ رہی ہے اور نگاہیں آسمان کی طرف ہیں، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔

والسلام

مخلص — ابوالحسن علی ۲۲ رجون ۱۹۷۲ء

پوسٹ بکس ۹۳ لکھنؤ

خلافت راشدہ اور ہندوستان

صدق جدید لکھنؤ کی ۱۶ رجون ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی اس کتاب کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"اپنے موضوع پر ایک جامع و فاضلانہ کتاب عہد خلافت راشدہ سے ہندوستان میں صحابہ و تابعین کی آمد اور ان کے حالات، جغرافیائی تاریخ سیاسی ہر زاویہ سے ان پر نظر، مندرجات میں تحقیق و احتیاط کی پوری کوشش، تاریخ و سیر کی بیسیوں بلکہ پچاسوں کتابوں کا خلاصہ اور لب لباب معلومات کی ایک قاموس، خواص، عوام دونوں کیلئے قابل مطالعہ۔"

مولانا ابوالوفا افغانی صدر لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد اپنے
مکتوب گرامی میں اس کتاب کے سلسلہ میں راقم کو دعائیں دیں وہ اپنے مکتوب
گرامی میں تحریر فرماتے ہیں :

"کتاب " خلافت راشدہ اور ہندوستان " کے مطالعہ سے فارغ
ہوکر شکر کیا اور آپ کیلئے داعی ہوں کہ آپ کی جدوجہد کو اللہ جل شانہ
مبارک کرے اور اس " دار " کے مزید دروازے آپ کے لئے کھولے
ماشاء اللہ کہ جہاں تک جانے کے ابواب مسدود تھے آپ نے اپنی
کوشش سے انھیں کھول کر اندر سے جواہر نکالے اور عالم علم کو مالا مال
کیا یہ آپ ہی کا حق تھا کہ یہاں تک پہونچ سکے ، گو ابھی مزید جدوجہد
کی ضرورت ہے اللہ تعالیٰ اسے میسر کردے ۔

ابوالوفا افغانی حیدرآباد
۱۴ رجب سنہ ۱۳۹۲ھ

جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول

راقم کی تحقیق و تعلیق کے بعد جب یہ کتاب شائع ہوئی تو مولانا عبدالماجد
دریاآبادی نے صدق جدید لکھنؤ کی ۱۴ر جنوری سنہ ۱۹۰۲ء کی اشاعت میں اپنی رائے
ظاہر فرمائی ۔

حدیث نبوی کے ضخیم دفتروں سے قطع نظر خود اصول حدیث ، حدیث
کا ایک مستقل فن ہے اور اسکے ماہرین فن نے تصنیفات کا انبار لگادیا
ہے اور ان میں ایک ممتاز لکھنے والے متاخرین میں ابوالفیض محمد
بن محمد بن علی فارسی ہیں ۔ خوشی کی چیز ہے کہ ہمارے ہندوستان کے
ایک معروف فاضل قاضی اطہر صاحب مبارکپوری نے ان کی کتاب

جواہر الاصول کا قلمی نسخہ کہیں سے ڈھونڈ نکالا تصحیح اور مقابلہ کے بعد
اس کو شائع کرایا کتاب مستند اور بلند پایہ اور طلبہ فن کے ہر طرح
کام کی ہے۔

جناب مولانا انظر شاہ کشمیری رسالہ "دار العلوم" دیوبند میں اظہار خیال فرماتے
ہیں: زیر نظر کتاب شیخ علی فارسی کا علم حدیث میں منضبط جامع رسالہ ہے
جس پر مشہور اہل علم قاضی اطہر مبارکپوری نے تعلیقات قائم کی ہیں
اور مختلف مراجع سامنے رکھ کر مضامین کی تشریح و شواہد پیش کئے
رسالہ کی عربی اس قدر ہلکی پھلکی اور رواں دواں ہے کہ عربی سے
معمولی شدبد رکھنے والا بھی بے تکلف استفادہ کر سکتا ہے اگر
تعلیقات میں اسماء معرب کر دیئے جاتے تو کتاب کی افادیت
دو چند ہو جاتی یہ رسالہ تمام مدارس عربیہ میں داخل نصاب کیا
جا سکتا ہے۔

تذکرہ علماء مبارکپور

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی دامت برکاتہم نے ذرہ نوازی فرمائی
اور اپنے مکتوب گرامی میں جس تعلق خاطر کا اظہار فرمایا ہے اظہار مسرت کیلئے وہ خط
یادداشت میں درج کر رہا ہوں۔ مولانا موصوف رقم طراز ہیں:

فاضل گرامی! زاد لطفہ،
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا اس مرتبہ
مئی جون کے اوائل میں حجاز جاتے ہوئے اور واپسی میں کئی روز بمبئی
میں قیام ہوا آپ غالباً تشریف نہیں رکھتے تھے اسلئے ملاقات

نہیں ہوئی، اغلب ہے کہ آپ وطن آئے ہوئے ہیں دو ہی چار دن
ہوئے کہ آپکی جدید فاضلانہ تصنیف۔ تذکرہ علماء مبارکپور۔ پہونچی
اس کیلئے دلی شکریہ قبول کیجیے، خصوصی تعلق کی بنا پر مولانا احمد حسین
صاحب رسولپوری کا تذکرہ تو پہلی ہی فرصت میں حرفاً حرفاً پڑھ لیا پھر
جستہ جستہ کتاب پر نظر ڈالی، ابھی اور دیکھنا ہے، یہ موضوع تو
میرے لئے ہمیشہ سے دلچسپ اور دل آویز رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے
اس سلسلہ میں آپ سے بہت کام لئے، رسالہ۔ التوحید۔ پر تبصرہ
بھی آپ کے قلم سے پڑھا، ذوق و مسلک کے اتحاد کا اثر صاف
نمایاں ہے، مگر افسوس۔ انقلاب۔ کے پڑھنے والوں میں
ان لوگوں کی تعداد بہت کم ہوگی جو اس تبصرہ سے فائدہ اٹھائیں
کاش کہ یہ تبصرہ کسی علمی رسالہ میں شائع ہوتا۔
آپ کا پرانا وعدہ ایک مرتبہ رائے بریلی آنے کا ہے، خدا کرے
آپ کسی آمد وطن کے موقع پر اس کو پورا فرمائیں۔

مخلص۔ ابوالحسن علی
۱۵؍ اگست سنہ ۱۹۷۲ء

جولائی سنہ ۱۹۷۲ء کے معارف، اعظم گڈھ میں خلافت راشدہ اور ہندوستان
پر تبصرہ آیا، مولانا ضیاء الدین اصلاحی مدیر رسالہ نے اظہار رائے فرمائی۔
عرب و ہند کے تعلقات اور ان سے متعلق مباحث فاضل مصنف
کا خاص موضوع ہے اور اس پر وہ کئی کتابیں لکھ چکے ہیں زیر نظر
کتاب میں خلافت راشدہ کے زمانہ میں عرب و ہند تعلقات کا
جائزہ لیا گیا ہے، پہلے مختصراً عہد رسالت میں، پھر خلافت راشدہ

کے زمانہ میں دونوں ملکوں کے جو تعلقات رہے ان کے مختلف
پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں اس دور میں ہندوستان
میں غزوات و فتوحات اور یہاں کے سیاسی و انتظامی امور پر روشنی
ڈالی گئی ہے اور آخری ابواب میں اس عہد میں ہندوستان میں عربوں
کی آمد اور عرب میں ہندوستانی مسلمانوں کی آبادی اور ہندوستان
آنے والے صحابہ و تابعین کے مختصر تراجم سے متعلق بھی معلومات فراہم
کیے گئے ہیں یہ کتاب محنت و تحقیق اور تلاش و جستجو سے لکھی
گئی ہے، شروع میں مراجع و مصادر کی مفصل فہرست دی گئی ہے،
اس میں علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی اس موضوع کی مہتم بالشان
کتاب عرب و ہند کے تعلقات کا ذکر پتہ نہیں کیوں رہ گیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریاآبادی صدق جدید لکھنؤ کے ۲۹ر جولائی ۱۹۷۲ء کے
شمارے میں تذکرہ علمائے مبارکپور پر اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

قاضی اطہر صاحب مبارکپوری ملی و دینی طبقہ میں نہ صرف ایک مستند
سنجیدہ مقالہ نگار بلکہ اچھے مصنف اور اہل قلم کا درجہ رکھتے ہیں
خصوصاً ملی تاریخ کے موضوعوں پر۔ خوشی کی بات ہے کہ اب انکی
توجہ خود اپنے وطن کی طرف مبذول ہوئی ہے اور اپنے قصبہ مبارکپور
کی تاریخ پر ایک مفصل کتاب لکھ ڈالی ہے قصبہ کے ساڑھے چار سو
سال کی تاریخ اس میں آگئی ہے اور اس میں بادشاہوں عالموں،
فاضلوں، ادیبوں شاعروں فقیہوں سبھی کے تذکرے آگئے ہیں
عبارت بہت دلچسپ ہے۔

مجلہ رابطۃ العالم الاسلامی مکہ مکرمہ نے اپنی اشاعت جمادی الاول ۱۳۹۶ھ میں العقد الثمین پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا :

اس کتاب کے مصنف الاستاذ الفاضل القاضی ابوالمعالی اطہر مبارکپوری ہیں جو مجلہ البلاغ اور جریدہ انقلاب کے مدیر ہیں ہندوستان کے محقق مورخین میں ان کا شمار ہے اس کتاب میں فتوحات اسلامی کے بالکل ابتدائی دور کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور ان تمام صحابہ و تابعین کے تراجم بھی دیدیے گئے ہیں جو اس عہد میں یا غازی و مجاہد بن کر یا داعی اسلام بن کر آئے ان میں سے کچھ لوگ تو عرب کو واپس ہو گئے اور کچھ اسی سرزمین میں شہید ہوئے اور دہیں مدفون ہیں کتاب پر جزیرۃ العرب کے مشہور مجلہ المنہل کے مدیر محترم شیخ عبدالقدوس انصاری کا بیش قیمت مقدمہ ہے جس میں انھوں نے یہ بڑی اہم بات لکھی ہے کہ اس کتاب نے اسلامی تاریخ کے ایک بہت بڑے خلا کو پُر کیا ہے ہندوستان کے اندر اسلامی نفوذ کے بالکل ابتدائی دور کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے یہ کتاب بہترین تحفہ ہے ۔

سفر مصر

۲ر جنوری تا ۱۵ر جنوری ۱۹۷۸ء قاہرہ میں قیام رہا ، اس سفر میں حرمین شریفین کے بعد سب سے زیادہ وابستگی اور دلچسپی قاہرہ اور مصر میں رہی اور بچپن کے خواب کی تعبیر ظاہر ہوئی ، قاہرہ واقعی دارالکتب اور دارالعلوم اسلام ہے ، اس دوران میں حلوان اور اسکندریہ بھی جانا ہوا ، جامعہ ازہر کے بڑے شیوخ و اساتذہ سے ملاقاتیں ہوئیں ، یہاں زیر تعلیم ہندوستانی طلبہ

سے بھی ملنا جلنا رہا مساجد و جوامع کے جلال و جمال بھی دیکھا اور ائمہ و مشائخ کے مزارات پر حاضری اور فاتحہ خوانی بھی ہوئی ۔ اپنے خاص ذوق کے مطابق اہل علم اور کتب خانوں سے دلچسپی نسبۃً زیادہ رہی ، تجارتی کتب خانوں میں اپنی عربی کی دونوں تصنیفات رجال السند والہند اور العقد الثمین دیکھیں جن کو یہاں کے تاجر نادر و نایاب قرار دیکر بہت گراں قیمت پر فروخت کرتے ہیں اور ضرورتمند اہل علم خریدتے ہیں ، پاکستان کے ایک طالب علم نے جو جامعہ قاہرہ سے عرب و ہند تعلقات پر ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں ، بڑی بے صبری سے ملاقات کے لئے آئے اور بتایا کہ میں نے دہلی ، بمبئی اور کراچی میں آپ کی تصنیفات کیلئے لکھا بلکہ آپ کو بھی لکھا مگر اب تک مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ملی ۔ رجال السند والہند کے لئے برٹش لائبریری کو لکھا تو وہاں سے جواب آیا کہ کتاب موجود ہے مگر اس کا اجرا نہیں ہو سکتا ، موصوف اس موضوع پر مذاکرہ کرتے رہے اور اس دوران میں جو کتابیں میرے پاس تھیں ان سے مطلب کی بات حاصل کی بلکہ ایک کتاب یہ کہہ کر رکھ لی کہ تین ماہ کے بعد اس کو ڈاکٹر عبدالعزیز عزت کے حوالہ کر دوں گا ۔

ڈاکٹر عبدالعزیز عزت مصری علماء میں ہمارے پرانے علمی دوست اور نہایت مخلص انسان ہیں ۔ پہلے بمبئی میں مبعوث الازہر تھے پھر پاکستان گئے ۔ اور اب جامعہ ازہر میں وکیل شئون البعثات ہیں ، موصوف نے میری کتاب ۔عرب و ہند عہد رسالت میں ۔ کا ترجمہ عربی میں العرب والهند فی عهد الرسالة کے نام سے کیا جسے جامعہ ازہر کی مجمع البحوث الاسلامیہ نے طبع کر اکے شائع کیا ہے ، موصوف نے بتایا کہ چھ سو کتابوں میں سے صرف چھ کتابوں کو مجمع البحوث الاسلامیہ نے ترجمہ کیلئے منتخب کیا جس میں یہ کتاب بھی تھی ، پھر ان چھ کتابوں میں سے تین کا انتخاب عمل میں آیا ان میں بھی یہ کتاب تھی

اس سے اندازہ ہوا کہ اس کتاب کی کس قدر اہمیت اور ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔

موصوف نے پاکستان میں میری ایک اور کتاب "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" کو حکومات العرب فی الہند والسند کے نام سے ترجمہ کر کے اسلام آباد کے ادارہ مجمع البحوث الاسلامیہ کے عربی مجلہ "الدراسات الاسلامیہ" میں قسط وار شائع کرایا ہے جس کی کاپی موصوف نے مطالعہ کے لئے دی، وہ اب کتاب کو قاہرہ (مصر) سے شائع کرنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ نیز وہ میری کتاب "خلافت راشدہ اور ہندوستان" کا ترجمہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں اس سلسلہ میں یہ بات اہل علم کے لئے دلچسپی کا باعث ہے کہ میری کتاب "رجال السند والہند" بیس سال پہلے شائع ہوئی تھی اور اب بالکل نایاب ہو چکی ہے اور عرب ممالک میں خاص طور سے اس کی تلاش رہتی ہے، نیز درمیان میں راقم نے بہت سے نئے تراجم کا اضافہ بھی کیا ہے اور کتاب کو نئے سرے سے مرتب کر کے اس کی القسم الثانی بھی تیار کر لی ہے، اس طرح یہ کتاب مزید اہمیت کی حامل ہو گئی ہے، اس سفر میں اس کا مسودہ ساتھ رکھ لیا تھا تاکہ کسی عرب ملک میں اس کی اشاعت کا انتظام ہو جائے، چنانچہ قاہرہ کے ایک ادارہ سے اس کی طباعت واشاعت کی بات چیت مکمل ہو چکی ہے اور انشاء اللہ یہ کتاب مزید تحقیق و تنقیح اور اضافہ کے ساتھ قاہرہ سے جلد ہی شائع ہو جائے گی۔

سعودیہ عربیہ کے ایک مشہور دینی اخبار "الدعوۃ" نے مصر میں اسلامی انقلاب کے مشہور داعی محمد عبداللہ السمان کا ایک مضمون شائع کیا ہے جو ان کی چھ سالہ جیل سے رہائی کے بعد انٹرویو لینے اور ان سے تفصیلی

گفتگو کرنے کے بعد مرتب کیا گیا ہے الدعوة کے ایڈیٹر نے مضمون سے پہلے محمد عبداللہ السمان کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

قبل اس کے کہ ہم مفکر اسلام استاذ محمد عبداللہ السمان سے ہمکلامی کا شرف حاصل کریں چند سطروں میں جناب موصوف کا تعارف پیش کر رہے ہیں اگرچہ موصوف کی ذات اس سے بے نیاز ہے۔

بے مثال مصنف اور مفکر اسلام عبداللہ السمان اسلامی میدان میں تیس سال سے محنت کر رہے ہیں اور اسلامی مبلغین اور دعاة میں اول درجہ کے ہیں امام شہید حسن البنا کی صحبت اختیار کی اور ان سے متاثر ہوئے اور دین کی خاطر سینہ سپر ہونا انہیں سے سیکھا ان کی پہلی ہی تصنیف "الاسلام جاشر طلعت اهله" پر ان کو جیل بھیجا گیا اور وہ کئی بار حکومت مصر کے عتاب کا نشانہ بنے آخری مرتبہ مکمل چھ سال ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۱ء تک نظر بند رہے اور جیل خانہ سے اس حال میں نکلے کہ آپ کے ایمان میں مزید تازگی تھی، موصوف ایک قدیم رسالہ کے ایڈیٹر تھے جسکو استاد احمد حسن الزیات نکالتے تھے جامعہ ازہر کے میگزین الازھر کے وہ مستقل مقالہ نگار تھے آپ کی ۶۰ سے زیادہ تصنیفات ہیں وہ "الثقافة الاسلامیہ" کا سلسلہ اشاعت ۱۹۵۶ء تک مسلسل سات سال جاری رہا ہے مگر بار بار جیل جانے کی وجہ سے یہ سلسلہ بند ہو گیا جس کا اسلامی انسائیکلوپیڈیا میں اہم ترین مقام تھا۔

پھر اسکے بعد مدیر نے استاد موصوف کے انٹرویو کو مع العقہ

الثمین فی فتوح الہند کے عنوان سے دو قسطوں میں شائع کیا ہے۔

موصوف سے سوال کیا گیا تھا کہ چھ سال جیل سے رہائی کے بعد آپ عہد اسلامی کی ابتدائی فتوحات کی تاریخ و تحقیق پر تنازور دے رہے ہیں اسکے کیا اسباب ہیں اور آپ کے ذہن میں یہ خیال کیسے پیدا ہوا جب کہ آپ نے اس سے قبل اس پہلو پر کبھی اظہار خیال نہیں فرمایا تھا اس کے جواب میں موصوف نے تفصیل سے جواب دیا جسکو الدعوۃ نے مفصل شائع کیا۔ موصوف فرماتے ہیں کہ:

میں نے سابقہ گفتگو میں کہا تھا کہ جس چیز نے میرے ذہن میں یہ تحریک پیدا کی وہ العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیھا من الصحابۃ والتابعین کتاب ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب دینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولف کتاب کا مختصراً تعارف کرایا جائے۔

یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ کتاب مذکور کے مولف ہندوستان کے اسلامی مورخ ہیں بلکہ ہندوستانی علماء، محققین، مفکرین میں امتیازی حیثیت کے مالک اور ممتاز وسر برآوردہ ہیں جو قاضی ابوالمعالی اطہر مبارکپوری کے نام سے مشہور ہیں، پھر اس کے بعد اختصار کے ساتھ قاضی صاحب کے حالات زندگی اور تعلیم حاصل کرنے کے مراحل کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں فرمایا کہ موصوف اس وقت مجلہ البلاغ کے ایڈیٹر ہیں، مؤلف موصوف کی یہ کتاب العقد الثمین۔ تاریخ اسلام کی پہلی کتاب نہیں ہے بلکہ اس سلسلہ کی آپ کی چار کتابیں اس سے پہلے شائع ہو چکی ہیں رجال السند والہند، العرب والہند

فی عہد الرسالۃ، الحکومات العربیۃ فی الھند، چوتھی کتاب المعجم الغابر للھند الاسلامیۃ، پانچویں کتاب یہ العقد الثمین ہے اس میں اسلامی ہند کی اسلامی فتح کے آغاز سے حکومت اموی کے اخیر دور تک کی تاریخ بیان کی گئی ہے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی حیات کو تادیر قائم رکھیں تاکہ مولف موصوف اپنی تحقیقات کا سلسلہ برابر جاری رکھ سکیں فی الحال موصوف نے ہندوستان میں عباسیوں کی حکومت کی تاریخ کو موضوع بحث بنایا ہے اور اس کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔

العقد الثمین کی تالیف و ترتیب میں مکمل دو سال ۱۲۸۶ھ سے ۱۲۸۸ھ صرف ہوئے ہیں پہلی مرتبہ ہندوستان میں طبع ہوئی تھی اور دوسرا ایڈیشن دارالانصار قاہرہ سے شائع ہوا ہے، اس کے علاوہ دوسری کتابیں بھی دو سال سے قاہرہ میں چھپ رہی ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ مصنف نے اس سلسلہ میں قابل قدر محنت فرمائی ہے غزوات اور فتوحات کی تحقیق و تفتیش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے بلکہ موصوف تحقیقی میدان میں ان حضرات سے سبقت لے گئے ہیں جنھوں نے غزوات و فتوحات کی تحقیق میں حصہ لیا ہے، مولف موصوف اپنی کتاب میں ان حضرات کا تعارف بھی کراتے ہیں جن کا اس میں ذکر ہے اور ہر ایک کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں جس کا وہ مستحق ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض ترجمہ چھوٹا ہے اور بعض بڑا ہے۔ چونکہ یہ تراجم مستند مراجع سے ماخوذ ہیں اسلئے ہر ایک محقق اور مفکر کے نزدیک ان کو بڑی مقبولیت اور بڑا درجہ حاصل ہے۔

ابتک ہندوستان میں عہد اول کی جو تاریخیں لکھی گئیں وہ سرسری

اور ضمنی حیثیت سے لکھی گئیں مشہور مورخ مدائنی متوفی ۲۲۵ھ نے
ہندوستان کی عہد اول کی تاریخ میں تین کتابیں لکھیں اور واقدی
متوفی ۲۰۷ھ نے بھی اخبار فتوح السند لکھی لیکن ان کی حیثیت اسلام
کی عالمی تاریخ کے ایک جزز کی ہے، تحقیق سے کام نہیں لیا گیا اور پوری
تحقیق نہیں کی گئی جو اس کتاب العقد الثمین میں موجود ہے۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کے عہد اول کی تاریخ اسی ملک کے اہل علم
کے قلم سے ہو اور پوری تفصیل و تحقیق سے ہو اگر ساری دنیا میں اسلام
کے ابتدائی نفوذ کی تاریخ اسی طرح لکھی جائے جیسی العقد الثمین
میں ہے تو اسلام کی نئی نسل میں احیاء اسلام کا جذبہ پیدا ہوگا.
اس سے ان کو حوصلہ ملے گا، کیونکہ عہد صحابہ و تابعین کے جوش
جہاد اور دعوت اسلام کا جذبہ اُن تاریخوں سے ملے گا وہ کہیں سے
نہیں ملے گا اگر عالمی پیمانے پر یہ کام ہو جائے تو پھر اسلام ساری
دنیا میں ایک ابھرتی ہوئی قوت کے طور پر اپنا وجود منوالیگا اور نئی نسل
اپنی قدیم تاریخ سے اسلامی جذبہ مستعار لیکر عملی میدان میں آگئی تو
ساری دنیا کو ان کے سامنے جھکنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔

الدعوۃ سعودیہ عربیہ ۲۸ر صفر ۱۴۰۳ھ مطابق
۱۳ر دسمبر ۱۹۸۲ء

تدوین سیر و مغازی

الاستاد ڈاکٹر عبدالعزیز عزت وکیل شئون البعثات جامعہ ازہر قاہرہ کی
خدمت میں میری تازہ ترین کتاب "تدوین سیر و مغازی" پہونچی تو موصوف
نے جامعہ ازہر کے میگزین الازھر میں دو صفحات میں کتاب کا تعارف کرایا،

ڈاکٹر صاحب موصوف نے لکھا :

فضیلۃ الاستاد الشیخ القاضی ابوالمعالی اطہر مبارکپوری ہندی نے اپنی تازہ ترین تصنیف "تدوین سیر و مغازی" مجھے ہدیہ میں ارسال فرمائی، کتاب اردو میں ہے اور اس کو شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند نے ۱۴۱۵ھ میں شائع کیا ہے۔ محترم مصنف سے میرے تعلقات اس وقت سے ہیں جب میں ہندوستان میں ازہر کی طرف سے مبعوث ہو کر گیا تھا یہ ۱۹۶۲ء کا زمانہ تھا میں نے موصوف کی دو کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا ہے ایک العرب والہند فی عہد الرسالۃ اور دوسری الحکومات العربیہ فی السند والہند یہ دونوں کتابیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں اس کے علاوہ ان کی ایک کتاب عربی میں رجال السند والہند ہے جس میں ابتدائے اسلام سے ساتویں صدی تک کے علماء و مشائخ محدثین رواۃ، فقہاء، ادباء، شعراء، متکلمین، فلاسفہ کے تراجم ہیں، تازہ ترین کتاب تدوین سیر و مغازی ۲۱۹ صفحات پر مشتمل ہے اور پانچ ابواب پر منقسم ہے۔ پھر اسکے بعد پانچوں ابواب کے عنوانات لکھے ہیں اور اسکے مندرجات سے روشناس کرایا ہے، آخر میں انھوں نے یہ بتایا ہے کہ مصنف ہندوستان پاکستان کے محقق عالم اور مشہور مصنف ہیں وہ عرصہ دراز سے اسلامی و ثقافتی خدمت انجام دیتے آئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور ان کے علوم سے امت کو زیادہ سے زیادہ استفادہ کا موقعہ مرحمت فرمائے ۔

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند

ایک شمع اور بجھی

پچھلے مہینے یہ جانکاہ خبر دلوں پر صاعقہ بن کر گزری کہ ملک کے مشہور صاحبِ قلم عالم و محقق، مورخِ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارک پوری ۲۸ صفر ۱۴۱۷ھ ۱۴ جولائی ۱۹۹۶ء بروز یکشنبہ تقریباً دس بجے شب میں اس سرائے فانی سے رحلت کر گئے (انا للہ وانا الیہ راجعون) اللہم اکرم نزلہ ووسع مدخلہ وابدلہ داراً خیراً من دارہ واھلاً خیراً من اھلہ ونقّہ من الخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس۔

یوں تو دنیا کے اس مسافر خانہ سے سبھی کو ایک نہ ایک دن رختِ سفر باندھنا ہے۔ شب و روز کے ہنگاموں میں نہ جانے کتنوں کے بارے میں خبر ملتی ہے کہ وہ ہم سے رخصت ہو گئے۔ بہت سوں کی اس دائمی جدائی پر دلوں کو شدید رنج والم بھی ہوتا ہے لیکن ایسے بہت کم ہوتے ہیں جن کی رحلت کی خبر دلوں پر بجلی گرا دے اور جن کی یاد ان لوگوں کے دلوں میں بھی ہوک اور سخت بےچینی پیدا کر دے جو ان سے قرابت و رشتہ داری کا رسمی رابطہ نہیں رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کو اپنی رحمتوں میں شرابور کرے، وہ ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ وہ اپنی زندہ دلی اور وسیع علمی خدمات کی وجہ سے علمی دنیا میں ہر دلعزیز شخصیت کے مالک تھے۔ اور جو شخص بھی علم و تحقیق کی کچھ قدر

و منزلت اپنے دل میں رکھتا ہے اس کے لئے بلا شبہ قاضی صاحب کی وفات ایک عظیم سانحہ ہے۔

ان کی وفات اگرچہ پوری علمی دنیا کے لئے ایک ایسا حادثہ ہے جسے تادیر بھلایا نہیں جاسکے گا۔ لیکن اس ناچیز کے لئے یہ ایسا ہی ذاتی نقصان ہے جیسے ان کے قریبی اعزہ کے لئے۔ اس لئے کہ وہ اس ناچیز پر اس درجہ شفیق و مہربان تھے کہ الفاظ کے ذریعہ اس کا بیان ممکن نہیں۔ کم و بیش پچیس سال تک قاضی صاحب کی صحبتیں نصیب رہیں صرف علمی محفلوں میں نہیں نجی مجلسوں اور سفر و حضر میں ان کی معیت نصیب ہوئی ہر حال میں مرحوم کی شفقتوں کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی علمی عظمتوں کو نظر انداز کرکے مجھ جیسے چھوٹے کے ساتھ بتکلف نہیں بلکہ بتلطف چھوٹے بن جاتے تھے۔ قاضی صاحب ہی کی بے پناہ شفقتوں اور مخلصانہ ہمت افزائیوں نے مجھے قلم پکڑنے کا حوصلہ دیا۔

جزاہ اللہ عنی و عن العلم خیر الجزاء

سادگی و بے تکلفی، کتب بینی کا ذوق، مطالعہ کی وسعت، کتابیں جمع کرنے کا بے پایاں جذبہ، پاکیزہ شعری مذاق، علمائے امت و سلف صالحین کے تذکروں سے عشق کی حد تک شغف، علمائے دیوبند کے مسلک پر تصلب کے باوجود دوسروں کے ساتھ توسع و رواداری فردوں کی ہمت افزائی اور انھیں آگے بڑھانے کا بے لوث جذبہ، اور ہر طرف سے بے نیاز ہوکر اپنے علمی و تحقیقی کاموں میں مشغولیت وغیرہ قاضی صاحب کی کتاب زندگی کے وہ دلکش ابواب ہیں جن سے خود ان کی شخصیت رعنائیوں کا مرقع بن گئی تھی۔

تاریخ ولادت : قاضی صاحب ۴، رجب ۱۳۳۴ھ مطابق ۷، مئی ۱۹۱۶ء کو ضلع اعظم گڈھ کے مشہور صنعتی قصبہ مبارک پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے نانا مولانا احمد حسین رسول پوری نے "عبد الحفیظ" نام رکھا مگر وہ اپنے علمی نام قاضی اطہر مبارکپوری ہی سے مشہور و معروف ہوئے۔ اور اصل نام اس طرح متروک ہو گیا کہ اب کم ہی لوگ

اس سے واقف ہوں گے۔

طلب وتکمیل : وطن کے اساتذہ سے قرآن مجید، اردو زبان اور ریاضی وغیرہ کی مکتبی تعلیم مکمل کر کے سنہ ۱۳۵۰ھ میں مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں عربی تعلیم کا آغاز کیا اور وہاں کے اساتذہ مولانا مفتی محمد یسین مبارک پوری، مولانا شکراللہ مبارکپوری، مولانا بشیر احمد مبارکپوری، مولانا محمد عمر مبارکپوری وغیرہ سے نحو، صرف، ادب، بلاغت، منطق، فلسفہ، فقہ، اصول فقہ وغیرہ مروجہ نصاب کی تمام کتابیں پڑھیں۔ ان اساتذہ کے علاوہ اپنے ماموں مولانا محمد یحییٰ رسول پوری سے عروض و قوافی اور ہیئت کے بعض اسباق پڑھے۔ قاضی صاحب کی علمی تربیت میں مولانا محمد یحییٰ مرحوم کا بڑا حصہ ہے قاضی صاحب میں کتب بینی اور مطالعہ کا چسکا پیدا کرنے والے اصل میں یہی ہیں۔ نئی نئی کتابیں لاکر قاضی صاحب کو دیتے اور اس کے مطالعہ پر انھیں اکساتے اس طرح رفتہ رفتہ کتب بینی ان کی عادتِ ثانیہ بن گئی۔

مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں مروجہ نصاب مکمل کر لینے کے بعد جامعہ قاسمیہ (مدرسہ شاہی) مراد آباد کا علمی سفر کیا اور فخر المحدثین مولانا سید فخرالدین احمد شیخ الحدیث سے صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ، سنن ابوداؤد، اور مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم دہلوی سے سنن ترمذی اور مولانا سید محمد اسماعیل سے صحیح مسلم وغیرہ کتب حدیث پڑھ کر سنہ ۱۳۵۹ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔

ذوقِ مطالعہ : قاضی صاحب کو بچپن ہی سے کتب بینی کا شوق تھا۔ انھوں نے اپنی مختصر خود نوشت سوانح حیات۔ قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک میں لکھا ہے:

> غیر درسی کتابوں کے مطالعہ کا شوق جنون و دیوانگی کی حد تک بڑھ گیا تھا ...... چلتے پھرتے کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں ضرور رہا کرتی حتی کہ کھانے

وقت بھی کتاب دیکھتا تھا ۔۔۔ بعض اساتذہ ازراہِ شفقت کہتے تھے کہ اس قدر زیادہ نہ پڑھو ورنہ اندھے ہوجاؤ گے تو میں عرض کرتا کہ اگر ایسا ہوا تو خود ہی یہ کام بند ہو جائے گا ۔ کثرتِ مطالعہ اور کتب بینی سے بعض اوقات آنکھ میں سوزش پیدا ہو جاتی ۔۔۔ اور چکرانے لگتا تھا ۔ (ص ۲۱ ۔ ۲۲)

اسی ذوقِ مطالعہ کی یہ برکت تھی کہ قاضی صاحب نے مختلف موضوعات پر اہم کتابیں دیکھ لی تھیں انھوں نے خود درج ذیل کتابوں کا ذکر کیا ہے ۔

فہرست ابن ندیم ، وفیات الاعیان ، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب ، دلائل النبوۃ ، سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان ، آکام المرجان فی احکام الجان ، حیاۃ الحیوان ، الصواعق المحرقۃ ، العمدۃ فی الشعر ونقدہ ، المحاسن والاضداد ، الشعر والشعراء ، المیزان الکبریٰ ، سیرۃ ابن ہشام ، وفاء الوفاء ، المستطرف ، دیوان فرزدق ، کتاب الملل والنحل ، العقد الفرید ، رسالۃ الغفران ، تہذیب التہذیب ، توالی التاسیس وغیرہ ۔

اس فہرست کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"یہ ان کتابوں کے علاوہ ہیں جن کو میں خریدتا تھا اور رات دن ان کے مطالعہ میں مشغول رہتا تھا ۔۔۔ اسی طرح جمعیۃ الطلبہ (مدرسہ احیاء العلوم) کی لائبریری کی تقریباً تمام کتابیں کلی یا جزوی طور پر میرے مطالعہ میں رہ چکی ہیں اور میں نے ان سے استفادہ کیا ہے ۔ (ص ۲۳ ۔ ۲۴)

اس فہرست کو ملاحظہ کیجیے اور بتائیے کہ آج کے ہمارے وہ فضلاء جو کسی اور کام میں نہیں بلکہ علمی مشغلہ میں لگے ہوئے ہیں ان میں کتنے ایسے ہیں جنھوں نے ان کتابوں کو دیکھا ہے ۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان میں سے بہتوں کو ان کتابوں میں سے اکثر کا نام بھی معلوم نہ ہوگا تو میرا خیال ہے کہ یہ مبالغہ نہیں ہوگا ۔

اسی ذوقِ مطالعہ کا نتیجہ تھا کہ قاضی صاحب کا سینہ معلومات کا گنجینہ بن گیا تھا بعد میں ان کے نوکِ قلم سے رواں ہو کر صفحۂ قرطاس پر ثبت ہو گیا جسے دیکھ کر ایک خلقت انھیں مورخِ اسلام کہنے پر مجبور ہو گئی۔ اور بلاشبہ قاضی صاحب کو یہ حق تھا کہ وہ جگر مرحوم کے الفاظ میں کہیں۔

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ نہیں ہیں جن کو زمانہ بنا گیا

درس و افادہ : علوم و فنون کی تحصیل سے رسمی فراغت کے بعد تعلیم و تدریس سے جدید علمی سفر کا آغاز کیا۔ اور اپنی مادرِ علمی مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں چار پانچ سال تدریسی خدمت انجام دی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدرسی کا یہ اولین تجربہ شاید کچھ مناسب نہیں ثابت ہوا جس کی جانب خود قاضی صاحب نے نہایت بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے لکھتے ہیں :

"مدرسی کا یہ چار پانچ سالہ دور میرے حق میں صبرِ ایوب اور گریۂ یعقوب کا دور تھا۔" (ص ۴۹)

انجام کار احیاء العلوم سے علٰحدہ ہو کر نومبر ۱۹۴۳ء میں "مرکز تنظیم اہل سنت امرتسر" سے وابستہ ہو گئے جہاں انھوں نے ردِ شیعیت اور ردِ قادیانیت سے متعلق اہم مضامین و مقالات سپردِ قلم کئے۔ پھر "زمزم کمپنی لمیٹڈ لاہور" کے اصرار بلیغ پر "مرکز تنظیم اہل سنت امرتسر" سے الگ ہو کر "زمزم کمپنی" سے منسلک ہو گئے ۱۹۴۷ء تک مسلسل اس میں کام کرتے رہے اس مدت میں کمپنی کی جانب سے نو سو صفحات میں منتخب التفاسیر مرتب کی۔ افسوس کہ یہ گرانقدر علمی سرمایہ علمی سرمایہ تقسیم ہند کے ہنگامہ کی نذر ہو گیا۔

زمزم کمپنی سے وابستگی ہی کے دوران قاضی صاحب کے والد ماجد فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے حرمین شریفین کے سفر پر گئے تو خانگی ضروریات کے لئے تقریباً

تین چار ماہ گھر پر رہے اور عارضی طور پر چند اسباق احیاء العلوم میں پڑھاتے رہے۔ پھر جنوری ۱۹۴۷ء سے ملک کے مشہور صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط کی زیر نگرانی روزنامہ زمزم لاہور میں اخبار نویسی اور صحافت کی خدمت انجام دی۔ اور تقسیم ملک سے کچھ پہلے فارقلیط کی معیت میں اس خیال سے وطن آگئے کہ تقسیم کے ہنگامہ کے بعد واپس آ جائیں گے۔ مگر حالات نے دوبارہ لاہور جانے کی اجازت نہیں دی۔

۱۹۴۸ء کی ابتداء میں مولانا محفوظ الرحمٰن نامی مرحوم سکریٹری حکومت یوپی کی نگرانی میں بہرائچ سے ہفتہ وار اخبار "انصار" جاری کیا مگر یہ اخبار حکومت کے عتاب کی وجہ سے سات آٹھ ماہ سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ اسلئے بہرائچ سے منتقل ہو کر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گجرات چلے آئے اور پورے ایک سال یہاں تدریسی خدمت انجام دی۔ اپنی مشہور تصنیف "رجال السند والہند" کی تدوین کی ابتدا ڈابھیل کے زمانۂ قیام ہی میں کی تھی۔

غرض تعلیم سے فراغت کے بعد تقریباً آٹھ سال مبارک پور، امرتسر، لاہور، بہرائچ، ڈابھیل کے تعلیمی و صحافتی اداروں میں رہ کر تدریس، صحافت مضمون نگاری اور شعر گوئی میں گزر گئے۔

بمبئی میں قیام اور تصنیفات کا سلسلہ: ان مختلف تعلیمی و صحافتی اداروں کے تجربات سے انھیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ ان کا اندر بیٹھا ہوا فرہاد علم ان اداروں کے رسوم و قیود کا پابند نہیں رہ سکتا۔ اسلئے انھوں نے طے کیا کہ ان اداروں کی نگرانی سے آزاد ہو کر کسی جگہ جم کر یکسوئی کے ساتھ تصنیفی و تحقیقی کام میں لگ جانا چاہئے۔ لیکن خانگی ضروریات اور معاشی مسائل سے صرف نظر بھی ممکن نہیں تھا۔ اس چکی کی مشقت کے ساتھ مشق سخن جاری رکھنے کے لئے سرزمین بمبئی سب سے زیادہ موزوں نظر آتی چنانچہ نومبر ۱۹۴۹ء میں وہ بمبئی

پہنچ گئے۔ جسے خود انھوں نے اپنے علمی سفر کی آخری منزل کہا ہے۔ ابتدا میں دفتر جمعیۃ علماء صوبہ مہاراشٹر میں فتویٰ نویسی کی پھر جون ۱۹۵۰ء میں جب روزنامہ جمہوریت کا اجراء ہوا تو نائب مدیر کی حیثیت سے اس سے وابستہ ہو گئے مگر یہ وابستگی تادیر قائم نہ رہ سکی اور ایسے حالات پیدا کر دیے گئے کہ قاضی صاحب کو اس سے علٰحدہ ہو جانا پڑا۔ اس کے بعد روزنامہ انقلاب بمبئی سے منسلک ہو گئے اور "جواہر القرآن" نیز "احوال و معارف" کے عنوان سے علمی، تاریخی، سیاسی موضوعات پر مشتمل روزانہ دو تین کالم لکھتے رہے یہ سلسلہ چالیس سال کی طویل مدت تک جاری رہا جو صحافت کی تاریخ میں ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔

پھر ۱۹۵۳ء میں تنظیم خدام النبی کی زیر نگرانی "ماہنامہ البلاغ" جاری ہوا تو اس کی ادارت میں شامل ہو گئے، تقریباً بیس پچیس سال تک یہ مجلہ قاضی صاحب کی ادارت میں جاری رہا جو علمی حلقہ میں وقعت و پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور ملک کے مؤقر رسائل میں شمار ہوتا تھا۔ یہ ناچیز سب سے پہلے اسی ماہنامہ البلاغ کے ذریعہ غائبانہ طور پر قاضی صاحب سے متعارف ہوا ان قلمی مصروفیتوں کے ساتھ دس سال تک "انجمن ہائی اسکول بمبئی" میں دینیات و اخلاقیات کی تعلیم دی۔

قاضی صاحب کی یہ ساری مصروفیات اگرچہ یک گونہ علمی ہی تھیں مگر در اصل ان کا تعلق "چکی کی مشقت" سے تھا جو اہل و عیال اور خانگی ضروریات کے لئے ناگزیر تھیں۔ ان کا اصل کام وہ تھا جسے وہ ایک معمولی سے حجرے میں بیٹھ کر انجام دیتے تھے۔ قاضی صاحب خود لکھتے ہیں:

"تیس سال سے زائد مدت تک بمبئی میں قیام رہا۔ جس شہر میں شبلی مرحوم کنارِ آب جوہو و گل گشتِ اپالو کی سیر کر کے غزل کہا کرتے تھے

ان کے ایک ہم وطن نے ایک معمولی سے کمرے میں " مرکز علمی " کا بورڈ لگا کر تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری و مقالہ نویسی کا دورِ شباب گزارا ... بمبئی غریب پرور ہونے کے ساتھ علم کش شہر ہے جس کا احساس مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی تھا۔ اسلئے میں نے دولت و ثروت کو اس اندرون قعر دریا میں تیس سال سے زائد تخت ہونے کے باوجود اپنے دامنِ علم کو تر نہیں ہونے دیا اور مختلف قسم کی مصروفیات کے باوجود عرب و ہند کے ابتدائی چار سو سالہ تعلقات پر عربی و اردو میں متعدد کتابیں لکھ کر ایک بڑے خلا کو پُر کیا۔ (ص ۵۱ — ۵۲)

قاضی صاحب نے تحقیق و تصنیف کے لئے جس موضوع کا انتخاب کیا وہ اردو زبان کیلئے بڑی حد تک اجنبی ہونے کے ساتھ بظاہر خشک تھا لیکن اسی خشک اور سنگلاخ زمین میں انھوں نے علم و تحقیق کے ایسے ایسے خوشنما و دلکش بیل بوٹے سجا دیے اور اپنی تاریخی و تحقیقی تحریروں میں ادب کی چاشنی اس طرح پیوست کر دی کہ وہ ایک دلچسپ اور شگفتہ موضوع بن گیا کہ پڑھنے والا زبان و بیان کی شگفتگی اور معلومات و تحقیقات کی رعنائیوں میں اس طرح کھو جاتا ہے کہ جب تک کتاب مکمل نہ ہو جائے اسے چھوڑتا نہیں۔

مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی مرحوم نے ان کی کتاب " خلافت عباسیہ اور ہندوستان " کے مقدمہ میں کتنی صحیح اور مبنی برحقیقت بات لکھی ہے کہ :

" واقعہ یہ ہے کہ موصوف نے اس ملک کے خالص اسلامی عربی تاریخ کے موضوع کو اپنی علمی و تحقیقی کاوشوں کا محور بنا کر جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ ہر اعتبار سے لائق تحسین ہے۔ ان کی ان گرانقدر تصانیف کو اسلامی تاریخ کا بیش بہا اور نادر خزانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جناب مؤلف اس بے آب و گیاہ صحرا میں تنہا چلے اور

جب منزل مقصود پر پہنچے تو اپنے ساتھ باغ و بہار کا ایک پورا قافلہ
لے کر آئے۔ (ص ۵۵۹)

عرب و ہند تعلقات پر اردو میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی گرانمایہ تصنیف ۔ عربوں کی جہاز رانی ، میں ہلکی سی روشنی ڈالی ہے۔ چونکہ مولانا موصوف نے اس وسیع اور پھیلے ہوئے موضوع کو ایک خاص عنوان میں محدود کر دیا تھا اس لئے وہ اپنے موضوع کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس سے زیادہ گفتگو کر بھی نہیں سکتے تھے ۔ اس کے برخلاف قاضی صاحب نے اس موضوع کی وسعتوں کو محدود کرنے کی بجائے اس کی عمومیت اور ہمہ جہتی کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے ہر ہر گوشہ پر تفصیلی نظر ڈالی ہے ۔ اور مطالعہ کی وسعت اور ذہن رسا کی برکت سے بیش بہا اور نادر معلومات کا ایک ایسا سدا بہار علمی گلستاں سجا دیا ہے جس رعنائیوں میں ماہ و سال کی گردش سے اضمحلال آنے کی بجائے مزید تازگی و شگفتگی بڑھتی جائے گی ۔

اس خاص موضوع کے علاوہ قاضی صاحب نے تاریخ اور طبقات و رجال کے موضوع پر نہایت وقیع اور پر از معلومات کتابیں تصنیف کی ہیں جو علمی حلقوں میں اپنا ایک مقام رکھتی ہیں اور عام طور پر علمی و تحقیقی کام کرنے والے ان سے استفادہ کرتے ہیں اور آج انکی اکثر کتابیں بطور حوالے کے استعمال ہوتی ہیں۔ یہ رتبۂ بلند عام طور پر کم ہی مصنفین کو نصیب ہوتا ہے ۔

مستقل تصنیفی و تحقیقی کاموں کے علاوہ سیکڑوں سے زائد علمی و تحقیقی مقالات و مضامین بھی سپرد قلم کیے ، جو ملک کے مؤقر اور اہم رسائل معارف اعظم گڈھ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ، ماہنامہ برہان دہلی ، صدق لکھنؤ وغیرہ میں شائع ہوئے اگر ان مقالات کو ان کے موضوع کے اعتبار سے مرتب کر کے شائع کیا جائے تو اسکی بہت ساری جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔

قاضی صاحب کی تصانیف اور خدمات پر ایک اجمالی نظر: قاضی صاحب طرز تحریر اور اسلوب بیان میں شبلی اسکول سے متاثر تھے۔ علامہ شبلی اور انکے مخصوص تلامذہ کی طرح قاضی صاحب کی علمی و تاریخی تحریروں میں بھی ادب کی چاشنی رچی بسی ہے۔ اسی کے ساتھ ان میں بیان کی قوت، سلاست وفصاحت اور علمی وقار پایا جاتا ہے۔ غیر علمی اور مبتذل الفاظ ان کے یہاں تلاش کرنے سے بھی شاید نہ ملیں۔ مآخذ ومصادر کے سلسلے میں بھی وہ قریب سے قریب تر اور قدیم مآخذ پر بالعموم اعتماد کرتے ہیں اور نقل و روایت میں پوری احتیاط برتتے ہیں اسی بنا پر علمی دنیا میں ان کے حوالوں پر مکمل طور پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

قاضی صاحب کی تصانیف کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ مدارس اور یونیورسٹیوں دونوں حلقوں میں یکساں مقبول ہیں اور جس طرح علماء وفضلاء ان کی کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں، جدید علوم وفنون کے ماہرین بھی اپنے علمی وتحقیقی کاموں میں ان سے مدد لیتے اور حوالہ کے طور پر انھیں استعمال کرتے ہیں۔

علمائے ہند میں قاضی صاحب کو یہ شرف ومجد حاصل ہے کہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ وثقافت اور یہاں کے طبقات ورجال پر جس وسیع پیمانے پر انھوں نے کام کیا ہے مولانا سید عبدالحئی حسنی صاحب نزہۃ الخواطر کے علاوہ اس باب میں ان کا کوئی شریک وسہیم نہیں ہے۔ ان کی کتابوں سے اشخاص ورجال کے تراجم علاحدہ کرکے مرتب کئے جائیں تو ان کی متعدد ضخیم جلدیں تیار ہوسکتی ہیں۔

قاضی صاحب کی عمر سن ہجری کے اعتبار سے بیاسی سال سے متجاوز تھی لیکن ان علمی وقلمی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ان کی عام صحت، جسمانی ساخت اور چستی وہمت کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے فیوض وحسنات کا سلسلہ

ابھی جاری رہے گا لیکن ادھر چند مہینوں سے ان کی علالت کی خبریں مل رہی
تھیں جس سے تشویش تھی پھر قاضی صاحب کے پوتے مولوی فرحان سلمہٗ، متعلم
دورۂ حدیث دارالعلوم دیوبند سے معلوم ہوا کہ اب رو بصحت ہیں جس سے یک گونہ
اطمینان ہو گیا تھا اور یہ اندازہ بالکل نہیں تھا کہ وہ جلد ہی چلے جائیں گے لیکن
موت ایک ایسی چیز ہے جس نے اندازوں اور تخمینوں کو ہمیشہ شکست دی ہے
آخر کار معمولی سی علالت کے بعد وہ اچانک اس دار فانی سے رخصت ہو گئے
اور ایک دن سب کو ہی یہاں سے کوچ کرنا ہے مگر یہ ان لوگوں میں ہیں جو
اپنے پیچھے اپنا شاندار کام چھوڑ جاتے ہیں۔ ہندوستان کی جب کبھی علمی
تاریخ لکھی جائے گی تو بلاشبہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کی علمی سرگرمیوں کا
ذکر نمایاں طور پر ہوگا۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مولانا زین العابدین الاعظمی
شعبہ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

تدوین سیر و مغازی

مؤلفہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری پر ایک اجمالی نظر

سیر و مغازی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگی مہمات مراد ہوا کرتی ہیں اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بہ نفس نفیس تشریف لے گئے ہوں تو اس کو عرف عام میں غزوہ کہتے ہیں اور اگر کسی صحابی رض کی سرکردگی میں یہ مہم بھیجی گئی ہو تو اس کو سریہ کہتے ہیں جس کی جمع سرایا ہوتی ہے۔ مگر یہ کلی ضابطہ نہیں ہے۔ جنگ موتہ میں آپ تشریف نہیں لے گئے تھے مگر اسکو غزوۂ موتہ کہا جاتا ہے۔

غزوات و سرایا کی تعداد

مدینہ منورہ کی ابتدائی زندگی ہی سے غزوات و سرایا کی ابتداء ہو چکی تھی اس کی تفصیل یہ ہے کہ مسلمان ہجرت کرکے مدینہ منورہ گئے اور سکون سے عبادت الٰہی اور دعوت الی اللہ میں مشغول ہو گئے تو ستمگر کافروں کو ان کا چین سے رہنا پسند نہ آیا اور برابر پیچ و تاب کھاتے رہے کہ کس طرح مسلمانوں کا سکون غارت کریں کبھی یہود مدینہ سے خفیہ روابط بڑھاتے، کبھی منافقین سے ساز باز کرتے۔ یہاں تک کہ مدینہ پاک کی چراگاہ تک کو ان بے ایمانوں نے لوٹ اور غارت گری کا نشانہ بنالیا، پھر ایک جنگ مغلوبہ کا منصوبہ بنا کر مالی مہم کیلئے تجارتی قافلہ روانہ کرنے لگے آخر حکم الٰہی آگیا۔

اُذن لِلّذین یقاتلون بانهم ظُلموا ۔ حکم ہوا ان لوگوں کو جن سے کافر لڑتے ہیں،

ان اللہ علی نصرہم لقدیر ـ	اس واسطے کہ ان پر ظلم ہوا۔ اللہ انکی مدد
الذین اُخرجوا من دیارھم	کرنے پر بلا شبہ قادر ہے، وہ لوگ جنکو انکے
بغیر حق إلا ان یقولوا ربنا	گھروں سے ناحق نکالا گیا، کہ وہ لوگ یہ
اللہ، ولولا دفع اللہ الناس	کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے، اور اگر نہ
بعضھم ببعض لھدمت صوامع	ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو ایک کو دوسرے سے
وبیع وصلوات ومساجد یذکر	تو ڈھائے جاتے تکیے، اور مدرسے اور عبادتخانے
فیھا اسم اللہ کثیرا ولینصرن	اور مسجدیں جن میں نام پڑھا جاتا ہے اللہ کا
اللہ من ینصرہ ط ان اللہ لقوی	بہت اور بالیقین اللہ اسکی مدد کریگا جو اللہ کی
عزیز (الحج ۳۹ ـ ۴۰)	مدد کرے (یعنی اسکے دین کی) بیشک اللہ زبردست
	ہے زور والا (سورہ حج آیت ۳۹ تا ۴۰)

اب مسلمانوں نے بھی پوزیشن سنبھال لی، اور دفاعی و اقدامی غزوات شروع کر دیے، ان تمام غزوات وسرایا کی تعداد میں مورخین کے درمیان کچھ اختلاف ہے، اسی طرح ان کی تقدیم وتاخیر بھی قدرے مختلف فیہ ہے: مثلاً زید بن ارقم رضہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے غزوات کی تعداد ۱۹ بتلاتے ہیں، حضرت بریدہؓ سے ۱۹، کے علاوہ ایک روایت سولہ غزوات کی بھی ہے۔

حضرت جابر رضہ کی روایت سے اکیس غزوات کا ثبوت ملتاہے، مشہور مورخ محمد بن سعد نے ایک جماعت سے ۲۷ غزوات کو نقل فرمایاہے۔

اسی طرح سرایا کی تعداد محمد بن اسحٰق نے ۳۸ اور ابن سعد نے ۴۰ بتائی ہے ان غزوات میں سے آٹھ غزوات اتنے بڑے ہیں جن میں جنگ وقتال کی نوبت آئی ہے۔

بدر، احد، احزاب، مریسیع، قدید[1]، خیبر، مکہ اور حنین

---

(۱) بخاری کی شرح عمدۃ القاری میں قدید ہی تحریر ہے، ہمارے خیال میں یہ قریظہ ہے جیساکہ ابن اسحٰق کی روایت میں ہے کتابت کی غلطی سے "قریظہ" "قدید" ہوگیاہے، واللہ اعلم۔

احادیث کے ذخیرہ میں ان تمام غزوات کا ذکر ہے لیکن ترتیب اور واقعات کا تسلسل بہت کم غزوات کے بارے میں مذکور ہے اب ان کو مربوط کرنا اور واقعات کے تسلسل کو دریافت کرنا نہایت دشوار امر ہے اور یہ کام ارباب سیر ومغازی کا ہے۔ یہیں سے فن سیرت ومغازی کے مدون کرنے کی ضرورت پڑی۔ جو کہ اس کتاب "تدوین سیر ومغازی" کا اصل موضوع ہے، قرن اول کے جن بزرگوں کو اس عظیم کام کی سعادت حاصل ہوئی وہی سیر ومغازی کے مدون اور جامع اول قرار پائے، ان میں عروہ ابن الزبیر، موسیٰ بن عقبہ، اور امام زہری سرفہرست ہیں۔

تدوین

عام طور سے محققین کی رائے یہ ہے کہ سب سے پہلے اس فن کی تدوین اور جمع کا کام کیا وہ محمد بن اسحٰق بن یسار المطلبی ہیں جن کی وفات ۱۵۱ھ میں ہوئی۔

پھر انکی کتاب کی تلخیص وتہذیب کرنے والے ابو محمد عبدالملک بن ہشام الحمیری المتوفی ۲۱۸ھ ہیں ان کی کتاب سیرۃ النبی اتنی عمدہ اور مقبول ثابت ہوئی کہ سیرۃ ابن اسحٰق تو نایاب ہوگئی مگر ان کی کتاب جو سیرۃ ابن ہشام کے نام سے مشہور ہے آج تک نہ صرف متداول ودست یاب ہے بلکہ اس کی تلخیص اور اسکے تراجم بھی دیگر زبانوں میں ہوئے، اور بہت سے اہل علم نے اسکی شرحیں بھی لکھیں، جن میں ابوالقاسم عبدالرحمٰن السہیلی کی شرح "الروض الآنِف"[1] نہایت مفید اور معتبر شرح ہے، السہیلی کی وفات ۵۸۱ھ میں ہوئی۔

حافظ بدرالدین محمود بن احمد العینی شارح بخاری المتوفی ۸۵۵ھ نے اس کے

---

(۱) مشہور یہ ہے کہ شرح کا نام "الرَّوضُ الاُنُف" اچھوتا باغ، ہے مگر کشف الظنون میں "الانف" پر کھڑا زبر لگا کر "الآنِف" بنا دیا ہے وہیں سے ہم نے نقل کیا ہے۔ ز

ایک معتد بہ حصہ کی شرح بنام "کشف اللثام فی شرح سیرۃ ابن ہشام" لکھی۔

اور ابوالنصر فتح بن موسیٰ الخضراوی المتوفی سنہ [illegible]ھ نے تو سیرۃ ابن ہشام کو نظم کا جامہ پہنا دیا فجزاہم اللہ تعالیٰ۔

لیکن صاحب کشف الظنون نے ان حضرات سے بہت پہلے سیرۃ مغازی کی تدوین و جمع کا ہونا بتلایا ہے اور اس فن کو جمع کرنے والوں کے درج ذیل اسماء گرامی تحریر کیے ہیں۔

۱۔ عروۃ بن زبیر وفات سنہ ۹۴ھ

۲۔ وہب بن منبہ۔ سنہ ۱۱۴ھ

۳۔ محمد بن مسلم الزہری۔ سنہ ۱۲۴ھ

۴۔ موسیٰ بن عقبہ۔ سنہ ۱۴۱ھ اور ابن اسحٰق کے بعد درج ذیل حضرات کا اضافہ کیا ہے۔

۱۔ ابو محمد یحییٰ بن سعید بن ابان الاموی الکوفی الحنفی وفات سنہ ۱۹۴ھ

۲۔ ابن عبدالبر القرطبی وفات سنہ ۴۶۳ھ۔ لیکن تاریخ وفات حافظ ابن ابر سنہ [illegible]ھ صحیح ہے سنہ [illegible]ھ صحیح نہیں ہے۔

تدوین سیر و مغازی

اس فن کی تدوین و تالیف کے لحاظ سے اور اس فن کی تاریخی حیثیت سے اردو زبان میں ابھی تک کوئی کتاب ہمارے علم میں نہیں تھی، اس وقت انتہائی کد و کاوش اور تحقیق و تفتیش کے ساتھ سب سے پہلے یہ اہم خدمت جناب مولانا عبدالحفیظ صاحب عرف قاضی اطہر مبارکپوری مرحوم نے بحسن و خوبی انجام دی جسکو شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے نہایت آب و تاب کے ساتھ سنہ ۱۴۱۰ھ میں شائع کیا جو (۳۲۰) صفحات پر بسط و تفصیل سے چھپی ہے۔

اس کتاب کی اجمالی خوبی یہ ہے کہ مصنف مرحوم نے اس کتاب کو پانچ ابواب پر مرتب کیا ہے۔

پہلا باب: سیر ومغازی تدوین سے پہلے۔

اس باب میں سب سے پہلے مصنف نے سیر ومغازی کا لغوی واصطلاحی مفہوم واضح کیا ہے، پھر اصحاب المغازی اور اصحاب الحدیث کا فرق بیان کیا ہے اور انکے روایتی معیار کو متعین کیا ہے، اور مغازی کے خصوصی راویوں کا بسط وتفصیل سے تذکرہ کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ عرب، جاہلیت ہی کے دور سے اپنے ایام ووقائع کا تذکرہ بطور مفاخرت کیا کرتے تھے، اسلام کے بعد غزوات وسرایا کے ذکر اذکار نے اس آبائی مجد وشرف کا مقام بجا طور سے حاصل کرلیا پھر تو ان غزوات وسرایا کا تذکرہ گھر گھر میں ہونے لگا، خصوصی مجلسوں اور درس کی عمومی مجالس میں پھر مساجد میں اس کا چرچا کرکے خیر وبرکات کو حاصل کیا جانے لگا۔

ان مجالس میں سے "مجلس القلادہ" کا حال نہایت موثر پیرایہ میں بیان کیا ہے، اس باب کے مضامین میں سے دو مضمونوں کا خلاصہ افادہ کی غرض سے پیش خدمت ہے۔

۱ ۔ اصحاب الحدیث اور اصحاب المغازی میں فرق

اصحاب حدیث تین امور کو جمع کرتے ہیں (۱) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا (۲) آپؐ نے کیا کیا؟ (۳) آپ کے سامنے یا آپؐ کے وقت میں کیا کام کیا گیا۔

اصحاب سیرت بھی انھیں تین امور کو جمع کرتے ہیں، لیکن اصحاب حدیث کا مقصود بالذات احکام کا جاننا ہوتا ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ان کی بحث ضمناً ہوتی ہے۔ اور اصحاب سیر کا مقصود بالذات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جاننا ہوتا ہے احکام کی بحث ضمناً ہوتی ہے، اب محدثین اپنی قوت اسی میں صرف کرتے ہیں کہ اس قول یا فعل کا انتساب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح ہے یا نہیں؟

[illegible] اس کے ساتھ دو باتیں اور معلوم کرنی ہوتی ہیں، ایک یہ کب ہوا؟ دوسرے یہ کہ ایسا کہنے یا کرنے کی وجہ کیا تھی؟ محدثین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو مسلسل و مربوط بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور ان کے اسباب و علل کو بھی بیان کرتے ہیں اسلئے دونوں جماعتوں کا معیار تحقیق جدا جدا ہو گیا، مغازی کے واقعات دونوں لکھتے ہیں لیکن دونوں کے لکھنے میں فرق ہوتا ہے۔

مثلاً فتح مکہ کے متعلق محدثین اتنا لکھتے ہیں کہ قریش نے حدیبیہ کے معاہدہ کو توڑا اور بنی خزاعہ پر ظلم کیا جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے حلیف تھے اسلئے آپ نے ان پر حملہ کیا اور مکہ فتح ہوا۔

{ اس سے یہ احکام نکلیں گے۔ ١۔ غیر قوم سے معاہدہ کرنا ٢۔ معاہدہ کی پابندی کرنا۔ ٣۔ معاہدہ توڑنے پر سزا دینا۔ ٤۔ مکہ کی زمین کا کیا حکم ہے؟ }

لیکن اصحاب سیر یہ بھی بتاتے ہیں کہ یہ معاہدہ کتنا اہم تھا؟ بنی بکر اور بنی خزاعہ کی یہ جنگ عرصہ سے چل رہی تھی، صلح حدیبیہ کی وجہ سے یہ جنگ رک گئی تھی، قریش نے معاہدہ توڑ کر پھر اس جنگ کو مشتعل کر دیا (جب کہ اس قدیم واقعہ کا تعلق احکام و استنباط سے کچھ بھی نہیں (؟) [illegible]

واقعات کی چھان بین میں اہل سیر کسی واقعہ کو نقل کرتے وقت کسی قبیلہ کے متعدد شخصوں سے روایت لیں گے تو اتنا کہہ دینا ان کے لیے کافی ہوگا کہ محمد بن اسحاق نے اپنے والد سے نقل کیا جن کو انھوں نے بنو سلمہ کے بڑے بوڑھوں سے سنا (اگر بنو سلمہ اس واقعہ میں شریک رہے ہوں) پھر مفصل واقعہ بتا دیں گے لیکن محدثین اس روایت پر یوں کلام کر کے رد کر دیں گے [illegible] مجہول۔ یا غزوہ خیبر اور فتح مکہ سے متعلق روایت بیان کرنے میں اتنی سند کو کافی سمجھیں گے

اخبرنا محمد بن اسحاق عن عبد اللہ بن الحسن عن بعض اهله [illegible]

عن ابی فراس الاسلمی عن اشیاخ منھم ممن حضرھا۔ یعنی بعض ان بزرگوں سے روایت کیا جو واقعہ میں شریک تھے۔ لیکن محدثین اسکو کافی نہیں سمجھیں گے بلکہ کہدیں گے۔ " فیہ راوٍ لم یسمَّ "

آگے تحریر فرماتے ہیں :

" اصحاب حدیث اور اصحاب سیر دو جماعت نہیں ہیں جو اصحاب حدیث ہیں وہ اصحاب سیر بھی ہیں لیکن جب انکو سیرت پر واقعات لکھنے اور جمع کرنے پڑتے ہیں اور سیر کے مقاصد پورے کرنے پڑتے ہیں تو تحدیث و روایت کی شرائط میں مناسب تبدیلی کرنی پڑتی ہے، اور اتصال سند کے اعلیٰ معیار و رتبہ سے نیچے اترنا پڑتا ہے۔ ز ص۱ "

قاضی صاحبؒ نے " تدوین و سیر و مغازی " کے اس پہلے باب میں فرماتے ہیں :

" بنو امیہ کا تقریباً پورا دور جو اسلامی غزوات و فتوحات کا شاندار دور ہے اسی انداز میں گذرا ہے، جہاد و غزوات میں صحابہ و تابعین، تبع تابعین امیر لشکر ہوتے تھے، اور ان کے ساتھ عبّاد، زہّاد، صلحا اور علماء و فضلاء کی بڑی جماعت ہوا کرتی تھی، جن کے برکات و تجربات، تعلیمات و ہدایات اور دعاؤں کے جلو میں اسلامی لشکر کے قدم آگے بڑھ رہے تھے، ابن کثیر نے اس دور کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

بنو امیہ کے دور میں جہاد کی گرم بازاری تھی، اسکے علاوہ ان کا کوئی شغل نہیں تھا، اسلام کا کلمہ مشرق و مغرب، بحر و بر میں بلند تھا، انھوں نے کفر اور کفار کو سرنگوں کر دیا تھا، اور مشرکوں کے قلوب مسلمانوں کے رعب سے بھر گئے تھے، مسلمان جس علاقہ میں چلے جاتے اسکو فتح کر لیتے، غزوات میں انکے ہر لشکر میں کبار تابعین، صلحاء، اولیاء اور علماء کی بڑی جماعت ہوتی تھی، انکی ذاتِ با برکات سے اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد فرماتا تھا۔

البدایہ والنہایہ ج۹ ص۸۷ "

(تدوین سیر و مغازی ص۶۰ - ۵۱)

محتاج بندہ کہتا ہے کہ البدایہ والنہایہ بار بار چھپی ہے اور مختلف طباعتوں میں صفحات بھی مختلف ہیں اسلئے حوالہ سے عبارت ملانے کی صورت یہ ہے کہ ابن کثیر نے کتاب کو تاریخ وار حوادث پر مرتب کیا ہے ۹۲ھ کے حوادث میں عبارت بالا موجود ہے مطبوعہ قاہرہ ۱۳۱۳ھ کے ص۹۵ جلد ۹ تو کو ملاحظہ کریں ابن کثیر نے عبارت بالا کی مثال میں، قتیبہ بن مسلم کے فتوح اتراک ہسلم ابن عبدالملک بن مروان کی فتوحاتِ روم وقسطنطنیہ، محمد بن قاسم کی فتوح ہند اور موسیٰ بن نصیر کی فتوحاتِ مغرب وغیرہ کو پیش کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے۔

فکان سوق الجہاد قائماً فی القرن الاول من بعد الھجرۃ الی انقضاء دولۃ بنی امیۃ وفی اثناء خلافۃ بنی العباس مثل ایام المنصور واولادہ، والرشید واولادہ، فی بلاد الروم والترک والھند .... ومن ھرب من بنی امیۃ الی بلاد المغرب وتملکوھا اقاموا سوق الجہاد فی الفرنج	قرن اول میں ہجرت کے بعد سے بنو امیہ کی پوری حکومت کے خاتمہ تک جہاد کا بازار گرم تھا، پھر عباسی خلفاء کے دور میں بھی بیچ بیچ میں منصور اور اس کے فرزندوں رشید اور اسکی اولاد کی حکومت میں۔ روم ترک، اور ہندوستان کے شہروں میں یہ بازار جہاد قائم رہا ..... اور بنی امیہ میں سے جو لوگ اندلس بھاگ کر گئے اور وہاں حاکم ہوئے انھوں نے بھی فرنگ میں اس گرم بازاری کو قائم رکھا۔

(البدایہ والنہایہ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۱۳ھ ص۹۳، ۹۵ ج۹)

بندہ نے اس مضمون کو اسلئے بہت مفید قرار دیا ہے کہ بنو امیہ کے دور میں جو بعض ناگفتنی واقعات پیش آگئے تھے اس سے متاثر ہو کر بعض مدعیان محبت بنو امیہ کے ان تمام دینی اور علمی، اسلامی فتوحات اور جہاد فی سبیل اللہ کے

کارناموں تک کا انکار کرتے رہتے ہیں جو دیانت و ... کے خلاف ہیں۔
قاضی جی نے اس مستند مضمون کو لکھ کر تاریخی ذمہ داری ... ادا ... ایسے لوگوں
کو عبرت و نصیحت کی راہ دکھادی ہے ... تعالیٰ نے ...

ولا یجرمنکم شنان قوم ... ری کسی قوم سے عداوت تم کو انصاف
علی ان تعدلوا۔ اعدلوا نہ کرنے کا مجرم نہ بنادے، تقوی اور
ھو اقرب للتقویٰ پرہیزگاری کا قرب اسی میں ہے کہ تم انصاف کرو

ب: اس باب میں مصنف نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام غزوات و سرایا
کا اجمالی نقشہ بھی دیدیا ہے جس میں ۲۷ غزوات اور ۵۷ سرایا ہیں اور اس میں
کالم مقرر کرکے

سریہ کا نام	سنہ وقوع	تعداد شرکاء	بجانب	مختصر کیفیت

کو ظاہر کردیا ہے

طلبہ کے لئے خاص طور سے یہ نقشہ بہت مفید ہے۔
قاضی جی سے پہلے یہ مفید کارنامہ حضرت قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان منصورپوری
رحمت اللعالمین میں انجام دے چکے ہیں رحمۃ للعالمین جلد دوم میں اس نقشہ سے
بلکہ زیادہ تفصیل کے ساتھ غزوات و سرایا کا نقشہ بنادیا ہے جس میں نتیجہ کے ساتھ
تعداد مقتولین و تعداد اسیران جنگ اور نقصان میں تعداد اہل اسلام۔ اور تعداد
کفار بھی مذکور رہے۔ اس کے بعد قاضی سلمان صاحب نے ایک اور عمدہ نقشہ
ذکر کردیا ہے جس میں شہدائے غزوات کا ترتیب وار ترجمہ و تذکرہ بھی ہے جو کتاب
المغازی پڑھانے والے اساتذہ کیلئے بھی بہت کارآمد ہے۔

دوسرا باب: سیر و مغازی کا تحریری سرمایہ

اس باب میں مصنف مرحوم نے سیر و مغازی کے دو تحریری سرمایوں کا ذکر
کیا ہے (۱) قرآن کریم (۲) عہد نبوی کی یادگار تحریریں۔ ۱ قرآن کریم کی

سورتوں کی طرف آپ نے اجمالی اشارہ فرمادیا ہے کہ کن کن غزوات کا ذکر کن کن سورتوں میں ہوا ہے مثلاً یہ کہ سریہ ابن الحضرمی سورۂ بقرہ میں، غزوہ بدر سورۂ انفال میں، غزوہ احد اور بدر الصغری سورہ آل عمران میں، غزوہ خندق سورۂ احزاب میں، صلح حدیبیہ سورۂ فتح میں، غزوہ بنی نضیر سورۃ الحشر میں، غزوہ حنین اور غزوۂ تبوک سورۂ براءۃ میں، حجۃ الوداع سورۂ مائدہ میں، مفصل یا مجملاً مذکور ہیں۔

۲۔ یادگار تحریروں میں سے سولہ[۱۶] تحریرات کا ذکر کیا ہے جن میں سے بعض مفصل ہیں اور بعض مختصر پھر ہر ایک تحریر کا مستند ماخذ بھی ساتھ ساتھ تحریر کرتے چلے گئے ہیں۔

تیسرا باب : تدوین سیر و مغازی کی ابتدا۔

اس باب میں آپ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پہلی صدی ہجری کے نصف آخر ہی میں عروہ بن الزبیر، ابان بن سعید بن العاص اور ابن شہاب زہری نے اپنی اپنی کتابوں کو مدون کر دیا تھا مگر کچھ ناموافق حالات کی وجہ سے وہ زمانہ کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ مگر ان کے شاگردوں نے "ہذہ مغازی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم" یا "من مغازی عروۃ بن الزبیر" یا "عن ابان بن عثمان فی غزاتہ" جیسے الفاظ ذکر کرکے جو تفصیلی واقعات بیان کئے ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ان حضرات نے اپنی اپنی کتابیں مدون کر دی تھیں۔ لیکن اس طرز استدلال میں مناقشہ کی بھی گنجائش ہے کیونکہ اس قسم کے الفاظ بہت سی حدیثوں کے بارے میں بھی وارد ہوئے ہیں حالانکہ ان کی تدوین بعد میں ہوئی ہے مثلاً حدیث افک کے بارے میں ہے۔

عن حدیث عائشۃ تعین قال لہا اہل الافک ما قالوا۔ یا احادیث رویا کے بارے میں ہے عن حدیثہ فی قصۃ رویا ۶ وغیرہ تو جس طرح یہاں جمع د

تدوین نہیں مراد ہے بلکہ تفصیلی حدیث معہود جس کی روایت حضرت عائشہ وغیرہ سے منقول و مروی ہے ان میں سے کچھ مروی مراد ہے اسی طرح ہذہ مغازی.... میں بھی یہ مراد ہو سکتا ہے کہ زہری یا ابان نے مغازی رسول کی جو روایت تفصیل سے بیان کی ہے اس میں کا بعض حصہ یہ ہے نہ کہ وہ جنکو انھوں نے کتابی شکل میں مدون کر دیا تھا۔ اسلئے، مصنف نے، عدم وثوق کے سبب کہیں احتمالی صیغہ استعمال کیا ہے مثلاً ص۱۴۷ میں ہے۔

"واقعہ حرہ کے وقت عروہ کی عمر تقریباً چالیس سال کی تھی، اس مدت میں انھوں نے جو کتابیں لکھیں یا جمع کیں ان میں کتاب المغازی بھی رہی ہوگی جسکی تدوین ۶۳ھ سے پہلے ہو چکی تھی"

اور ص۱۷۲ پر لکھتے ہیں:

"البتہ ابن شہاب زہری کے بارے میں ایسی کوئی تصریح نہیں ملتی، غالب گمان یہ ہے کہ انھوں نے بھی اپنے دونوں معاصر مصنفین مغازی کے دور میں کتاب المغازی لکھی ہوگی"

یہ شکیہ صیغے ان دونوں کی تاریخ تصنیف کے بارے میں ہیں ان کی اصل تدوین اور انکی کتابوں کے لکھنے میں مصنف کو یقین ہے لیکن اس سے بھی اختلاف کی گنجائش ہے اگر مصنف کا مستدل وہی الفاظ ہوں جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے لیکن عروہ کی کتاب المغازی بروایۃ الاسود کے وجود کا آٹھ حوالہ سیر اعلام النبلاء سے، اور البدایۃ والنہایہ کشف الظنون اور طبقات ابن سعد وغیرہ سے ۵ حوالہ دیا ہے اس سے پہلی صدی کے نصف آخر سے تدوین مغازی و سیر کا ثبوت فراہم ہوگیا۔ فالحمد للہ۔

اس باب کا مزید تعارف

مصنف نے اس باب میں سیر و مغازی تدوین کا دو دور بتایا ہے۔

پہلا دور پہلی صدی کے نصف آخر سے اس کے ختم تک ہے جب کہ اس میں

باقاعدہ تصنیف و تالیف کا کام شروع نہیں ہوا تھا۔ دوسرا دور دوسری صدی کی ابتدا سے شروع ہوا۔

پہلے دور کی چھ کتابوں اور سات راویان مغازی کے حالات تحریر کیے ہیں۔ اور دوسرے دور کی سات کتابوں اور سات راویوں کا تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔ جس میں موسیٰ بن عقبہ وفات ۱۴۱ھ، محمد بن اسحاق وفات ۱۵۱ھ، ابومعشر سندی وفات ۱۷۰ھ، سلیمان بن بلال تیمی وفات ۱۷۲ھ، عبدالملک بن محمد بن ابوبکر ابن عمرو بن حزم وفات ۱۷۶ھ، ابراہیم بن سعد وفات ۱۸۳ھ اور محمد بن عمر الواقدی وفات ۲۰۷ھ کے حالات اور انکی کتب مغازی کا مکمل تعارف کرادیا ہے۔ اسکے بعد جن راویان مغازی سے ان بزرگوں کی کتابیں امت میں شائع ہوئیں ان کا ترجمہ لکھ دیا ہے وہ راویان یہ ہیں :

ہشام بن عروہ (۱۴۵ھ) ولید بن کثیر مخزومی (۱۵۱ھ) عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز ضیفی (۱۶۲ھ) اسمٰعیل بن ابراہیم اسدی (۱۶۹ھ) عبداللہ بن جعفر مخرمی (۱۷۰ھ) (کتابت کی غلطی سے کتاب میں۔ مخزومی، ہوگیا ہے صحیح مخرمی ہے کیوں کہ یہ مسوّر بن مخرمہ صحابی کی اولاد میں سے ہیں اور انکی نسبت جد اعلیٰ مخرمہ کی طرف ہے۔ ز) یعقوب بن ابراہیم زہری (۲۰۸ھ) ابراہیم بن منذر حزامی (۲۳۶ھ)

باب چہارم : مختلف شہروں کے علمار سیر و مغازی اور مصنفین کا تعارف

اس باب میں کوفہ کے ۹ نو معتبر مصنفین کے حالات ہیں، بصرہ کے سات ہواسط کے ایک ہشیم بن بشیر کی کتاب المغازی کا تعارف ہے، مدینۃ السلام بغداد کے دس علمار سیر و مغازی اور انکی تصنیفات کا بیان ہے، ان ستائیس علمار کے علاوہ رے، مرو، بیہق، نیشاپور، جزیرہ، صنعا، دمشق شام، مصر اور اندلس کے علمار کبار، اور مغازی و سیر میں انکی قیمتی تصانیف کا دلکش پیرایہ میں تعارف کرایا گیا ہے، سچ تو یہ ہے کہ یہ باب پوری کتاب کی جان ہے۔

پھر باب پنجم میں
سیر کی فقہی تدوین کا ذکر ہے جس میں امام محمد بن حسن شیبانی کی مشہور کتابوں
سیر الصغیر" اور "السیر الکبیر" اور حسن بن زیاد لؤلؤی کی کتاب السیر، محمد بن عمر
واقدی کی کتاب السیر کا تعارف ہے (یہ کتاب المغازی للواقدی کے علاوہ ہے)
اور ابو عمرو الاوزاعی کی کتاب السیر، جو دونوں امام شافعی کی کتاب الام میں شامل ہیں۔
انکے علاوہ داؤد بن علی اصفہانی، صالح بن اسحٰق جرمی، محمد بن سحنون تنوخی اندلسی
وغیرہ رحمہم اللہ کی کتب سیرت اور سب کے مفید حالات دلچسپ پیرایہ میں اس کتاب
میں موجود ہیں جو سب مطالعہ سے تعلق رکھتے اور قابل مطالعہ ہیں۔
مصنف کی بعض رایوں سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً: اس باب میں
"موطا امام مالک" کو سیر کی کتابوں میں داخل کر دیا گیا، کیونکہ اسمیں جہاد اور غنائم کے
احکام ہیں، کیونکہ حدیث کی تقریباً تمام ہی کتابوں میں جہاد، غنائم کے احکام والی حدیثیں
مذکور ہیں بعض کتب میں کتاب الجہاد کا عنوان ہوتا ہے اور بعض میں کتاب السیر کا عنوان
ہوتا ہے اور صحیح بخاری میں تو جہاد، فی ، سوادعہ و مصالحت کے بعد مستقل کتاب المغازی
مفصل مذکور ہے تو کیا ان سب کتابوں کو سیر و مغازی کی کتاب کہا جا سکتا ہے؟ اگر
نہیں تو موطا بھی سیر کی کتاب نہیں کہی جا سکتی۔ مصنف نے خود ہی پہلے یہ فرق بیان
کر دیا ہے کہ واقعات و غزوات میں تسلسل کی تحقیق کرنی اصحاب المغازی کی ذمہ داری ہے اور
واقعات سے صرف احکام کا نکالنا محدثین اور فقہاء کا کارنامہ یہاں وہ فرق ملحوظ نہیں رہ سکا۔
الغرض اختلاف کی گنجائش کے باوجود کتاب تدوین سیر و مغازی اپنے موضوع
پر پہلی اور منفرد کتاب ہے جس میں پہلی صدی کے نصف آخر سے تیسری صدی تک کے
علماء سیر و مغازی اور انکی تصنیفی اور تعلیمی اور روایاتی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اللہ تعالیٰ
اس کو قبول کرے اور امت کو اس سے نفع اٹھانے کی توفیق بخشے آمین وآخر دعونا ان
الحمد للہ رب العالمین۔

مولانا محمد عالم خلیل امینی

مدیر رسالہ "الداعی" عربی و استاذ ادب عربی دارالعلوم دیوبند

علم کا اک چراغ تھا! نہ رہا

مؤرخ، محقق، مصنف، صحافی اور مشہور عالم
مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ

کئی ماہ سے مبارک پور اور دیار اعظم گڑھ سے آنے جانے والوں کے ذریعے مسلسل یہ خبریں ملتی رہیں کہ مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری صاحب فراش ہیں۔ انھیں ناک میں کوئی تکلیف تھی جس کا آپریشن کرایا تھا۔ آپریشن کی وجہ سے نقاہت و اضمحلال پیدا ہوگیا جو عرصے تک انھیں اپنی گرفت میں لیے رہا۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ صحت یاب ہوگئے ہیں۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد خبر آئی کہ وہ بخار وغیرہ میں مبتلا ہیں کمزوری کافی بڑھی ہوئی ہے، تا آنکہ یہ خبر صاعقہ اثر سننے کو ملی کہ تحقیق و مطالعہ، تصنیف و تالیف، صحافت و تدریس اور تعلقات عرب و ہند کے صحرائے ناپیدا کنار کے راہ نورد شب دوشنبہ ۲۸/۲/۱۴۱۷ھ مطابق ۱۵/۷/۱۹۹۶ء کو ٹھیک ۹ بج کر ۵۵ منٹ پر دار فانی سے جو ہم سبھی انسانوں کی سرائے ہے، دار آخرت کو، جو ہم سبھوں کا آخری ٹھکانا ہے، سدھار گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے نہ صرف برصغیر بلکہ اسلامی دنیا کے

کثیر التالیف اہل تحقیق مؤرخوں کی صف میں ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جس کا اِس
دور قحط الرجال میں بظاہر حال پُر ہونا مشکل نظر آتا ہے، خدائے قدیر ہر چیز پر
قادر ہے لیکن عرصے سے یہی دیکھنے میں آرہا ہے کہ میدان علم و عمل اور فضل و کمال
سے جو یکتائے روزگار بھی رخصت ہو جاتا ہے اس کی جگہ خالی ہی پڑی رہ جاتی ہے
بالآخر، کام چلاؤ، پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

قاضی صاحب نے طویل و صبر آزما مطالعے پر مبنی گراں مایہ تصنیفات سے اسلامی
کتب خانے کو مالا مال کیا اور عرب و ہند کے تعلقاتِ دیرینہ کے اچھوتے موضوع پر
تفصیل، دقیقہ رسی اور جامعیت کے ساتھ عہد بعہد کام کیا، ہزاروں صفحات
پڑھے اور چیونٹی کے منہ سے شکر جمع کرنے کے عمل کے ذریعے کئی عدد ضخیم کتابیں اردو
اور عربی دونوں زبانوں میں تصنیف کیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ کام علمی دنیا پر
رہتی دنیا تک کے لیے لائق ہزار شکر احسان ہے، جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا
مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی دیوبندی متوفی ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۹۸۴ء جنہوں
نے اپنے "ندوۃ المصنفین" دہلی سے قاضی صاحب کی اہم ترین تاریخی کتابوں کو خصوصی
دلچسپی کے ساتھ شائع کیا تھا۔ خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان "کے پیش لفظ میں
بہت ہی خوبصورت اور معنی خیز جملوں میں قاضی صاحب کی محنت اور انتھک تلاش
و تحقیق کی داد دی اور لکھا کہ "اس میں شک نہیں کہ قاضی صاحب اس بے آب و گیاہ
صحرا میں تنہا چلے اور جب لوٹے تو باغ و بہار کا پورا قافلہ اپنے ساتھ لائے۔"

ان کا یہ تاریخی سلسلہ جس میں "عرب و ہند عہد رسالت میں"، "خلافتِ راشدہ
اور ہندوستان"، "خلافت امویہ اور ہندوستان"، "خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان
اور "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" سر فہرست ہیں، بہت مقبول ہوا اور
اردو و عربی دونوں زبانوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

تحقیق و مطالعہ طلب اور شب و روز کی محنت کی متقاضی تاریخی و اکیڈمک

تصانیف کی تالیف، قاضی صاحب کی شناخت بن گئی تھی۔ وہ سرسری مضامین لکھنے پر قادر نہ تھے وہ علم و تحقیق کے رسیا تھے اسلئے اپنی عزلت پسندی کے باوجود عالم گیر شہرت نے ان کے قدم چومے اور ہمہ گیر نیک نامی نے انکی بڑائی میں بالخصوص عرب دنیا میں وہ بڑی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اس طرح وہ اپنے دین و ملت کے ساتھ اپنے اس ملک کیلئے بھی نیک نامی کا ذریعہ بنے جواب مسلمانوں کے تئیں ناشکری کی تمام حدیں پھلانگنے پر تلا ہے۔

قاضی اطہر مبارکپوریؒ اس حقیقت کی تابناک مثال تھے کہ انسان اپنے آپ کو تنگ دستی و عسرت کے باوجود اور چھوٹی جگہ رہ کر اپنی محنت و جاں فشانی اور بلند ہمتی کے ذریعے قابل رشک حد تک بڑا بنا سکتا ہے۔ انھوں نے حقیقی برائی پائدار نام وری اور قابل قدر مقام و مرتبہ کے عناصر مطلوبہ اپنے چھوٹے سے گمنام مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور اور اپنے محدود ماحول والے ایسے قصبے میں حاصل کر لیے۔ جو مروجہ مفہوم میں "تہذیب و تمدن کی روشنی" سے محروم اور کسی ایسی قابل ذکر علمی و ثقافتی سرگرمی سے نا آشنا تھا، جو عالم اسلام کے علمی پایہ تختوں کا امتیاز رہا ہے جیسے حجاز، دمشق، قاہرہ، بغداد، فاس، رباط، دہلی اور دیوبند وغیرہ مکتب کے مرحلے سے اعلیٰ تعلیم تک کے تمام مراحل انھوں نے اسی قصبے میں طے کیے۔ صرف ایک سال مدرسہ شاہی مرادآباد میں گذارا جہاں دورۂ حدیث شریف میں شرکت کی اور سند فراغ حاصل کیا۔

وہ خود فرماتے ہیں:

"میرے محدود وسائل اور مخصوص حالات، قرب و جوار کے بڑے مدرسوں میں جانے کے حق میں بالکل نہیں تھے۔ بڑی مشکل سے صرف ایک سال باہر رہنا نصیب ہوا۔ اس کے باوجود حوصلے کی بلندی اور تحصیل علم کی دھن کا حال یہ تھا کہ جامع ازہر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا سودا ہر وقت

سر میں سمایا رہتا تھا۔ بلکہ بعد میں بھی یہ آرزو باقی رہی۔ مگر میں نے اپنے ذوق و شوق کی بدولت ناکامی کو کامیابی سے یوں بدل دیا کہ اپنے گھر اور مدرسے کو جامع ازہر، جامع زیتونہ، جامع قرطبہ، مدرسہ نظامیہ اور مدرسہ مستنصریہ بنا لیا اور وطن ہی رہ کر خدا کے فضل و کرم، اساتذہ کی شفقت و محبت اور اپنی محنت و عزیمت سے بہت کچھ حاصل کیا اس دور میں مجھ پر عجیب علمی سرمستی اور شوریدگی چھائی رہتی تھی۔ قرطبہ بغداد و بخارا، اندلس و غرناطہ اور عالم اسلام کی قدیم مشہور درسگاہوں اور ان کے اساتذہ و تلامذہ کے مناظر سامنے رہتے تھے اور میں ان کی حسنات و برکات سے مستفیض ہوتا رہتا تھا۔" [1]

قاضی صاحبؒ کا علم و فضل اس بات کی زندہ شہادت ہے کہ علم و ثقافت اور فکر و دعوت کے میدان میں قابلِ ذکر کردار ادا کرنے اور جبینِ تاریخ پر نقشِ دوام چھوڑ جانے کے لائق بننے کے لیے انسان کو اس کا ماحول اور وسائل، بالیقین اتنا ساتھ نہیں دیتے جتنا کہ خود اس کی ہمت و حوصلہ اور مطلوبہ محنت، توفیقِ الٰہی اور برکتِ ربانی اس کی دست گیری کرتی ہے۔

ان کی زندگی میں ہمارے ان نوجوانوں کے لیے سامانِ درس موجود ہے جو اپنے آپ کو بنانے کے حوالے سے تن آسانی، سہل پسندی، کوتاہ طلبی، عاقبت نااندیشی اور حاصل شدہ موقع، وقت، جگہ اور شخصیات کی تمام تر ناقدری کے ساتھ صرف خوب سے خوب تر جگہ اور وسائلِ فراواں کو پا لینے کی آرزو اور کوشش میں عمرِ عزیز اور وقتِ گراں مایہ کا ایک ایسا حصہ ضائع کر دیتے ہیں جس میں یکسوئی، اولوالعزمی اور صبر و قناعت کے ساتھ ہنرمندی کے ذریعے بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے۔ سچ ہے کہ اگر

---

[1] قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک " از: قاضی اطہر مبارکپوریؒ ص ۱۸، ۱۹

انسان ذوقِ طلب اور شوقِ جستجو سے محروم ہو تو آبِ حیواں پر پہنچ کر بھی تشنہ کام ہی واپس آجاتا ہے۔ راقم الحروف نے اپنی کم عمری کے باوجود اس طرح کے بہت سے تشنہ کاموں کا مشاہدہ کیا ہے اور کر رہا ہے۔

اس حقیقت کا بیان خود قاضی صاحب کی زبان سے سنئے:

"طالب علم میں محنت اور کوشش کے ساتھ آگے بڑھنے کا حوصلہ اور ذوق و شوق ہو تو چھوٹی جگہ رہ کر بڑا بن سکتا ہے اور اگر یہ باتیں نہ ہوں تو بڑی جگہ رہ کر چھوٹا ہی رہے گا۔ مجھے کسی بڑے علمی و تحقیقی اور تربیتی ادارے کی ہوا تک نہیں لگی، نہ کسی بڑی شخصیت کی رہنمائی حاصل ہو سکی، ساتھ ہی میرے ذاتی اور خانگی حالات بھی سازگار نہیں تھے اس کے باوجود میں مطمئن اور خوش ہوں کہ اپنے ذوق و شوق، محنت و حوصلہ اور خود سازی کے بل پر وہ سب کچھ حاصل کیا جو بڑے اداروں اور بڑی شخصیتوں کی سرپرستی میں رہ کر حاصل کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ہوتا بھی ہے کہ مجھے کسی بڑی شخصیت یا ادارے کے سائے میں جگہ ملتی تو میرا علمی پودا قوتِ نمو سے محروم ہو جاتا اور کھلی آب و ہوا میں اسے آزادانہ پھلنے پھولنے اور بار آور ہونے کا موقع میسر نہ آتا۔" (۱)

۱۹۷۲ء میں پہلی مرتبہ ان سے لکھنؤ میں شرفِ ملاقات و تعارف حاصل ہوا۔ وہ مجھ سے یہ جان کر بہت خوش ہوئے کہ میں بھی مولانا سید محمد میاں دیوبندی دہلوی متوفی ۱۳۹۵ھ / ۱۹۷۵ء کا شاگرد رہوں۔ قاضی صاحب چونکہ بے حد خورد نواز تھے، اسلئے یہ سنتے ہی مجھے گلے لگا لیا کہ تم تو میرے استاد بھائی نکلے۔

ان سے دوسری ملاقات دارالعلوم دیوبند کے تاریخی اور بے مثال اجلاسِ صد سالہ

۱؎ حوالۂ سابق ص ۱۹

(منعقدہ ۱۴۰۰ھ / ۱۹۸۰ء) کے موقع سے اچانک ایک روز صدر گیٹ پر محشر نما بھیڑ میں ہوئی۔ دیکھتے ہی پہچان گئے اور علیک سلیک کے بعد ایک طرف کو کھڑے ہو کر اپنے ہم سفر دو صاحب زادوں کا تعارف کرایا کہ یہ دونوں دارالعلوم سے بھی فارغ ہیں اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے بھی۔ ان کی اس یادداشت پر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ آٹھ نو سال کے بعد بھی مجھے نہاں خانہ خیال میں محفوظ رکھے ہوئے ہیں مجھ کو پہچان لینے میں ذرا بھی تکلف نہ ہوا، میں ان کی بلند اخلاقی سے بہت متاثر ہوا کہ وہ اس بھیڑ میں دیکھتے ہی شفقت سے لپٹ گئے ورنہ ان سے بہت کم درجے کے لوگ اپنا علمی رعب و دبدبہ قائم رکھنے کے لئے عموماً چھوٹوں کو پہچان کر بھی طرح دے جاتے ہیں اور اگر از خود پیش رفت کر کے تعارف کرائیے تو تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہیں۔

پھر دیوبند میں ان سے بار بار ملنے کی سعادت حاصل رہی، جہاں وہ رسمی اور غیر رسمی طور پر سال میں ایک سے زائد بار تشریف لاتے رہتے تھے کہ انھیں دارالعلوم دیوبند سے (وہاں سے رسمی طور پر فارغ نہ ہونے کے باوجود) ایسی محبت و عقیدت تھی جو بعض دفعہ یہاں کے براہ راست فاضل کو بھی نہیں ہوا کرتی، دارالعلوم دیوبند بھی ان کے ساتھ اپنے ایک فاضلِ باکمال ہی کی طرح عزت و احترام کا معاملہ کرتا تھا۔

ادھر آخری کئی سالوں سے شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند کی اعزازی سرپرستی قبول کر لینے کے بعد، یہاں ان کی آمد و رفت یقینی بن گئی تھی، لیکن مسلسل علالت کے باعث قریباً ڈیڑھ دو سال سے دارالعلوم تشریف نہیں لا سکے تھے۔ ہم اساتذہ کو انتظار ہی رہا کہ وہ اب آئیں گے اور تب، لیکن وہ خود یہاں نہ آ سکے بلکہ عالم جاودان کو چلے جانے کی ان کی خبر آئی اور ہم سبھوں کو اداس و دل فگار کر گئی۔

میدان تحقیق و تصنیف و صحافت میں ان کا شہرہ میرے کانوں میں پڑ چکا تھا اور میرے کان میری آنکھوں سے پہلے ان کے عاشق ہو گئے تھے کہ الأذن تعشق قبل العین

اپیانا۔ بسا اوقات آنکھوں سے پہلے کان عاشق ہو جایا کرتے ہیں۔ ملاقات کے بعد آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اس کے متعلق خدا کو حاضر و ناظر جان کر گواہی دی جا سکتی ہے کہ وہ کانوں کے سنے ہوئے سے فزوں تر تھا اور عربی کے مندرجہ ذیل شہرۂ آفاق اشعار کا مصداق :

لقد کانت محادثۃ الرکبان تخبرنا عن جعفر بن فلاح اطیب الخبر

فلما التقینا فلا واللہ ما سمعت اُذنی باحسن مما قد رأی بصری

یعنی آنے جانے والے قافلوں کے ذریعے جعفر بن فلاح کی مسرت بخش خبریں ملا کرتی تھیں۔ جب ہماری ان سے ملاقات ہوئی تو خدا جانتا ہے کہ کانوں نے (پہلے) اس سے بہتر نہیں سنا جو کہ آنکھوں نے (بعد میں) مشاہدہ کیا۔

لیکن بہت سے " جعفر بن فلاح " ایسے ہیں کہ ان کے متعلق جو کچھ دور سے سنا جاتا ہے قریب کا مشاہدہ اس کی یکسر تکذیب کر دیتا ہے۔

قاضی صاحبؒ کے متعلق میں نے اپنا یہ تاثر بطور خاص اسلئے ریکارڈ کر دیا ہے کہ بعض دفعہ " بڑوں " کے متعلق دور سے سنے ہوئے آوازے سے پیدا شدہ اعتقاد کو قریب کا تجربہ مسمار کر دیتا ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ ان تسمع بالمعیدی خیر من ان تراہ یعنی دور کے ڈھول سہانے ہوا کرتے ہیں۔

قاضی صاحب کو دیکھ کر ان کے چہرے مہرے سے علم و فکر کی بو باس اور انکے خد و خال سے طویل تحقیق و مطالعے کا سراغ مل جاتا تھا۔ اللہ نے انھیں طالب علم پیدا کیا تھا میں جب کبھی یہاں دار العلوم کے مہمان خانے میں انکے کمرے میں داخل ہوا میں نے انھیں کچھ پڑھتے یا کچھ لکھتے ہوئے پایا۔

وہ تکلف، تصنع اور بناوٹ سے پاک تھے، لباس و پوشاک، رہن سہن اور زندگی کے تمام شعبوں میں انھیں تصنع سے نفرت تھی۔ وہ تحریر و تصنیف میں بھی تکلف سے بری تھے، اسی لئے ان کی تحریریں بے ساختگی، سلاست اور روانی تھی وہ عصر حاضر کے قلمکاروں

کی طرح، ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں کی روش پر چل کر معانی سے زیادہ عبارت کی طولانی اور الفاظ کے اسرافِ بیجا اور ان کے نوک پلک درست کرنے پر توجہ نہیں دیتے تھے، بلکہ وہ جو کچھ لکھتے تھے گودا ہی گودا ہوتا چھلکا تلاش کرنے سے بھی نہیں ملتا تھا۔

لوگوں سے ملنے جلنے اور بات چیت میں بھی بے تکلف تھے۔ ان سے پہلی ملاقات بھی پرانی اور بار بار کی ملاقات معلوم ہوتی تھی۔ ہر ملنے والے کو ایسا لگتا کہ برسوں سے ان سے جان پہچان ہے، بلکہ وہ اس کو اسکے بزرگ خاندان یا فرد خاندان محسوس ہوتے۔ اپنی بے ساختہ گفتگو، شیریں کلامی، سادگی، مہر آمیز برتاؤ، شفقت شعاری سے ملنے جلنے والوں کے دل میں گھر کر لیتے تھے۔ وہ علمائے قدیم کی مبارک نسل سے تعلق رکھتے تھے، جن کا شعار قناعت پسندی ہوا کرتا تھا، چنانچہ زندگی کے کسی دور میں مادیت کی دلفریبی نے انھیں مسحور نہیں کیا۔ بمبئی ایسے رنگ دلنور کے شہر اور دولت و ثروت کی ریل پیل والے ماحول میں، بلکہ آسائش حیات کے متلاطم کدہ میں رہ کر بھی اپنے دامن علم کو تر ہونے سے بچائے رکھا اور یکسوئی کے ساتھ تصنیفات کی تیاری اور دوسرے علمی مشاغل میں اپنے کو منہمک کئے رکھا۔ انکی اکثر اہم تصانیف اسی شہر پُرشور کی پیداوار ہیں۔

قاضی صاحب خود فرماتے ہیں ؛

"بمبئی جیسے شہر میں مدت دراز تک رہنے کے باوجود میں بمبئی والا بالکل نہیں بن سکا۔ بڑی بڑی عقیدت مندانہ پیش کش کو شکریے کے ساتھ واپس کر دیا۔ تملق، چاپلوسی اور خوشامد سے نفرت رہی اور مدرسے کی فضا میں جو ذہن و مزاج بنا تھا وہ اس شہر کی رنگینی اور دولت کی نذر نہ ہو سکا اور الحمدللہ کہ میں نے اس شہر کے ایک معمولی کمرے میں بیٹھ کر وہ کام کیا جو بڑی بڑی تنخواہوں پر علمی اور تصنیفی و تالیفی اداروں میں کیا جاتا ہے اور اس نے دولت کمائی جاتی ہے۔" (۱)

---

(۱) حوالۂ سابق ص ۴۶ ۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں :

"تیس سال سے زائد مدت تک بمبئی میں مستقلاً قیام رہا اور جس شہر میں شبلی مرحوم "کنارِ آب چوپاٹی و گل گشت اپالو" کی سیر کرکے غزل کہا کرتے تھے۔ ان کے ایک ہم وطن نے ایک معمولی سے کمرے میں "مرکز علمی" کا بورڈ لگا کر تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری اور مقالہ نویسی کا دورِ شباب گذارا۔ میں نے بڑے بڑے عقیدت مندوں کی عقیدت اور بڑی بڑی پیش کش کرنے والوں کی پیش کش کا شکریہ ادا کر کے شہر کی چمک دمک میں کھو جانے کے مقابلے میں بوریہ نشینی کو ترجیح دی۔ میرے بہی خواہ اور مخلص بزرگ و احباب اس معاملے میں مجھے احمق سمجھتے تھے اور میں کم از کم اس بارے میں اپنے کو عقلمند سمجھتا تھا، بلکہ اب بھی سمجھتا ہوں۔

بمبئی غریب پرور ہونے کے ساتھ ساتھ علم کش شہر ہے جس کا احساس مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی تھا، اسلئے میں نے دولت و ثروت کے اس اندرون قعرِ دریا میں تیس سال سے زائد تختہ بند ہونے کے باوجود اپنے دامنِ علم کو تر نہیں ہونے دیا اور مختلف قسم کی مصروفیات کے باوجود عرب و ہند کے ابتدائی چار سو سالہ تعلقات پر عربی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھ کر ایک بڑے خلا کو پُر کیا۔[1]

اب نئی نسل کو کس طرح سمجھایا جائے کہ قناعت کتنی بڑی دولت ہے اس کے ہوتے ہوئے انسان ہر وقت، ہر جگہ اور ہر حال میں دولتمند ہے اور اس سے عاری ہونے کی صورت میں خزانہ قارون اور دولت فرعون و نمرود کی فراوانی کے باوجود مفلس و بے مایہ ہے۔ عربی کے شاعر نے کتنی سچی بات کہدی ہے۔

---

[1] حوالہ سابق ص ۵۱ - ۵۲

ما کل ما فوق البسیطۃ کافیا　　　فاذا قنعت، فکل شیء کافی

یعنی اگر انسان قناعت پسند ہے تو کوئی بھی چیز اس کے لیے کافی ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر روئے زمین کی تمام چیزیں اس کے لیے ناکافی ہیں۔

قناعت کے ہتھیار کے ذریعے دنیا کے تمام مسائل پر قابو پایا جاسکتا ہے بلکہ قناعت پیشہ افراد کے نزدیک دنیا کا کوئی "مسئلہ" مسئلہ نہیں ہوتا، اسی لیے وہ تمام مسائل اور الجھنوں سے یک سو ہو کر صرف اپنے اپنے عظیم اور شریفانہ مقاصد کو بروئے کار لانے میں جٹ جاتے ہیں اور ایسے ہی افراد کی مساعی جمیلہ کے نتیجے میں انسانی برادری کو سعادت و سرخ روئی اور فلاح و بہبود کی دولت نصیب ہوتی ہے دورِ آخر میں اس کی مثال ہمارے اکابر دیوبند تھے۔ ان کی قناعت کے قلعے کو منعمانِ دہر اپنی کسی کوشش کے ذریعے فتح نہ کر سکے اور ان خدا مستوں کی زبانِ حال، سرخ روئی سے یہ شعر پڑھتی رہی۔

اپنی سی چال چل کے رہے منعمانِ دہر
مٹھی نہ کھل سکی مرے دستِ سوال کی

اسی قناعت پسندی اور فقرِ غیور کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے دارالعلوم دیوبند اور اس کی جدو جہد کی شکل میں، برصغیر میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کی طاقتور تحریک کی بنا اس طور پر استوار کی کہ اس کا شجرۂ طوبیٰ روزِ اول سے تاہنوز سرسبز شاداب ہے اور اور کسی بھی موسم میں برگ و بار لانے میں کوتاہی نہیں کرتا

قاضی صاحبؒ نے قناعت کا درس بچپن ہی سے لینا شروع کر دیا تھا، اپنے گھر میں اور اپنے معاشرے میں جس میں اس وقت لوگ قناعت پسندی و کفایت شعاری اور سادگی کی فطرت پر جنم لیتے تھے اور ان عناصر سے مرکب زندگی جینے میں ایسی راحت و سکون محسوس کرتے تھے جو اسباب و سائلِ زندگی سے بھرے پرے اس دور میں کسی انسان کو نصیب نہیں۔

وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :

"طالب علمی کا پورا دور عسرت اور تنگدستی میں گذرا۔ کھانے پینے اور پہننے میں کفایت شعاری اور سادگی ہی رہی۔ اس وقت آجکل کی طرح معاش ومعیشت میں فراوانی وفراخی نہیں تھی۔ عام طور پر لوگ روکھی پھیکی زندگی کے عادی تھے اسلئے تنگ دستی اور غربت کا احساس نہیں تھا، بلکہ سب لوگ اسی زندگی پر راضی وخوش رہا کرتے تھے۔ اس میں بڑی خیر وبرکت تھی۔ میں بھی ہر معاملے میں اپنے ذوق وشوق کے مطابق سامان مہیا کر لیا کرتا تھا اور کبھی احساس کم تری کا شکار نہیں ہوا" [1]

قاضی صاحبؒ علم کے سچے عاشق تھے، انھیں جھوٹی شہرت اور وقتی ناموری کے بجائے علم میں مشقت آمیز وصبر آزما سفر میں بے پناہ لذت ملتی تھی۔ افسوس ہے کہ نسلِ نو اس لذت سے ناآشنائے محض ہوتی جا رہی ہے، اسی لئے اس کی تحلیقات اور نتائج مطالعہ وتصنیفات میں گہرائی اور دقتِ نظر کا دور دور تک پتہ نہیں، بلکہ سطحیت ہی اسکی شناخت بن گئی ہے اسلئے کہ علم وتحقیق کی راہ میں قاضی صاحب ان کے بعض ہم عصر اور ان کے اکثر پیش رو جس طرح "مکارہ" (ناپسندیدہ چیزیں یعنی مصائب وتکالیف) کو برداشت کرنے، بلکہ انھیں شیریں سمجھنے کے عادی تھے، یہ صفت نسلِ نو میں معدوم ہوگئی ہے اور لگتا ہے کہ ماؤں نے اب سابقہ نسل کے لوگوں کو جننا چھوڑ دیا ہے۔

فروغِ شمع جواب ہے رہے گی رہتی دنیا تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

شمع علم تو جلتی رہے گی لیکن تشویش کی بات یہ ہے کہ ان پر نثار ہونے والے پروانے اب ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔

---

[1] حوالہ سابق ص ۴۴ - ۴۵

علم کے ساتھ ان کے عشق و خلوص کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی کسی کتاب کا ذاتی طور پر نہ تو حقوقِ طبع محفوظ کرایا، نہ ہی معاوضے کی بات کی۔ نہ رائلٹی لی بلکہ خدمت علم کے جذبے سے کتابیں لکھیں اور اسی جذبے سے مختلف ناشرین کو ان کی طباعت و اشاعت کی اجازت دیدی۔ یہ اور بات ہے کہ بعض ناشرین نے (جو کہ عموماً نامعقول اور ناخدا ترس ہوتے ہیں) اپنے لیے "جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں" کے ساتھ انکی کتابیں چھاپیں۔ اس عمومی اجازت کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ حقوق طبع بحق مؤلف محفوظ والی کتابیں عموماً مؤلف کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد نایاب ہو جاتی ہیں، نیز انکے ورثہ کے آپسی اختلاف کی آماجگاہ بن کر اہل علم کیلئے باعثِ اذیت و افسوس بن جاتی ہیں۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی کوئی کتاب اسی لئے نایاب نہیں ہوتی کہ انھوں نے محض خدمتِ دین و علم و عقیدہ و ملت کی خاطر کتابیں لکھیں اور ہر ایک کو چھاپنے کی عام اجازت دے دی۔

سادگی، تواضع، بے تکلفی، قناعت شعاری، ملنساری، شفقت آمیز برتاؤ، نرم خوئی، علمی انہماک مطالعہ و تصنیف میں محویت، دنیا کی لذتوں اور مادیت کے شر سے مکمل آزادی اور شہرت سے نفرت وغیرہ قاضی اطہر صاحب مبارکپوریؒ کی شخصیت کے عناصر ترکیبی تھے۔

قاضی صاحب، میانہ قد، قدرے کشادہ جبین، متوازن جسم گندم گوں رنگ، گھنی داڑھی والے قوی الحافظہ، ذہین اور اپنے ملنے جلنے والوں کو بہت دنوں تک یاد رکھنے والے آدمی تھے۔ کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے شروع ہی میں بینائی کمزور ہو گئی تھی، اسلئے بہت پاور کا موٹے شیشے والا چشمہ استعمال کرتے تھے۔ نہایت خوددار آدمی تھے، زندگی اور انسانوں سے بہت پرامید رہا کرتے تھے۔ وقت کے قدرداں تھے، جو ایک سچے خادمِ علم کا ممتاز خاصہ ہوا کرتا ہے۔ دنیوی غموں سے آزاد علمی مشاغل کے غلام تھے۔ ترفع اور خود پسندی سے کوئی مناسبت نہ تھی البتہ خود سازی پر انکی توجہ ہمیشہ مرکوز رہی۔ بہت سے اہل علم و قلم کی طرح اپنی تعریف آپ کرنے کے عادی نہ تھے اور نہ ہی دوسروں کو حقیر یا کم رتبہ سمجھتے تھے۔ دوسروں سے بات چیت کرتے وقت پرسکون رہتے۔ طلبا و اہل علم سے بیحد محبت کرتے اور متکبروں اور انانیت شعاروں سے حد سے زیادہ نفرت کرتے تھے خواہ وہ کسی قد و قامت کے ہوں۔

قاضی ظفر مسعود ابن قاضی اطہر مبارکپوری

قاضی صاحب کے علمی کارناموں کی مکمل فہرست

ہر شخص کی زندگی کے سفر میں نشیب و فراز آتے ہیں، مشکلات و مصائب کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے، صحت و فراغ کے سکون بخش اوقات بھی آتے ہیں، شدائد کے خارزاروں سے گذرنے کے بعد گلپوشی اور معطر وادیاں بھی ملتی ہیں، زندگی حالات کے اسی تصادم کا نام ہے، زندگی کے اسی خارستان میں وہ عظیم شخصیتیں اپنے کارنامے انجام دیتی ہیں، لوگ ان شخصیتوں کے حالاتِ زندگی بھول جاتے ہیں کیونکہ ہر ایک کے سامنے اس کے تجربات و مشاہدات ہوتے ہیں، شخصیتیں اپنے کارناموں سے زندہ رہتی ہیں اور لوگ صدیوں یاد رکھتے ہیں، قاضی صاحب کے سلسلہ میں بھی ہمارا یہی خیال ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں کتنے ہی نامساعد حالات کا سامنا کیا ہو لوگ اس کو بھول جائیں گے لیکن ان کے علمی و تحقیقی کارناموں کو علمی دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی، اسی لئے ہم قاضی صاحب کے تمام علمی کارناموں کی مکمل اور جامع فہرست علیحدہ سے شائع کر رہے ہیں اس فہرست میں قاضی صاحب کی تمام اُردو اور عربی تصنیفات کے علاوہ جن زبانوں میں دوسروں نے ان کے ترجمے کئے اور جن اداروں نے اپنے طور پر شائع کیا اور جن مخطوطات کی تصحیح و تحقیق کی ان پر تعلیقات لکھیں یا ان

کتابوں کے مسودے جو حوادث کا شکار ہو گئے اور شائع نہ ہو سکے ہر ایک کی نشاندہی کر دی گئی ہے یہ فہرست اتنی مکمل اور جامع ہے کہ آئندہ قاضی صاحب کے کارناموں پر تحقیق اور ریسرچ کرنے والوں کیلئے بہترین رہنما ثابت ہوگی، یہ فہرست قاضی صاحب کے صاحبزادے عزیزم قاضی ظفر مسعود سلمہٗ نے تمام کتابوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی ہے۔ ہم ان کے شکریہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔

اسیر ادروی

(۱) عرب و ہند عہد رسالت میں (اردو)

یہ کتاب ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، ۱۹۶۵ء میں اس کا پہلا ایڈیشن ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا، اس کو مصر کے ایک مشہور عالم الدکتور عبد العزیز عزت عبد الجلیل نے عربی میں ترجمہ کیا اور ۱۹۷۳ء میں الہیئۃ المصریہ قاہرہ نے اس کو شائع کیا، سندھ (پاکستان) کی تنظیم فکر و نظر نے اس کا سندھی زبان میں ترجمہ کر کے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا، کراچی کے ایک ادارہ مکتبہ عارفین نے اس کا ایڈیشن شائع کیا۔

(۲) ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں (اردو)

یہ کتاب ۳۴۰ صفحات پر مشتمل ہے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۷ء ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا، اس کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ عارفین کراچی نے شائع کیا، تنظیم فکر و نظر سندھ پاکستان نے اس کا ایک اور ایڈیشن شائع کیا، مصر کے دکتور عبد العزیز عزت عبد الجلیل نے اس کا عربی میں الحکومات العربیۃ فی الہند والسند کے نام سے کیا

اور اس کو اسلام آباد یونیورسٹی پاکستان کے مجلہ الدراسات العلمیۃ نے قسط وار شائع کیا، پھر مکتبہ آل یہ اللہ بکر یہ ریاض نے اس کو کتابی شکل میں شائع کیا۔

(۳) اسلامی ہند کی عظمت رفتہ (اردو)

یہ کتاب ۲۴۳ صفحات پر مشتمل ہے، ندوۃ المصنفین دہلی نے اس کو ۱۹۶۹ء میں شائع کیا۔

(۴) خلافت راشدہ اور ہندوستان (اردو)

یہ کتاب ۲۸۰ صفحات پر مشتمل ہے ۱۹۷۲ء میں ندوۃ المصنفین دہلی نے اس کو شائع کیا بعد میں تنظیم فکر و نظر سندھ پاکستان نے اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا۔

(۵) خلافت عباسیہ اور ہندوستان (اردو)

یہ کتاب ۵۵۸ صفحات پر مشتمل ہے اس کا پہلا ایڈیشن دہلی سے ندوۃ المصنفین دہلی نے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا دوبارہ تنظیم فکر و نظر سندھ (پاکستان) نے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔

(۶) خلافت بنو امیہ اور ہندوستان (اردو)

یہ کتاب ۴۷۱ صفحات پر مشتمل ہے، ندوۃ المصنفین دہلی نے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء میں دہلی سے شائع کیا پھر تنظیم فکر و نظر سندھ (پاکستان) نے اپنے یہاں اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا۔

(۷) دیار یورپ میں علم اور علماء (اُردو)

یہ کتاب ۴۰۵ صفحات پر مشتمل ہے جس میں مشرقی ہندوستان میں علمی سرگرمیوں کا محققانہ تذکرہ ہے اس کو بھی ندوۃ المصنفین دہلی نے پہلی بار ۱۹۷۹ء میں شائع کیا۔

(۸) تذکرہ علماء مبارکپور (اُردو)

کتاب ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے اسکو دائرہ ملیہ مبارکپور نے ۱۹۷۴ء میں شائع کیا۔

(۹) مآثر و معارف (اُردو)

یہ کتاب ۲۷۱ صفحات پر مشتمل ہے ۱۹۷۰ء میں اسکو ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا۔

(۱۰) آثار و اخبار (اُردو)

یہ کتاب ۱۵۰ صفحات پر مشتمل ہے یہ قاضی صاحب کے کچھ مقالات کا مجموعہ ہے جو بڑے اہتمام سے چھاپا گیا ہے ندوۃ المصنفین دہلی نے اسکو ۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔

(۱۱) تدوین سیر و مغازی (اُردو)

یہ کتاب ۲۴۰ صفحات پر مشتمل ہے اپنے موضوع پر اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو علم و تحقیق کا شاہکار ہے اس کو شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند نے ۱۹۸۰ء میں شائع کیا ہے۔

(۱۲) خیر القرون کی درسگاہیں (اردو)

کتاب کا پورا نام خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظام تعلیم و تربیت ہے
یہ کتاب ۲۹۲ صفحات پر مشتمل ہے اور سنہ ۱۹۹۵ء میں شیخ الہند اکیڈمی دیوبند
نے اس کو شائع کیا ہے۔

(۱۳) ائمہ اربعہ (اردو)

کتاب ۱۵۵ صفحات پر مشتمل ہے جس کو شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے سنہ ۱۹۹۶ء
میں اہتمام سے طبع کرا کے شائع کیا ہے اس کا پہلا ایڈیشن مکتبہ تنظیم اہلسنت لاہور
نے سنہ ۱۹۴۶ء میں شائع کیا تھا۔

(۱۴) بنات اسلام کی علمی و دینی خدمات (اردو)

یہ کتاب خواتین اسلام کی دینی وعلمی خدمات پر روشنی ڈالتی ہے اس کو بمبئی
کے مشہور مکتبہ شرف الدین الکتبی و اولادہ نے شائع کیا تھا دوبارہ اسکو دائرہ ملیہ
مبارکپور کی طرف سے بھی شائع کیا گیا۔

(۱۵) اسلامی نظام زندگی (اردو)

کتاب ۱۵۶ صفحات پر مشتمل ہے اسکو الحاج عبداللہ سمکری ابن حاجی احمد کی
نے رفاہ عام کیلئے اپنی طرف سے سنہ ۱۹۹۰ء شائع کیا تھا۔

(۱۶) افادات حسن بصری (اردو)

یہ ۵۶ صفحات کا کتابچہ ہے جسکو دائرہ ملیہ مبارکپور نے سنہ ۱۹۵۰ء میں شائع کیا تھا۔

(۱۷) مسلمان (اُردو)

یہ بھی ایک کتابچہ ہے جو ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے جس کو جمعیۃ المسلمین جنجیرہ بمبئی نے ۱۹۵۳ء میں شائع کیا تھا۔

(۱۸) الصالحات (اُردو)

یہ بھی ۶۴ صفحات کا کتابچہ ہے جو خاص طور پر خواتین کیلئے لکھا گیا تھا یہ پہلی بار بمبئی سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا دوبارہ انصار ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر اکیڈمی نے ۱۹۶۶ء میں شائع کیا۔

(۱۹) تبلیغی وتعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں (اُردو)

یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جو صرف ۳۵ صفحات کا ہے اس کو ۱۹۸۵ء میں مکتبۃ الحق جوگیشوری بمبئی نے شائع کیا تھا دوبارہ شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا۔

(۲۰) اسلامی شادی (اُردو)

یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جو صرف ۳۵ صفحات کا ہے اس کو ۱۹۸۵ء میں مکتبۃ الحق جوگیشوری بمبئی نے شائع کیا تھا دوبارہ شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا۔

(۲۱) معارف القرآن (اُردو)

یہ ۱۵۰ صفحات کی کتاب ہے جسکو ایجنسی تاج کمپنی بمبئی نے ۱۹۵۶ء میں شائع کیا تھا۔

(۲۲) طبقات الحجاج (اُردو)

یہ ۱۹۵ صفحات کی کتاب ہے جس کو انجمن خدام النبی صابوصدیق مسافرخانہ بمبئی نے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا تھا۔

(۲۳) علی وحسین (اُردو)

یہ چھوٹے سائز کے ۲۳۶ صفحات پر مشتمل ہے ایک کتاب کی تاریخی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے اس کو ۱۹۶۰ء میں مکتبہ دائرہ ملیہ مبارکپور نے شائع کیا تھا۔

(۲۴) حج کے بعد (اُردو)

یہ مختصر سا رسالہ ہے جو ۴۰ صفحات کا ہے، انجمن خدام النبی بمبئی نے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا تھا۔

(۲۵) خواتین اسلام کی علمی ودینی خدمات (اُردو)

یہ کتاب پہلے بنات اسلام کی علمی ودینی خدمات کے نام سے شائع ہو چکی تھی بعد میں کچھ حک واضافہ کے بعد اسکو شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے شائع کیا۔ کتاب میں مزید معلومات کا اضافہ ہے۔

(۲۶) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک (اُردو)

یہ قاضی صاحب کی خودنوشت نہایت مختصر آپ بیتی ہے، پہلے اسکو دائرہ ملیہ مبارکپور نے شائع کیا تھا پھر اسکو مکتبہ صوت القرآن دیوبند نے دوسرا ایڈیشن صاف ستھرا شائع کیا، اسکے صفحات ۵۶ ہیں۔

(۲۷) رجال السند والہند (الی القرن السابع (عربی)

یہ کتاب عربی زبان میں ہے جو پہلے ۱۹۵۸ء میں ۳۲۸ صفحات میں محمد احمد میمن برادران بمبئی نے مطبع حجازیہ سے شائع کیا تھا، پھر اس کتاب میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا اور ۱۹۷۸ء میں دارالانصار قاہرہ (مصر) نے دو جلدوں میں ۵۰۰ صفحات میں شائع کیا، آج وہی ایڈیشن حجاز و مصر اور پاکستان میں دستیاب ہے، پہلا ایڈیشن اب ناپید ہے، اس کتاب کو اہل علم نے بڑی اہمیت دی ہے یہی کتاب مصر و حجاز میں قاضی صاحب کے تعارف کا اولین ذریعہ بنی۔

(۲۸) العقد الثمین (عربی)

کتاب کا پورا نام العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین ہے پہلی بار ۱۹۶۸ء میں بنام مولوی محمد بن غلام رسول سورتی بمبئی نے ۳۲۵ صفحات میں شائع کیا تھا دوسری بار یہی کتاب دارالانصار قاہرہ (مصر) سے ۲۳۱ صفحات میں شائع ہوئی۔

(۲۹) الہند فی عہد العباسیین (عربی)

یہ کتاب صرف ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے اس کو بھی دارالانصار قاہرہ نے ۱۹۷۹ء میں شائع کیا۔

(۳۰) جواہر الاصول (عربی)

کتاب کا پورا نام جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول ہے۔
اس کے مصنف ابو الفیض محمد بن محمد بن علی حنفی فارسی ہیں یہ کتاب طبع نہیں ہوئی تھی

اس کا مخطوطہ قاضی صاحب کو بعض ذرائع سے دستیاب ہوا تو آپ نے اس مخطوطہ کی تصحیح اور تحقیق کی اور بہت مفید تعلیقات لکھیں اس کا پہلا ایڈیشن شرف الدین الکتبی و اولادہ بمبئی نے ۱۹۷۲ء میں شائع کیا تھا جو ۱۹۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن الدار السلفیہ بمبئی نے شائع کیا، جب یہ کتاب حجاز پہونچی تو اس کا ایک خوبصورت ایڈیشن مکتبہ علمیہ مدینہ منورہ نے اہتمام سے شائع کیا اور حجاز میں عام کیا۔

(۳۱) تاریخ اسماء الثقات (عربی)

یہ کتاب ابن شاہین بغدادی کی تصنیف ہے اور طبع نہیں ہوئی تھی اس کا ایک مخطوطہ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانے میں تھا جس سے قاضی صاحب نے نقل لی تھی، استاذی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن محدث الاعظمی نے دیکھا تو قاضی صاحب سے مانگ لیا پھر دوبارہ نقل کر کے اس کی تصحیح، تحقیق کی اور اس پر تعلیقات لکھیں ۱۹۸۶ء میں شرف الدین الکتبی و اولادہ بمبئی نے اس کو شائع کر دیا یہ کتاب ۲۲۵ صفحات پر مشتمل ہے اس کی ابتدا میں قاضی صاحب نے ایک پرمغز مقدمہ لکھا، شاید محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کی تحقیق فرمائی ہے اور شاید ابھی تک کتاب طبع نہیں ہوئی ہے۔

(۳۲) دیوان احمد (عربی)

یہ قاضی صاحب کے جد مادری مولانا احمد حسین صاحب رسولپوری کی عربی نظموں کا مجموعہ ہے جس کو مرتب مدون کر کے ۱۹۵۵ء میں شائع کیا ہے۔

غیر مطبوعہ کتابیں

(۳۳) مسلمانوں کے ہر طبقے میں علم و علماء (اُردو)

یہ مسودہ تقریباً ۰۰ ۲ صفحات میں آئے گا کتاب مکمل ہے اور اس پر مقدمہ بھی قاضی صاحب کے قلم سے ہے ۔

(۳۴) مئے طہور (اُردو)

قاضی صاحب کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ جو مئے طہور کے نام سے مرتب کر کے اس پر مقدمہ لکھ چکے تھے مگر پریس کو نہیں دے سکے ۔

اس کے علاوہ "سیرت رسول خود حضور کی زبانی" کے عنوان سے مواد جمع کر رہے تھے، اموی خلفاء و امراء اللہ تدوین حدیث کے موضوع پر بھی معلومات جمع کر رہے تھے یہ تمام مسودے نا مکمل ہیں قاضی صاحب نے قیام لاہور کے زمانہ میں منتخب التفاسیر کے نام سے ایک تفسیر مرتب کی تھی لیکن طبع نہ ہو سکی، علماء اسلام کی خونین داستانیں کے نام سے ایک ضخیم کتاب مرتب کر کے دانش بکڈپو لاہور کو دی تھی، مذکورہ دونوں کتابیں تقسیم ملک کی نذر ہو گئیں ۔

مجلہ
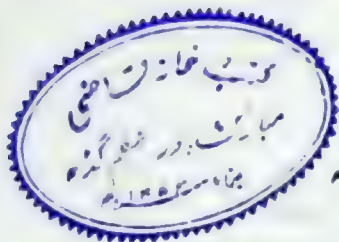
ترجمان الاسلام

(۳۰)

اپریل، مئی، جون ۱۹۹۷ء

سرپرست

عالیجناب محترم حافظ عبدالکبیر صاحب

مدیر اعلیٰ

ابوالقاسم نعمانی

مدیر

اسیر ادروی

شعبۂ نشر و اشاعت

جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس ۲۲۱۰۱۰

فون - ۴۲۲۱۸۴

○ دائرے میں سرخ نشان مدت خریداری کے ختم ہونے کی علامت ہے۔

زرِ سالانہ ارسال فرمائیں۔

فہرست مضامین

زر سالانہ	ــــــــ	۶۰ روپے
معاون خصوصی	ــــــــ	۱۰۰ روپے
فی شمارہ	ــــــــ	۱۵ روپے

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی ــــــــــ صدر شعبۂ عربی کالی کٹ یونیورسٹی کیرالا

العقد الثمین پر ایک نظر

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے عرب و ہند تعلقات جیسی عالمانہ و محققانہ کتاب لکھ کر اردو ادب میں ایک تاریخی و علمی روایت قائم کردی۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے اس روایت کو آگے بڑھایا اور ان تمام پہلوؤں کو اپنی تحقیق میں شامل کرلیا جو حضرت سید صاحب کی کتاب میں شامل نہ تھے کہ تاریخ کا موضوع نہایت وسیع ہے یوں تو قاضی صاحب نے بہت سی کتابیں اس موضوع پر تصنیف کی ہیں اور عمر کا اور تحقیق کا بڑا حصہ اسی پر صرف کردیا ہے مگر میں اس وقت ان کی کتابوں میں عظمت کے چند پہلو پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ

اس کتاب کی سب سے اہم خوبی اس کا جامع ہونا ہے، قاضی صاحب نے ان تمام صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور معاصرین تابعین کا ذکر کیا ہے اور ہر شخص کے بارے میں تحقیق کی ہے کہ وہ صحابی ہیں یا تابعی یا تبع تابعی میں سے کسی گروہ میں ہے۔ اگر وہ تابعین کا معاصر ہے تو اس کی بھی تصریح نام کے ساتھ کردی ہے۔ قاضی صاحب نے شہداء کا ذکر بھی کیا ہے اور ان امراء کا بھی تذکرہ کیا جو عرب سے سندھ آئے وہاں حکومت کی اور وہیں وفات پائی یا واپس وطن چلے گئے۔

بہ ظاہر تو معلوم ہوتا ہے کہ قاضی اطہر مبارکپوری نے صحابہ تابعین اور تبع تابعین کے حالات کتابوں سے جمع کردیئے ہیں مگر معاملہ اتنا آسان نہیں ہے، یہ معلوم کرنا ہے کہ کون صحابی ہے اور کون صحابی نہیں ہے۔ کون تابعی ہے اور کون معاصر تابعی ہے۔ کس کی شہادت سندھ میں ہوئی اور کون غازی بن کر اپنے

دین واپس گیا، پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھیے کہ ۲۰۰ برس عربوں نے سندھ پر حکومت کی۔ علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں کہ اسماعیل حکومتیں ۲۰۰ برس تک مزید باقی رہیں اس طرح عربوں کی حکومت ایک حیثیت سے ۵۰۰ ہو جاتی ہے اس طویل عرصہ میں کتنی فوجیں آئیں اور کتنی جنگیں ہوئیں۔ مگر چونکہ قاضی صاحب کے لئے تو پہلے ۲۰۰ برس کافی ہیں کہ اس سے پہلے ہی صحابہ و تابعین کا دور ختم ہو جاتا ہے مگر تبع تابعین کا دور کچھ زیادہ ہے۔

قاضی صاحب نے اس کتاب کی تالیف کا ایک طریقہ اور نہج مقرر کر لیا ہے وہ پہلے تاریخ کی بنیادی کتابوں سے اور اصل مصادر سے مواد اخذ فرماتے ہیں پھر ان کو ایک جا کرتے ہیں۔ اگر ان بکھرے ہوئے مواد میں کہیں تناقض، تضاد، ابہام اور تعقید ہوتی ہے تو آخر میں وہ ایک نوٹ لکھتے ہیں اس نوٹ کا طریقہ بڑا دلکش ہے۔ وہ ہر بات کے آخر میں ایک نوٹ اس نام سے لگاتے ہیں: "قال القاضی"۔ پہلے تو میں حیران ہوا کہ کون قاضی صاحب ہیں جو ہر مسئلہ پر کچھ نہ کچھ ارشاد فرماتے ہیں اور شبہ ہوا کہ شاید قاضی عیاض یا دوسرے قاضی سے وہ یہ اقوال نقل کرتے ہیں مگر بہت جلد کتاب کے مطالعہ سے بات واضح ہو گئی کہ یہ خود حضرت قاضی اطہر صاحب کا محاکمہ ہے۔ وہ بطور قول فیصل خود بحث کرتے ہیں جو ابہام وارد ہوتا ہے اس کی وضاحت فرماتے ہیں جو غموض ہوتا ہے اس کو جلی و صفی کر دیتے ہیں اور جو شبہات واقعات، اشخاص اور معاصرین کے بارے میں ذہن میں ابھرتے ہیں ان کی تصحیح و توضیح بھی کر دیتے ہیں۔

قاضی صاحب نے "قال القاضی" نوٹ لکھ کر درحقیقت اپنے انداز تحقیق اپنے علم کی گہرائی و عظمت، اپنے تاریخی فہم کی وسعت اور وسیع و عمیق انداز بحث کا مظاہرہ کیا ہے جس سے ان کی تاریخ پر نظر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نوٹ ہر صحابی اور تابعی پر نہیں ہے اس طرز کی توضیحات

وہیں ہیں جہاں ابہام ہے یا کسی صحابی کے بارے میں کوئی شبہ پیدا ہوتا ہے اس وقت "قال القاضی" کے ذریعہ قاضی صاحب تفہیم امر کے لئے یہ نوٹ لگا دیتے ہیں۔ اس طرح ایک طرف تاریخی بیانات میں خود دخل نہیں دیتے بلکہ ترتیب کے ساتھ کتابوں سے صحابی یا تابعی کا ذکر کر دیتے ہیں پھر آخر میں بحیثیت مورخ و محقق اپنا فرض ادا کرتے ہیں اور تحقیقی نوٹ لکھتے ہیں ان مذکرات نے کتاب کی قدر و قیمت اور عظمت میں اضافہ کر دیا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ علمار عام طور سے اپنی کتابوں کے نام مقفیٰ رکھتے ہیں قاضی صاحب کا ذہن اس امر میں صاف نہ تھا کتاب کے انھوں نے دو نام رکھے پہلا نام ہے الفتوحات الاسلامیة فی الهند مگر چونکہ اس نام سے اصل حقیقت مخفی رہ جاتی تھی یعنی ان صحابہ و تابعین و تبع تابعین کا ذکر جو عرب سے جہاد کرنے سندھ آئے اور اکثر تو اسی زمین کے پیوند بن گئے۔ لہٰذا اس نام میں "یا" لگا کر اضافہ فرمایا اور دوسرا نام رکھا جو اصل توضیح ہے اس موضوع کی جس پر یہ کتاب لکھی گئی ہے اسلئے کہ کتاب کا موضوع فتوحات اسلامیہ فی الہند نہیں ہے بلکہ فتوحات کا ذکر کسی صحابی کے ذکر کا حصہ ہے۔ مقصود فتوحات کا بیان نہیں ہے بلکہ مقصود کسی صحابی یا تابعی کی زندگی اور اس کی سندھ کی طرف ہجرت ہے جہاد کے لئے اور توطن کے لئے اسلئے پہلا نام مبہم ہے اور غلط فہمی پیدا کرتا ہے مگر دوسرا نام۔ العقد الثمین فی فتوح الهند ومن ورد فیها من الصحابة والتابعین۔ اس نام میں فتوح الہند کا ذکر بھی ہو گیا اور اصل مقصد بھی واضح ہو گیا لہٰذا پہلا نام صرف حشو ہے اس کو نکال دینا ہی بہتر ہے کہ وہ اصل حقیقت نہیں ہے بلکہ اس کا ایک جزر ہے پھر نام مقفیٰ رکھا گیا ہے یہ علمار کی عادت اور روایت ہے کہ وہ کتابوں کے نام مقفیٰ رکھتے ہیں کبھی کبھی تو نام اور موضوع میں قافیہ کے باعث تفاوت

پیدا ہو جاتا ہے مگر موجودہ نام مناسب ہے اور موضوع سے متعلق ہے۔
اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ قاضی اطہر مبارکپوری نے
اس میں جن اشخاص کا ذکر کیا ہے ان کے بارے میں محدثانہ جرح سے کام
لیا ہے یعنی اگر کسی تابعی یا تبع تابعی یا کسی راوی پر علم حدیث کی روشنی میں
علمائے جرح و تعدیل نے کلام کیا ہے اور اس کو مجروح قرار دیا ہے تو قاضی
صاحب نے اس بحث کا استقصی کر کے اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے۔
اس طرح متعدد اشخاص پر محدثانہ بحثوں کے باعث بحیثیت راویٔ حدیث
ان کی حیثیت کا تعین کر دیا ہے۔ اس طرح تاریخ کی عظمت کے ساتھ قاضی
صاحب نے حدیث کی صداقت، علم جرح و تعدیل کے استعمال کی قوت و قدرت
اور ہر شخص کے اعمال و اخلاق کا بھی ایک ایسا نقشہ پیش کر دیا ہے جو صحیح ہے
یا اقرب الی الصحۃ ہے۔ قارئین تصور کر سکتے ہیں کہ ہر راوی کو علم اسماء الرجال
کی کتابوں کی مدد سے تلاش کرنا اور اس کی صحیح کیفیت کا پتہ لگانا اور محدثین
کے اعلیٰ اصولوں پر ان کو پرکھنا یہ حضرت قاضی صاحب کی محنت و ہمت تھی کہ
وہ اتنا بڑا کام کر دیا اور اکثر راویوں کا صحیح مقام متعین کر دیا۔ اگر راوی
کذاب اور منکر الحدیث ہے تو پوری جرأت سے اس کو بھی نمایاں کر دیا ہے
بلکہ میں تو کہوں گا کہ قاضی صاحب کو جو مہارت علم حدیث پر تھی اس کا اظہار
انھوں نے اس کتاب میں پوری طرح کیا ہے۔ ذیل میں
میں مثال کے طور پر محمد بن غزان کلبی کا حال نقل کرتا ہوں۔ بجائے
وہی عبارت نقل کرنے کے میں ترجمہ پیش کرتا ہوں ورنہ مقالہ طویل ہو جائیگا
عنوان ہے۔ محمد بن غزان الکلبی
من اتباع التابعین، ورد السند
اسی انداز پر قاضی صاحب نے تمام اشخاص کے بارے میں عناوین

قائم کیے ہیں جن سے ان کی شخصیت واضح ہو جاتی ہے۔

قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ ابن حجر نے لسان المیزان میں لکھا ہے کہ محمد بن غزان امام اوزاعی وغیرہ سے روایت کرتے ہیں۔ ابوزرعہ نے کہا کہ وہ منکر الحدیث ہیں۔ ابن حبان نے کہا کہ وہ حدیثوں کو الٹ پلٹ دیتے ہیں اور موقوف حدیث کو موضوع بنا دیتے۔ ان سے احتجاج کرنا یعنی حجت کرنا صحیح نہیں ہے۔ محمد نے عمر بن محمد سے انھوں نے سالم سے سالم نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ (جو کہ مرفوع ہے یعنی آنحضرت تک پہونچتی ہے) کہ جس نے چھ رکعتیں مغرب بعد پڑھیں اس کے پچاس برس کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ یہی محمد بن غزان امام اوزاعی سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے یحیٰی سے یحیٰی نے ابوسلمٰی سے ابوسلمہ نے حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ سمندر کا پانی تو وہ پاک ہے اور اس کے اندر مرنے والے جانور بھی حلال ہیں۔ ابن حسین رازی نے فرمایا کہ محمد بن غزان کی روایت سمندر کے بارے میں منکر ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ محمد نے اہلبیت کی تعریف اپنا مقصد بنا لیا ہے۔ ابوزرعہ ۶ رکعات والی حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ موضوع سے مشابہ ہے۔

اس محدثانہ بحث کے بعد قاضی صاحب تاریخ طبری ۱۳۶ھ کے واقعات سے وہ حصہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں جس کا تعلق تاریخ سندھ سے ہے اور تاریخی دستاویز کے طور پر خود محمد بن غزان کلبی کا ذکر اہم ہے کہ وہ خود سندھ کا گورنر بھی رہ چکا ہے، لہذا قاضی صاحب اب محمد بن غزان کے حالات طبری سے بیان فرماتے ہیں۔ طبری میں وارد ہوا ہے کہ عمر بن شجرہ نے بیان کیا کہ عمرو بن محمد بن قاسم سندھ پر تھے (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی علاقہ کے مالک بھی تھے ورنہ کان عمرو بن محمد بن قاسم علی السندھ نہ ہونا چاہئے تھا فی السند لکھا

چاہیے تھا۔) تو محمد بن غزان کلبی نے ان کو مارا اور ان کو یوسف بن خالد قسری کے پاس روانہ کردیا۔ عراق کو۔ اس نے بھی عمرو بن محمد بن قاسم کی پٹائی کی اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ عظیم مال حکومت کو واپس کریں (اور اس کا حساب دیں) جو ان کے پاس تھا اگر ایسا نہ کر سکیں تو ۲۵ دُرّے ان پر پڑیں گے۔ چنانچہ ان پر اتنی مار پڑی کہ ان کا ہاتھ سوکھ گیا اور انگلیاں بھی سوکھ گئیں۔ جب ولی بن جمہور عراق کا حاکم بنا تو اس نے محمد بن غزان کو سندھ اور سجستان کا گورنر بنادیا وہ سجستان آیا اور وہاں یزید کی بیعت لی۔ پھر سندھ گیا اور عمرو بن محمد کو گرفتار کرلیا اور ان پر محافظین کو مقرر کردیا (تاکہ بھاگ نہ سکیں) اور خود نماز پڑھنے لگا اس اثنار میں عمرو بن محمد بن قاسم نے ایک سپاہی سے جو ان کی حفاظت کے لئے کھڑا تھا ایک کھلی ہوئی تلوار لی اور خود اپنے پیٹ میں گھونپ لی وہ پیٹ کو پار کر گئی۔ لوگوں نے شور مچایا۔ محمد بن غزان نکلے اور انھوں نے عمرو سے دریافت کیا کہ یہ حرکت تم نے کیوں کی؟ انھوں نے جواب دیا اس خوف سے کہ تم عذاب دوگے (نتیجہ اس کا بھی موت ہوتا) محمد بن غزان نے کہا مگر اتنا بڑا عذاب تم کو نہیں دے سکتا تھا جتنا تم نے خود اپنے کو دیا پھر تین دن اس اذیت میں مبتلا رہ کر انھوں نے انتقال کیا۔

قالَ القاضی: اب قاضی اطہر مبارکپوری مذکورہ واقعات پر تبصرہ فرماتے ہیں اور ابہام کی توضیح فرماتے ہیں کہ ۱۲۶ھ میں یزید بن عبدالملک نے منصور بن جمہور کو عراق کا والی مقرر کیا۔ پھر اسی سنہ میں اس کو معزول بھی کردیا۔ اس لئے کہ وہ فتنہ برپا کرتا تھا۔ مروان بن حکم کے زمانہ میں محمد بن غزان سندھ آیا تھا ۱۳۰ھ میں۔ پھر ۱۳۶ھ میں وہ سندھ کے حاکم مقرر ہوا۔ تب انھوں نے عمرو بن محمد بن قاسم کو گرفتار کیا عمرو اُس وقت امیر نہ تھے بلکہ سندھ میں رہتے تھے اور وہاں موجود تھے۔ (۱)

---

(۱) العقد الثمین مطبوعہ ۱۹۲۰ء ناشر ابنائے مولوی محمد بن غلام رسول سورتی جالی محلہ بمبئی ص ۲۸۰ تا ۲۸۲

حضرت قاضی صاحب کو اس میں کچھ تردد ہے اس لئے خود آگے چل کر یہ قول نقل کرتے ہیں " وکان عمرو بن محمد بن القاسم بالسند وکان قبله امیرًا علی السند " یعنی عمرو بن محمد بن قاسم پہلے سندھ پر امیر تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم کے صاحبزادے عمرو بن محمد بن قاسم سندھ کے امیر تھے جس کا اشارہ علی سے ہوتا ہے پھر جو مال کا حساب ان سے طلب کیا گیا یہ بھی اشارہ اس طرف ہے کہ وہ حساب امیر ہی سے طلب کیا جاتا ہے یہ سنت سیۂ نعمان بن عبدالملک نے نکالی تھی کہ ان عظیم قائدین سے حساب طلب کیا اور اس بہانے سے محمد بن قاسم اور دوسرے قواد کو مار مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا جنھوں نے سارے عالم میں اسلام کا جھنڈا گاڑا تھا۔

قاضی صاحب نے حوالے پابندی سے دیئے ہیں، مگر انھوں نے حوالے کا اپنا ایک طریقہ اپنایا ہے کہ وہ ایک ہی واقعہ کے کئی کئی حوالے دیتے ہیں اور عموماً آخر کلام میں چنانچہ محمد بن غزان کلبی کے ذکر میں انھوں نے تاریخ طبری جلد ۷ ص ۲۷۲ اور لسان المیزان جلد ۵ ص ۳۳۸ کا حوالہ دیا ہے۔ اور خود دوران بحث یہ لکھ دیا ہے لسان المیزان میں ابن حجر کہتے ہیں اور تاریخ طبری میں یہ مرقوم ہے۔ اس طرح قاضی صاحب نے اپنے بیانات کو علمی عظمت عطا کر دی ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ تاریخ کے اجالے اور معروف تاریخی نصوص کی روشنی میں لکھا ہے۔ پھر اسماء الرجال کی کتابوں سے مدد لے کر انھوں نے کتاب کو زیادہ ثقہ بنا دیا ہے۔ مثلاً جو بات بطور مثال میں لے پیش کیا محمد بن غزان اس کے بارے میں علماء جرح و تعدیل نے صاف لکھ دیا ہے کہ وہ راوی ثقہ نہ تھا اور علماء اس کو منکر الحدیث تصور کرتے تھے اور دو حدیثیں بھی اس کی نقل کر دیں۔ مگر تقویٰ ملاحظہ فرمائیے کہ خود مبارک پوری صاحب نے اس کو اپنے قلم سے کہیں کذاب کا لفظ نہیں لکھا۔ قاضی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ غزان کے

علاوہ بعض جگہ اس کا نام غزلان بھی وارد ہوا ہے مگر خود انھوں نے غزان ہی لکھا ہے۔ میرے اس نصل کو پیش کرنے میں یہ مصلحت بھی ہے کہ اس کا تعلق مشہور قائد اور فاتح اسلام محمد بن قاسم سے ہے جس سے ہم ہندوستانیوں کو ایک ذہنی اور دینی لگاؤ و تعلق محسوس ہوتا ہے۔ اس باب میں ان کے صاحبزادے عمرو بن محمد بن قاسم کا ذکر ہے۔

ایک نصل میں قاضی اطہر مبارکپوری رقمطراز ہیں کہ حضرت عائشہ نے ایک لونڈی خریدی اس نے ان پر سحر کر دیا حضرت عائشہ کے بھتیجے ایک جاٹ (زط) طبیب بلالائے۔ اس نے بتایا اسی لونڈی نے حضرت عائشہ پر سحر کیا ہے۔ لونڈی نے بھی اس امر کو تسلیم کیا لہٰذا وہ بیچ دی گئی۔

قال القاضی کے عنوان سے حضرت مبارکپوری صاحب تبصرہ فرماتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ زیادہ امکان اس امر کا ہے کہ اس جاٹ طبیب نے آنحضرت کا زمانہ پایا ہے ان کی زندگی میں یا ان کے بعد اسلام لایا ہو وہ بود و باش مدینہ میں رکھتا تھا۔ (العقد الثمین جلد ۲۳)

قاضی صاحب نے حضرت عائشہ کے مسحور ہونے کا حوالہ کتاب الادب المفرد مؤلفہ امام بخاری سے دیا ہے جس سے ان کے بیان کی عظمت بڑھ جاتی ہے۔ پھر مدینہ میں ایک جاٹ طبیب کا موجود ہونا بھی بڑے تعجب کی بات ہے۔

(الادب المفرد ص ۲۷)

پھر تاریخ اسلام کی مشہور و عظیم شخصیت محمد بن الحنفیہ کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کی والدہ قبیلہ بنی حنیفہ سے تھیں۔ مسیلمہ کذاب کی جنگ میں گرفتار ہوئیں اور بعد میں بطور لونڈی حضرت علی کے پاس رہیں جن سے محمد بن حنفیہ پیدا ہوئے۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ لونڈی قبیلہ بنو حنیفہ کی فرزند تھی بلکہ وہ بنو حنیفہ قبیلہ کی لونڈی تھیں سندی تھیں اور ولاء کے ذریعہ ہی وہ حنفیہ تھیں

ورنہ وہ سندھی تھیں خاندان ان کا سندھ کا تھا۔ (العقد الثمین ۲۰)

یہ انکشاف بھی بڑا دلچسپ ہے محمد بن حنفیہ کے سندھی ہونے کی تحقیق قاضی صاحب کی ژرف نگاہی کی دلیل ہے۔ محمد بن حنفیہ کی ماں خولہ تھیں

دوسری تحقیق قاضی صاحب نے یہ پیش کی ہے کہ امام زین العابدین کی والدہ سندھی لونڈی تھیں امام حسین رضی اللہ عنہ کے یہاں ان سے امام زین العابدین پیدا ہوئے۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ امام حسین کی نسل اسی لونڈی سے ہوئی۔ (ولیس للحسین عقب الا منہ) پھر قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ امام حسین کے صاحبزادے علی بن حسین کی بیوی بھی سندھی لونڈی تھیں جن سے زید بن علی بن حسین پیدا ہوئے۔ پھر زید کے بھی ایک سندھی لونڈی تھی۔ یعنی دو یا تین پشتوں تک خاندان سندھی لونڈیوں سے چلتا رہا۔

(العقد الثمین ص۔ ۳۰)

امام عبدالرحمن بن عمر اوزاعی بھی سندھی تھے۔ وہ ان قیدیوں کی اولاد سے تھے جو سندھ سے عرب لے جائے گئے تھے۔ اس موضوع پر مولانا ضیاء الدین ندوی مدظلہ العالی کا ایک مقالہ معارف میں شائع ہو چکا ہے۔ امام اوزاعی سندھی تھے قاضی کا بھی یہی خیال ہے۔ (العقد الثمین ص۔ ۱۱۱)

تاریخ اسلام میں جس اعلیٰ صفات کمانڈر نے خوارج کی طاقت کا زور توڑا ہے اور انکی طاقت پاش پاش کر دیا ہے وہ مہلب بن ابی صفرہ ہے۔ اس کا بیٹا یزید بن مہلب بھی بہادر تھا یزید بن عبدالملک نے حکم دیا کہ یزید بن مہلب اور اس کی آل و اولاد کو قتل کر دیا جائے۔ یزید بن مہلب تو بصرہ میں قتل ہوا اور اس نے بغاوت کی اور شکست کھائی پھر اس کی اولاد بھاگ کر سندھ آئی۔ یہاں ہلال بن احوز مازنی نے ایک مقام قندابیل میں سب کو قتل کرا دیا۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز

کے بعد جب یزید بن عبد الملک برسر حکومت آیا تو اس نے یزید کو برطرف کر دیا جس پر اس نے بغاوت کی۔ اس کی اولاد نے سندھ میں پناہ لی۔ الغرض اس عظیم فاتح اور سپہ سالار ابن مہلب کی تاریخ لکھتے وقت العقد الثمین ایک اہم مرجع ہے جس میں قاضی صاحب نے بڑی تحقیق سے کام لیا ہے۔

قاضی صاحب نے سپہ سالاروں، امیروں، گورنروں اور صحابہ و تابعین کے علاوہ خاص توجہ علم حدیث میں سندھیوں کی عظمت کو واضح کرنے پر کی ہے۔ انھوں نے اس دیار میں علم حدیث کا ارتقاء اور اس میں سندھی علماء کی شرکت کو نمایاں کیا ہے۔ چنانچہ آخری باب کتاب کا ہے۔ "علم الحدیث والمحدثون فی الہند" اس میں زور انھوں نے سندی محدثین پر دیا ہے۔

قاضی اطہر مبارکپوری نے العقد الثمین نہایت مرتب انداز سے تصنیف کی ہے اور اس میں تاریخی تسلسل پر زور دیا ہے۔ پہلے ہندوستان کی فتح کے بارے میں عام معلومات ہیں پھر یہ بتایا ہے کہ ہندوستان کی فتوح عراق کے گورنر کی زیر نگرانی ہوئیں پھر عرب و ہند تعلقات عہد رسالت پر بحث کی ہے اس کے بعد خلافت راشدہ میں چاروں خلفاء کے عہد میں عرب و ہند تعلقات کی تاریخ بیان کی، پھر حضرت معاویہؓ، عبد الملک بن مروان، ولید بن عبد الملک سلیمان عبد الملک عمر بن عبد العزیزؒ، یزید بن عبد الملک، ہشام بن عبد الملک، ولید بن یزید بن عبد الملک، یزید بن ولید بن عبد الملک اور ابراہیم بن ولید اور آخری خلیفہ مروان بن محمد الحمار کے ادوار میں سندھ کے امراء سے بحث کی ہے اور صحابہ و تابعین و تبع تابعین و معاصرین تبع تابعین سے ذکر کیا ہے۔ اس طرح کتاب تاریخ کے اُجالے میں شروع ہوتی ہے اور تاریخی

ترتیب سے اس کی تکمیل ہوتی ہے ۔

قاضی صاحب نے کافی معلومات اس کتاب میں بھردی ہے ۔ جہاں ہزاروں کے لشکروں نے بار بار حملے کئے ہوں ان میں صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی تعیین کرنا کچھ آسان معاملہ نہیں ہے۔ قاضی صاحب نے بڑے ہفت خواں طے کئے ہیں اس عظیم کام کی تکمیل میں اب سندھ کے بارے میں اس سے بڑا کوئی مآخذ ہمارے سامنے نہیں ہے جس میں ایک طرف تاریخ آگئی ہے اور دوسری طرف ثقافتی تاریخ پر بھی توجہ کی گئی ہے خصوصاً حدیث کے بارے میں اس کتاب میں بڑا مفید مواد جمع کردیا گیا ہے ۔ حضرت قاضی صاحب کا یہ علمی کام اس فانی دنیا میں باقی رہنے والا ہے ۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

پروفیسر واصل عثمانی۔ الخبر
اُردو نیوز جدہ

عالم دین اور مؤرّخ اسلام۔ قاضی اطہر مُبارکپوری

صحافت، ادب، تاریخ، تحقیق کے دانشوروں کی محفل ہو کہ اولیا ماللہ اور درویشوں کی مجلس، ہر جگہ آپ کو عقیدت ومحبت سے دیکھا جاتا ہے۔

ابھی چندماہ قبل یہ خبر سننے میں آئی تھی کہ دیارِ پورب کا ایک روشن چراغ جس نے اپنے دم قدم سے صرف ہندوستان اور پاکستان کی تاریک فضا میں ہی روشنی بکھیر نہیں رکھی تھی بلکہ دیارِ عرب کو بھی اپنی مورخانہ علمیت وقابلیت سے منور کر رکھا تھا بجھ گیا مگر الحمدللہ تحقیق کرنے پر یہ علم ہوا کہ یہ خبر نہیں بلکہ افواہ تھی مگر کسے معلوم تھا کہ بہت جلد یہ خورشید درخشاں غروب ہو جائے گا۔ گزشتہ دنوں یعنی ۱۶ جولائی کو ندیم صاحب نے مبارکپور کے حوالے سے آخر کار یہ دلشکن خبر سنا ہی دی کہ علم وفضل کا روشن مینارہ گر گیا، یعنی افضل العلماء، اکمل الکملا قدیم تہذیب وتمدن کا شاہکار حضرت قاضی اطہر مبارکپوری اس جہاں سے رختِ سفر باندھ چکے ہیں۔ اسلامی تاریخ اور علوم متعارفہ کا اتنا بڑا عالم، ایسا محقق، عجز وانکسار کا مجسمہ ہمارے درمیان سے خموشی سے اٹھ گیا۔ احباب کے دل پر ایک دھچکا سا لگا۔ مبارکپور کی زمین اپنی یتیمی اور لاوارثی پر چیخ اٹھی، علم وفضل کی راہیں سنسان ہو گئیں، عقیدتمندوں کے یہاں صفِ ماتم بچھ گئی یقین نہیں آتا تھا کہ مولانا ہم سب کو سوگوار چھوڑ کر اس طرح سفرِ آخرت اختیار

کریں گے۔ قاضی صاحب نے اپنی پوری زندگی تحصیل علوم اور تصنیف و تالیف میں صرف کر دی اور اس گئے گزرے حالات اور ماحول میں وہ علمی کارنامے پیش کئے کہ اب ان کا ثانی یا جانشین ملنا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔

ڈھونڈھوگے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

قاضی صاحب کے آبا ء و اجداد کا وطن قصبہ کڑا مانکپور تھا جہاں سے منتقل ہو کر آپ کا خاندان بہت پہلے اعظم گڑھ کے قصبہ مبارکپور میں سکونت پذیر ہو گیا تھا مبارکپور اعظم گڑھ کا نہایت مردم خیز قصبہ ہے جس کی آبادی ۲۰، ۲۵ ہزار کی ہوگی۔ ماضی میں بھی اور اس وقت بھی یہاں بڑے ذی علم احباب مسکن گزیں ہیں علم و فضل کے علاوہ دنیاوی شان و شوکت اور چمک دمک بھی اپنی تمام تر بوقلمونی کیفیات کے ساتھ یہاں موجود ہے۔ بنارسی ساڑیوں کے بے شمار کاریگر یہاں اپنی تمام فنی خوبیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ بنارسی ساڑیوں کا کاروبار یہاں کی شناخت ہے یہاں اس کے کارخانے ہر گلی کوچے اور گھر گھر میں پائے جاتے ہیں۔

آپ کے نانا یہاں کے بڑی ذی علم، مقتدر اور سربرآوردہ اشخاص میں سے تھے آپ نے ابتدائی تعلیم اسی قصبے میں حاصل کر کے دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا۔[1] جہاں سے درس نظامی کی تکمیل کی۔ آپ عربی و فارسی میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے، اردو اور فارسی میں نئی نئی تراکیب تراشنے میں آپ ید طولیٰ رکھتے تھے خاص طور سے عربی میں آپ کو بڑی مہارت حاصل تھی آپ بڑے ذی علم قابل اور جامع صفات انسان تھے تمام عمر کتب خانوں کی سیر، کتابوں کا مطالعہ آپ کا ذوق شوق تھا۔ اخذ علوم کی دھن میں آپ سرگرداں اور پریشاں رہا کرتے تھے اسی سلسلے میں تقسیم ہند سے پہلے آپ کا قیام تین سال لاہور میں بھی رہا یہاں رہکر آپ نے بڑی علمی خدمات کی وہاں کی دلچسپ یادیں قاضی صاحب اپنا سرمایہ حیات تصور کرتے تھے کبھی کبھی اپنی نجی محفلوں میں اس کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز سے

---

[1] دارالعلوم دیوبند نہیں جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد میں تکمیل کی (اسیر ادروی)

کرتے تھے آپ نے لاہور کے دورانِ قیام منتخب التفاسیر کے عنوان سے تقریباً ۹۵۰ صفحات کا ایک مسودہ تیار کیا تھا جو قرآن کریم کے ۱۲ پاروں تک کی تفسیر تھی مگر چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکی بلکہ ضائع ہو گئی اسی طرح الصحابیات کے عنوان سے ایک کتاب ایک مشہور شاعر کی لاپرواہی کی نذر ہو کر رہ گئی۔ علمار اسلام کی خونیں داستانیں بھی لاہور کے دوران قیام میں مرتب کی ہوئی ایک بڑی علمی کتاب تھی جو اپنی گزشتہ دو کتابوں کی طرح طبع نہ ہو سکی۔ قاضی صاحب کا حافظہ بہت قوی تھا آپ کی سلیس وسادہ طرز تحریر بڑی آسانی سے قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی۔ قاضی صاحب کی عقابی نگاہیں علوم و معارف کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتی تھیں کہ استعجاب سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی تھیں، پتھر سے ہیرا تراشنے کا کام قاضی صاحب کو خوب آتا تھا انھوں نے اسلامی تاریخ و تحقیق پر بڑے عالمانہ انداز سے کام کیا ہے روایات کو درایت کی میزان پر تولنے اور کھوٹے کھرے کو پرکھنے کا کام کاش کوئی ان سے سیکھتا۔ آپ کی اکثر تصانیف پی ایچ ڈی کے وقیع مقالہ جات پر بھی فوقیت رکھتی ہیں آپ کی تصانیف سے ان علمی ذخائر کا بھی علم ہوتا ہے جو مخطوطات، مسودات اور نوادرات کی شکل میں نجی کتبخانوں میں پائے جاتے ہیں۔

قاضی صاحب کے معجز رقم قلم نے درج ذیل کتابیں تصنیف کیں جو وقتاً فوقتاً منظر عام پر آتی رہیں۔

ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، یہ کتاب ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی جس کا عربی ترجمہ دول العرب فی الہند بھی شائع ہوا۔ ۲۔ عرب و ہند عہد رسالت میں جس کا ترجمہ ایک مصری عالم نے کیا اور البحوث الاسلامیہ سے شائع کرایا۔ ۳۔ ہندوستان میں صحابہ اور تابعین کا ورود، ۴۔ دیار پورب میں علم اور علمار، جسے ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا اس میں ہندوستان کے مشرقی

اضلاع مثلاً الٰہ آباد، لکھنؤ، جونپور اور اعظم گڑھ اوران کے قرب وجوار کے اضلاع کا بڑا علمی جائزہ تفصیل سے لیا گیا ہے ۵۔ بنات اسلام کی دینی خدمات ۶۔ خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان ۷۔ عظمتِ رفتہ ۸۔ ائمہ اربعہ ۹۔ تدوین سیر و مغازی، مطبوعہ شیخ الہند اکیڈمی دیوبند۔ ۱۰۔ خیرالقرون کی درسگاہیں اوران کا نظام تربیت۔

جب آپ نومبر ۱۹۸۵ میں سابق صدر ضیاء الحق کی دعوت پر پاکستان تشریف لائے تو تنظیم فکر ونظر سکھر نے آپ کی درج ذیل کتابیں شائع کیں۔
(۱) خلافت راشدہ اور ہندوستان (۲) خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان (۳) خلافت امیہ اور ہندوستان۔

قاضی صاحب میں بے مثال قوت ارادی پائی جاتی تھی جس کام کا ارادہ کر لیتے تھے اسے مکمل کر کے ہی دم لیتے تھے۔ آپ نے اپنی زندگی میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے، کتابوں کی تصنیف وتالیف کے علاوہ رسالوں کی ادارت بھی کی صحافت کا بھی حق ادا کیا۔ فتاویٰ بھی دیے۔ اسلامی مؤرخ کی حیثیت سے وہ کام کیے کہ اگر قاضی صاحب ان ریزہ ریزہ ادب پاروں کا سراغ لگا کر اپنی سعیٔ بلیغ کے ذریعہ مجتمع نہ کرتے تو آج بہت سے وہ حوالے جو آپ کی تحریروں میں علمی ذخائر کی نشاندہی کرتے ہیں ختم ہو جاتے آپ تقریباً ڈیڑھ دو درجن کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں اور آپ کی ہر تصنیف معلومات کا ایک بیش بہا خزینہ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے آپ کو جہاں بھی علمی ذخائر کا علم ہوتا تو آپ وہاں تشریف لے جاتے یا خط وکتابت کے ذریعہ رابطہ قائم کرتے اور اپنی معلومات میں اضافہ فرماتے۔ فرانس میں مقیم اسلامی اسکالر ڈاکٹر حمید اللہ کراچی کے ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم اور لاہور کے پروفیسر اسلم صدر شعبہ اسلامی تاریخ سے تحقیق وتدقیق کے سلسلے میں آپ کے بڑے گہرے علمی وادبی مراسم تھے اپنی اسی تحقیق کے سلسلے میں آپ کو

۱۹۷۸ء میں عرب اور افریقہ کے ممالک کے سفر بھی کرنے پڑے البتہ دمشق اور بغداد کے سفر کی حسرت لئے ہوئے وہ اپنے مالک حقیقی سے جاملے مصر کے علما خصوصًا جامعہ الازہر کے اساتذہ آپ کی بڑی عزت کرتے تھے۔

۱۹۵۱ء سے ۱۹۸۰ء تک تقریبًا تیس سال آپ کا قیام بمبئی میں رہا۔ جہاں انقلاب اخبار میں آپ احوال و معارف کے عنوان سے مستقل کالم لکھتے تھے۔ آپ کے علمی و اسلامی مضامین بھی شائع ہوتے تھے مگر انقلاب کا یہ کالم اہل علم کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ بمبئی کے دوران قیام میں آپ نے ایک اُردو ماہنامہ البلاغ کے نام سے جاری کیا جس میں علم و ادب کے علاوہ بڑے تحقیقی اسلامی مقالے شائع ہوتے تھے آپ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی وفات کے بعد برہان کے بھی اعزازی مدیر کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۸۱ء میں وہ مستقلاً اپنے آبائی وطن مبارکپور تشریف لے گئے ان کی بمبئی سے منتقلی ایک علمی و تحقیقی رسالے البلاغ کی موت کا سبب بنی۔ آپ کی مصنفانہ زندگی کا خاتمہ البتہ مرنے دم تک نہ ہوسکا۔ چند ماہ قبل تک معارف اعظم گڑھ میں بڑے تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہے۔

۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۶ء کے دو سال کے قلیل عرصے میں آپ کو تین بار اسلام آباد راولپنڈی اور کراچی کے سفر کرنے پڑے وہاں کی علمی، ادبی اور صحافتی انجمنوں نے آپ کے اعزاز میں محفلیں منعقد کیں۔ دراصل یہ اسفار سیرت کانفرنس اور قرآن کانفرنس کے سلسلے میں تھے۔ پاکستان میں جنرل ضیاء الحق نے آپ کو اعلیٰ ایوارڈ سے نوازا۔ اس زمانے میں آپ کی مشہور تصانیف کی رونمائی بھی پاکستان میں ہوئی۔

ہندوستان کی حکومت نے بھی پاکستان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آپ کو ادبی اعزازات مرحمت فرمائے۔

قاضی صاحب کی علمی و ادبی حیثیت کا یہ عالم تھا کہ آپ صحافت، ادب، تاریخ تحقیق کے دانشوروں میں بڑی اعلیٰ حیثیت رکھتے تھے اور اولیاء اللہ اور محفلِ

درویشاں بھی آپ کو بڑی نسبت و عقیدت سے دیکھتے تھے۔ محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی جیسے ولی اللہ، شاہ وصی اللہ صاحبؒ خلیفہ حکیم الامت اشرف علی تھانوی انھیں بہت عزت و تکریم سے یاد کرتے اور ان کی منکسر المزاجی اور قابلیت اور لیاقت کی داد دیتے تھے۔

آپ ہندوستان اور پاکستان کے کئی ادبی اداروں سے منسلک اور سرپرست تھے۔ شیخ الہند اکیڈمی دار العلوم دیوبند کے آپ نگراں تھے۔ دار المصنفین اعظم گڑھ کی مجلس شوریٰ میں شامل تھے ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجالس میں شریک ہو کر اسکے ادبی وقار کو بلند و بالا کرتے، مبارکپور میں آپ ہی کی کوششوں سے ایک مدرسہ حجازیہ قائم کیا گیا جس میں ایک دار الافتاء بھی کھولا گیا جس کی سرپرستی مولانا خود کرتے تھے۔

آپ کا ذاتی کتب خانہ علمی، ادبی، تاریخی کتب کا بڑا زبردست مخزن ہے جس سے تشنگان علوم و فنون اکتساب فیض کرتے رہے تھے۔ اب ان کے بعد انکے چار صاحبزادوں میں خدا معلوم کسی کو علم و ادب کا شوق ہے بھی کہ نہیں۔

آپ نے کل ۵ حج کئے تھے ہر بار دوران قیام حج آپ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے قدیم کتب خانوں اور مخطوطات سے استفادہ کرتے اور اردو زبان میں بڑے پر وقیع معلوماتی مقالہ جات شائع کراتے کبھی کبھی مولانا پر تھکن کے آثار ہوتے تھے تو وہ سوچنے لگتے تھے کہ اب مجھے آرام کی ضرورت ہے مگر منہ سے یہ کافر لگی ہوئی والی بات ہے انھوں نے اس تھکن کا اظہار۔

اپنے ایک خط میں جو انھوں نے راقم الحروف کو بھیجا تھا اس طرح کیا ہے اور یہ شعر لکھا ہے۔

اب یقیناً تجھے آرام کی خواہش ہوگی
زندگی تجھ سے بہت کام لئے ہیں میں نے

شعر پر بات چل نکلی تو یہ بات بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ ۱۹۹۴ء میں جب

سے منظوراتِ قصبہ کڑا مرتب کر رہا تھا تو قاضی صاحب نے میری درخواست پر اپنے
کچھ حالات اور اشعار مجھے ارسال فرمائے تھے جو تذکرہ ناظرین اور قارئین کے لئے
ہیں ان کی ایک غزل کے چند اشعار یہ ہیں :

دم عیش و مسرت سوختہ جانوں پہ کیا گزری
جلی جب شمع محفل میں تو پروانوں پہ کیا گزری

وہ سمجھتے تھے نہیں معلوم فرزانوں پہ کیا گزری
نہیں معلوم ان غمخوار دیوانوں پہ کیا گزری

در و دیوار لرزاں ہیں مسلسل چیخ اٹھتی ہے
خدایا خیر ہو زنداں میں دیوانوں پہ کیا گزری

رہا کرتی تھیں کل تک جن پہ رحمتیں خدا کی
نہیں معلوم آج ان مرمریں شانوں پہ کیا گزری

بڑی حسرت سے مرغانِ قفس یہ ذکر کرتے تھے
نہ جانے اب کے موسم میں گلستانوں پہ کیا گزری

تباہی کا مری ماتم ہے اکمل آج اپنوں میں
مگر دیکھے گی کل دنیا کہ بیگانوں پہ کیا گزری

گزشتہ سال میں نے جب اپنی نئی تصنیف تازہ ہوا کا جھونکا جو جاپانی
صنف شاعری ہائیکو سے متعلق آپ کی خدمت میں روانہ کی تو آپ نے محبت آمیز اور
حوصلہ افزا لہجے میں میری کتاب کی ستائش کی اور اس کی اجتہادی انداز اور
ہائیکو میں اسلامی نظریہ اور طرزِ فکر کو متعارف کرنے میں مجھے مبارکباد دی اور
اپنی کہنہ سالی اور ضعیف العمری کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کا افسوس ظاہر کیا کہ شاید
اب ملاقات نہ ہو سکے اور اس قلندرانہ صفت کا شخص واقعی اب اس ایسی جگہ چلا
گیا ہے جہاں اب میں چاہوں بھی تو ان سے ملاقات اس دنیاوی زندگی میں نہیں

کر سکتا۔ اب ایسے وضعدار صاحب نظر کم گو، علم دوست اور محقق انسان کہاں ہیں ؎

جو بادہ خوار پرانے تھے اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لے ساقی

ص۳۴ کا بقیہ

کو مجموعی طور پر ۔ عربی تہذیب ۔ کا نام دیا جاتا ہے تاہم بازنطینی سلطنت نے صدیوں کی تہذیبی میراث، روم، یونان، مصر و ایران کی مختلف قوموں کے ترقی یافتہ تمدن کے باوجود اس قسم کا روشن، منوّر اور کامل ترین تہذیب کا نمونہ دیکھا ہوگا جو محمد رسول اللہ ﷺ کے نام لیوا صحرائے عرب سے لے کر آئے تھے جس کا قرآنی پیغام، توحید و رسالت کا سرمدی نغمہ ان کے دلوں کو ایسا بھایا کہ اسی کے ہو کر رہ گئے ۔

عتیق احمد قاسمی
دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

عظیم مؤرخ اور تذکرہ نگار

قاضی اطہر مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ

بچپن سے جن مصنفین اور اہل قلم کی تحریریں مطالعہ میں آتی رہیں ان میں سے ایک نمایاں نام جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری کا ہے، جنھیں اب دامت برکاتہم کے بجائے۔ رحمۃ اللہ علیہ لکھنا پڑ رہا ہے، ایک زمانہ تک قاضی اطہر صاحب کے مقالات و مضامین پابندی کے ساتھ ندوۃ المصنفین دہلی کے ارگن ماہنامہ برہان میں شائع ہوتے رہے، معارف اعظم گڈھ، البلاغ بمبئی اور ملک کے دوسرے مؤقر جرائد و رسائل میں بھی ان کے محققانہ مضامین اکثر شائع ہوتے تھے، ندوۃ المصنفین اور ماہنامہ برہان سے انھیں خصوصی ربط تھا، ان کی زیادہ تر اہم تصنیفات ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئیں، شاید یہ کہنا بے جا نہ ہو کہ قاضی اطہر مبارکپوری ان مصنفین میں ہیں جو ندوۃ المصنفین کے افق سے طلوع ہو کر علمی دنیا میں روشناس ہوئے، مفتی عتیق الرحمن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے بلا کی ذہانت اور مردم شناسی عطا فرمائی تھی، انھوں نے بہت سے ممتاز اہل قلم کا تعاون حاصل کر کے ندوۃ المصنفین کے ذریعہ اسلامیات کا معیاری لٹریچر پیش کیا۔

قاضی اطہر صاحب مبارکپوری نے اپنے تصنیفی دور کا زیادہ تر وقت بمبئی میں گذارا اور بمبئی کی مادیت اور رنگینی میں کھو جانے کے بجائے مادیت کے تھپیڑوں میں شمع علم و تحقیق کی لو تیز کرتے رہے، قاضی صاحب ان چند گنے چنے لوگوں میں تھے، جو ماحول کے تابع ہونے کے بجائے ماحول کو اپنا تابع بناتے ہیں اور جہاں بیٹھ جاتے ہیں ایک انجمن بنالیتے ہیں، بمبئی کے علم کش ماحول میں رہ کر بڑے بڑے تحقیقی اور تصنیفی کام کر گذرنا قاضی صاحب کا ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی مثال بہت مشکل سے ملے گی، قاضی صاحب خود تحریر فرماتے ہیں :

"تیس سال سے زائد مدت تک بمبئی میں مستقل قیام رہا اور جس شہر میں شبلی مرحوم "کنار آب چوپاٹی دگل گشت اپالو" کی سیر کرکے غزل کہا کرتے تھے، ان کے ایک ہم وطن نے ایک معمولی سے کمرے میں "مرکز علمی" کا بورڈ لگا کر تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری اور مقالہ نویسی کا دور شباب گذارا، میں نے بڑے بڑے عقیدتمندوں کی عقیدت اور بڑی بڑی پیش کش کو یوں ہی پیش کش کا شکریہ ادا کرکے شہر کی چمک دمک میں کھو جانے کے مقابلہ میں بوریہ نشینی کو ترجیح دی۔ میرے بہی خواہ اور مخلص بزرگ واحباب اس معاملہ میں مجھے احمق سمجھتے تھے اور میں کم از کم اس بارے میں اپنے کو عقلمند سمجھتا تھا بلکہ اب بھی سمجھتا ہوں"

(حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری کا مختصر سوانحی خاکہ اور علمی کارنامے)

ہندوعرب تعلقات، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ابتدائی صدیوں میں ہندوستان آنے والے عرب علماء و مشاہیر قاضی صاحب کے پسندیدہ موضوعات تھے، ان کی زیادہ تر تحریریں اور تصنیفیں انھیں موضوعات سے متعلق ہیں

موصوف نے ان موضوعات پر اپنی عمر کھپادی اور وسائل کی قلت اور موانع کے باوجود ان موضوعات پر پورا کتب خانہ تیار کردیا، اس کے لئے انھوں نے تاریخ، تذکرہ، اسماء الرجال کے ذخیرے کھنگال ڈالے اور ہر اس کوچۂ علم کی خاک چھانی جہاں انھیں اپنے موضوع پر کچھ بھی مواد حاصل ہونے کی امید تھی۔

"رجال السند والہند" ان کی پہلی تصنیف ہے جس نے عرب وعجم میں انکے علم وتحقیق کا ڈنکا بجادیا اور ان کی شہرت اور مقبولیت کا باعث بنی۔

"العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین" بھی انکی ایک شاہکار تصنیف ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی بھرپور تصنیف ہونے کی وجہ سے اس کتاب کی بھی علمی حلقوں میں بہت پذیرائی ہوئی، یہ دونوں کتابیں پہلی بار بمبئی سے شائع ہوئیں، اس کے بعد قاہرہ کے بعض ناشرین نے ان کتابوں کو شائع کیا۔

قاضی صاحب کی اردو تصنیفات میں "عرب وہند عہد رسالت میں"، "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں"۔ "اسلامی ہند کی عظمت رفتہ" "خلافت راشدہ اور ہندوستان"۔ "خلافت بنوامیہ اور ہندوستان"۔ "خلافت عباسیہ اور ہندوستان"۔ خاصے کی چیزیں ہیں، یہ تمام کتابیں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئیں، ان کتابوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی صاحب نے کس طرح چیونٹیوں کے منہ سے شکر جمع کی ہے، اور ہزارہا ہزار صفحات کا گہرا مطالعہ کرکے تاریخ وتذکرہ نگاری کا کیسا مالامال دسترخوان سجایا ہے، اور یہ سب کچھ اس حال میں کیا ہے کہ نہ وہ کسی تحقیقی وتصنیفی ادارہ سے وابستہ تھے، نہ کوئی بڑا کتب خانہ ان کی دسترس میں تھا نہ ان کے پاس تحقیق میں تعاون کرنے والوں کی ٹیم تھی، عسرت اور تنگ دستی کا شکار تھے، مادہ اور مادیت کا سمندر ان کی نظروں میں کے سامنے ٹھاٹھیں مار رہا تھا لیکن

وہ اپنے علمی شغف میں کمی کر کے مادیت کے سمندر میں دامن تر کرنے کو تیار نہ تھے۔

قاضی صاحب کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے، انھوں نے ابتدائی عمر میں علمی کاموں کا جو نقشہ بنایا، زندگی بھر انھیں نقشوں میں رنگ بھرتے رہے، نامساعد حالات، گھریلو پریشانیاں اور معاشی تنگی ان کے حوصلوں کو پست اور عزائم کو سرد نہ کر سکیں، وہ اپنے پسند کیے ہوئے علمی راستہ پر پوری استواری اور استقامت کے ساتھ رواں دواں رہے۔ بالآخر عرب و عجم کے علمی حلقوں نے ان کی بے پایاں علمی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا اور رب کریم نے انھیں اپنی نعمتوں اور نوازشوں سے خوب نوازا۔

عجیب اتفاق ہے کہ بچپن سے قاضی صاحب کی تحریروں کا شائق ہونے کے بعد باوجود مجھے ان سے ملاقات کا شرف بہت تاخیر سے حاصل ہوا حالانکہ کافی عرصہ سے ان کا قیام مبارکپور (ضلع اعظم گڈھ) ہی میں تھا اور مبارکپور لکھنؤ سے بہت زیادہ دور نہیں ہے، ان سے میری صرف دو بار ملاقات ہوئی، دونوں ملاقاتیں حالیہ چند برسوں میں ہوئیں جب وہ ندوۃ العلماء کی مجلس منتظمہ کے رکن منتخب ہوئے اور اس میں شرکت کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ تشریف لائے۔

ان ملاقاتوں کا تذکرہ کرنے سے پہلے ان کے دوگرامی ناموں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے، ۱۹۸۰ء میں میری کتاب "فکر کی غلطی" کا پہلا ایڈیشن دہلی سے شائع ہوا، جس میں جناب وحیدالدین خاں صاحب مدیر الرسالہ دہلی کے منحرف افکار کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا تھا، کتاب کا پہلا ایڈیشن تین ماہ کی مختصر مدت میں ختم ہو گیا، کتاب کی غیر معمولی مقبولیت اور طلب دیکھ کر پاکستان کے دو ناشروں نے بھی مصنف یا ناشر سے

اجازت حاصل کئے بغیر کتاب شائع کرلی، پاکستان کے مشہور محقق اور ماہر تعلیم پروفیسر سید محمد سلیم صدر ادارۂ تعلیمی تحقیق و تنظیم اساتذہ پاکستان نے کسی ہندوستانی رسالہ میں کتاب کا اشتہار دیکھ کر حضرت قاضی صاحب کو لکھا کہ کتاب کا ایک نسخہ حاصل کر کے ان کے لیے بھیجدیا جائے، قاضی صاحب نے میرے نام ایک گرامی نامہ میں لکھا کہ دفتر کی غلطی ۔ کا ایک نسخہ رجسٹرڈ ڈاک سے پروفیسر سید محمد سلیم صاحب کے پتہ پر روانہ کر دیجئے اور کتاب کی قیمت نیز ڈاک کے مصارف سے مجھے مطلع کیجئے تاکہ میں اس کی ادائیگی کردوں، افسوس ہے کہ قاضی صاحب کا یہ مکتوب میرے پاس محفوظ نہیں رہا۔

میں نے قاضی صاحب کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے پروفیسر سید محمد سلیم کے پتہ پر کتاب روانہ کردی اور انہیں بذریعہ خط مطلع کردیا کہ مصنف یا ناشر کی اجازت کے بغیر یہ کتاب پاکستان کے دو ناشروں نے شائع کرلی ہے حضرت قاضی صاحب کو بھی کتاب روانہ کرنے کے بارے میں خط سے مطلع کیا اور لکھا کہ میں نے آپ کے حکم کی تعمیل اس ترمیم کے ساتھ کی ہے کہ کتاب میری طرف سے ہدیہ ہے آپ قیمت اور ڈاک خرچ ادا کرنے کی فکر نہ کریں، امید ہے کہ آپ میری اس ادنیٰ ترمیم کو منظور فرمائیں گے، میرے اس خط کے جواب میں قاضی صاحب کا جو گرامی نامہ آیا وہ حسن اتفاق سے میرے پاس محفوظ رہ گیا۔ اس کا متن درج کیا جاتا ہے۔

باسمہ تعالیٰ

قاضی منزل، مبارکپور
۹/رجب ۱۴۱۲ھ
۱۵/جنوری ۱۹۹۲ء

عزیز گرامی سلمک اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ کل لفافہ ملا، بہت بہت شکریہ

میرے معاملہ میں تھوڑی ترمیم۔ بہرحال موجب شکر ہے، ہدایا و تحائف اور عطایا، "من غیر اشراف" ہوں تو سبحان اللہ، مگر یہاں تو حسن طلب کا معاملہ بظاہر معلوم ہوتا ہے، مگر بباطن ایسی بات نہیں ہے، اسلئے اس دینی وعلمی تعاون پر شکریہ قبول فرمائیے۔

میں نے پہلے ہی پروفیسر سید محمد سلیم صاحب کو صورتِ حال لکھ دی تھی اور یہ کتاب ان کو بہت جلد مل جائے گی، اچھا ہوا کہ "فکر کی غلطی" لاہور میں چھپ گئی ہے اور اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں، اس کی ضرورت تھی، خدا کرے آپ بخیریت ہوں۔ والسّلام

قاضی اطہر مبارکپوری

"فکر کی غلطی" پانے کے بعد پروفیسر سید محمد سلیم صاحب کے دو خطوط میرے نام موصول ہوئے، ان میں سے ایک خط گراں بہا تاریخی معلومات پر مشتمل ہے، یہ دونوں خطوط بھی حضرت قاضی صاحب کے کھاتے میں جاتے ہیں اسلئے میں ان دونوں کو بھی اس مضمون کے آخر میں شامل کروں گا تاکہ محفوظ ہو جائیں اور قارئین کی معلومات میں ان سے گراں قدر اضافہ ہو۔

قاضی اطہر صاحب مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۹۳ء میں ہوئی، موصوف ندوۃ العلماء کی مجلس منتظمہ کی میٹنگ میں شرکت کے لئے لکھنؤ تشریف لائے تھے، مہمان خانہ میں قیام تھا، انھوں نے ازراہِ نوازش اپنی آمد کی اطلاع کرائی اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی، میں حاضر ہوا تو گلے لگا لیا اور اس طرح ملے جیسے مدتوں سے شناسائی ہو اور بڑی شفقت فرمائی۔ دیر تک میرے مضامین اور کتابوں کا تذکرہ کرتے رہے، تحسین و ستائش کے ساتھ مفید مشوروں سے بھی نوازتے رہے، پہلی ہی ملاقات میں دل ان کا گرویدہ ہو گیا، سراپا اخلاق و تواضع، عاجزی و فروتنی

کا مرقع، شگفتہ اور بذلہ سنج، طویل علمی ریاضت کے آثار چہرے سے نمایاں۔

طبیعت ان کی شفقت اور حسن اخلاق سے بہت متاثر ہوئی، جتنی دیر تک ملاقات رہی مطالعہ وتحقیق ہی کی باتیں کرتے رہے، ہمت افزائی کرتے رہے اور حوصلہ بڑھاتے رہے، اندازہ ہوا مزاج میں خوردنوازی کا جذبہ بہت ہے، دولت عثمانیہ کے عروج وزوال پر میرے تحقیقی کام کا ذکر آیا تو اس موضوع پر متعدد قدیم وجدید کتابوں کا ذکر کیا اور فرمایا کہ میرے پاس اس موضوع پر چند کتابیں ہیں جو بلاد عربیہ سے حاصل ہوئی تھیں ان میں سے بعض کتابیں ہدیۃً بھیجوں گا۔ تاکہ آپ ان کتابوں سے اپنے کام میں مدد لے سکیں۔ کچھ دنوں کے بعد مولانا مفتی محمد ظہور صاحب دامت برکاتہم مفتی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بدست کتابوں کا ایک پیکٹ بھیجا جس میں دولت عثمانیہ کے موضوع سے وابستہ دو کتابوں کے علاوہ حافظ ابن شاہین بغدادی (متوفی ۳۸۵ھ) کی کتاب۔ تاریخ الثقات ممن نقل عنہم العلم، بھی تھی، قاضی صاحب کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ یہ کتاب شرف الدین الکتبی واولادہ نے بمبئی سے شائع کی تھی، چوتھی کتاب ان کی طالب علمی کی سرگذشت کے موضوع پر تھی۔ جسے ان کے ادارہ دائرہ ملیہ مبارکپور نے شائع کیا تھا۔

قاضی صاحب مرحوم سے دوسری ملاقات بھی ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ میں مجلس منتظمہ کی میٹنگ کے موقع پر ہوئی، حسب معمول شفقت اور تپاک سے ملے، تحقیق وتصنیف ہی کی باتیں کرتے رہے کبھی کبھی بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی سے محفل کو زعفران زار بناتے، پیرانہ سالی کے باوجود خاصے چاق و چوبند تھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے اور وہ بہت جلد اس دنیا سے رخصت ہوکر ان لوگوں کی محفل میں پہونچ جائیں گے جن کے احوال

وکمالات کی جستجو میں ان کی عمر کا بڑا حصہ گذرا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، اور ان کی داستان زندگی سے نوجوانوں کو ہمت اور حوصلہ سیکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

پروفیسر سید محمد سلیم کے دو خطوط

خط نمبر ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پروفیسر سید محمد سلیم
ڈائرکٹر ادارہ تعلیمی تحقیق
۲۔ بہاول شیر روڈ نزنگ
لاہور۔ ۱۰ جنوری ۱۹۹۲ء

مکرم و محترم جناب مولانا عتیق احمد قاسمی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج شریف

آپ کی تصنیف ۔فکر کی غلطی۔ مطالعہ کی ہے۔ وحید الدین خان صاحب کی اغلاط اس قدر ہیں کہ وہ کسی ایک کتاب میں بیان نہیں کی جا سکتی ہے۔ بہرکیف ان پر لکھنا ضروری تھا۔ ورنہ اہل علم کی خاموشی ان کے استکبار میں مزید اضافہ کا سبب بنتی ہے۔

زعم اور استکبار کا یہ عالم ہے کہ وہ ہر شاخ علم میں اور ہر میدان میں دوسروں کو دعوتِ مبارزت دیتے ہیں۔ حالانکہ خود اس علم سے واقفیت نہیں رکھتے، مثلاً وہ مجدد الف ثانی پر تنقید کرتے ہیں۔

۔ مگر پرتگالی فتنے انھیں نظر نہ آئے ص ۲۲۰ فکر کی غلطی

یہ تاریخ کا میدان ہے۔ تاریخ سے وہ اس قدر باخبر نہیں ہیں جتنا ان کو زعم ہے۔ انھیں نہیں معلوم کہ مجدد الف ثانی کے زمانہ میں پرتگالیوں کی کیا حالت تھی، خود مجدد صاحب ایک مکتوب میں ان کی جہالت کی مثال دیتے ہیں۔ جاہل ہمچو فرنگیاں

اکبر شاہ نے اپنے وزیر میر فتح اللہ شیرازی (۱۵۹۹) کے مرنے پر کہا تھا:
"موت کے بجائے اگر وہ فرنگیوں کے ہاتھ گرفتار ہو جاتا اور وہ
اس کے عوض میرے تمام خزانے طلب کرتے تب بھی میں یہ سودا
کر ڈالتا اور خود کو پھر بھی نفع میں سمجھتا۔ اس گوہر نایاب کو
پھر بھی سستا خریدتا۔"
یہ تھی فرنگیوں کی حالت۔ ظلم و ستم کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے تھے۔
وہ ہاتھ پیر کاٹ کر دانت توڑ کر منڈلا بنا کر لکڑی کے تختہ پر ڈال کر
سمندر میں پھینک دیتے تھے۔ وہ ماؤں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ اپنے بچوں کو
چونا پیسنے کی چکی (گرٹ) میں اپنے زندہ بچوں کو پیسیں۔
دیکھئے مزید: History of India after 1926 - By Mahajan Delhi - 1962, Kunje-Alis - By. O.L. Nawbian - Bombay 1963.

شاہ ولی اللہ پر تنقید کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:
"شاہ ولی اللہ ابھی پیدا ہوئے تو نیوٹن ابھی زندہ تھا، اور اس کی
مشہور کتاب پرنسپیا (۱۶۸۷) وجود میں آچکی تھی جبکہ اسلام کی
حریف قومیں روایتی علم کے ڈھانچہ کو توڑ کر نیا سائنسی علم وجود میں
لا رہی تھیں۔ شاہ ولی اللہ روایتی ڈھانچے سے باہر آ کر مسئلہ کو
سمجھنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔"
شکوہ یہ ہے کہ مغربی علوم کی طرف توجہ نہیں کی۔ وحید الدین خاں صاحب
یہاں بھی حقیقتِ حال سے بے خبر ہیں۔ مسلمان مغربی علوم کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

۱ - عہد عالمگیری کے امیر ملا شفیق یزدی فرانسی سیاح برنیر کو اپنے یہاں ملازم رکھا تھا۔ اس سے فرانسی زبان سیکھی تھی، اس وجہ سے وہ
(Gessondi 1635) اور (bescanles - 1650)
کی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا۔

سفرنامہ برنیر۔ طبع کراچی۔ ص ۲۸۵ - نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۷۶

۲- ابو الفتح سلطان ٹیپو نے مغربی علوم و فنون کی تحصیل کے لئے ایک جدید انداز کی تعلیم گاہ قائم کی تھی، اس کا نام جمیع الامور رکھا تھا۔ گمان یہ ہے کہ یہ یونیورسٹی کا ترجمہ ہے، یہاں فرانسی اساتذہ کو بطور استاد مقرر کیا تھا، یہاں مغربی علوم کی کتابوں کے ترجمہ کئے گئے تھے جن کے نسخے بعض کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

(تاریخ سلطنت خداداد میسور - از محمود احمد بنگلوری - طبع لاہور ص ۲۹۴)

۳- عبد القادر بن خیر الدین عماد پوری جونپوری (۱۷۸۷ - ۱۷۲۹) وفات سوکھ پور اعظم گڑھ۔ یہ شاہ ولی اللہ دہلوی اور صاحب نفحۃ الیمن سے ان کی مراسلت رہتی تھی۔ یہ مغربی علوم کے شناور تھے، ان کی دو کتابیں تھیں (۱) المحاکمۃ بین العلوم المشرقیۃ والمغربیۃ (۲) کتاب فی التعقب علی باکون المغربی۔ یہ فرانسی بیکن (1626 - 1561) پر گرفت ہے تنقید ہے۔ ان کتابوں سے ان کا مرتبہ علم واضح ہو جاتا ہے۔

نزھۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۹۱

الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند ص۔ ۱۸

حیات ولی۔ مولوی رحیم بخش ص ۴۱، ۵۴

۴ - علامہ تفضل حسین خاں کاشمیری
مرزا خیر اللہ خاں مہندس صاحب زیج محمد شاہی کے شاگرد تھے۔ نواب

آصف الدولہ نے کلکتہ میں وکیل بناکر بھیجا۔ وہاں مغربی علوم کی تحصیل، پیدائش سیالکوٹ۔ وفات ہزاری باغ بہار۔ ۱۵ر شوال ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء مغربی علوم کی بہت سی کتابوں کا براہِ راست لاطینی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ انھوں نے نیوٹن کی کتاب Principia کا بھی براہ راست لاطینی سے عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ ان کی بہت ساری کتابیں تھیں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں ایک استاد مولانا عثمان جعفری مچھلی شہری بیان کرتے ہیں کہ ان کے شہر میں ایک شخص کے پاس علامہ تفضل حسین صاحب کی کتابیں موجود ہیں۔ مگر وہ کسی کو دکھاتے نہیں۔ تحفۂ عالم از سر شوستری ص ۲۸۶ طبع شوکت پریس، حیدرآباد۔ ۱۸۰۱

سوانح عمری مولوی تفضل حسین خاں از نواب سید محمد علی خاں حیدرآباد ۱۹۲۱

نزہۃ الخواطر ج ۲ ۷ مولانا عبدالحی لکھنوی عربی

الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند ص ۲۷۳ طبع دمشق

نظام تعلیم و تربیت۔ از مولانا مناظر احسن گیلانی ج ۱ ص ۲۶۳ لاہور

جس طرح انگریزوں نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ اسلام تلوار سے پھیلا اسی طرح یہ بھی پروپیگنڈا کیا کہ علماء نے انگریزی تعلیم کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا تھا، یہ صریح کذب ہے، کب دیا تھا؟ کس نے دیا تھا؟ ۱۸۵۷ میں علماء و فضلاء کیلئے بغداد کی تباہی جیسی تباہی تھی۔ اس دور کے علماء کے کارناموں کو کبھی بھی ظاہر نہ ہونے دیا گیا اور یہ پروپیگنڈا خوب زور و شور سے چلا آج عوام تو عوام خواص بھی یہی سمجھتے ہیں۔

وحیدالدین خاں پر بھرپور تنقید اور گرفت کی ضرورت ہے، میرے خیال میں تو نفسیاتی complex بھی ہے۔

اونٹ جب پہاڑ کے سامنے نہیں پہونچتا وہ سمجھتا ہے کہ مجھ سے بڑا

کوئی نہیں۔ کوئی صاحب آگے بڑھ کر بھرپور تنقید کریں، یہ کوئی بڑا فتنہ بننے والا ہے۔

میرا آپ سے کوئی تعارف نہیں تھا، مگر آپ کی کتاب کسی قدر تعارف کا ذریعہ بن گئی ہے، میں آپ کی کتاب کی قدر کرتا ہوں، آپ نے اچھا کام کیا ہے۔

من رأی منکم منکرا الخ کے معنی یہ بھی ہیں کہ برائی to either c un noticed نہیں جانا چاہئے۔

غائبانہ آپ کا مادح

محمد سلیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خط ۲

پروفیسر سید محمد سلیم
ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم منزل
۳۔ بہاول شیر روڈ فزنگ لاہور

۲۲ر جنوری ۱۹۹۴ء

مکرم و محترم جناب مولانا عتیق احمد القاسمی وفقہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی روانہ کردہ کتاب "فکر کی غلطی" کل موصول ہوگئی، میں اس عطیہ کیلئے بہت شکر گذار ہوں، آپ کا بھی اور محترم مبارکپوری صاحب کا بھی، وہ میرے دیرینہ کرم فرما ہیں۔ آپ حضرات کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔

اس سے قبل میں ایک خط میں وحیدالدین خاں صاحب کے بعض بیانات پر تبصرہ لکھ کر آپ کی خدمت میں بھیج چکا ہوں، وہ تاریخی نوعیت کے بیانات ہیں، خاں صاحب اس میدان میں کورے ہیں، مگر بڑھ بڑھ کر بات کرنے کی

عادت ہے ، امید ہے کہ وہ آپ کو ملا ہوگا ، آپ پڑھ کر محظوظ ہوں گے ،
میں نے جو کتاب پڑھی تھی وہ ادارہ مکتبہ تعمیر انسانیت اردو بازار لاہور
سنہ ۱۹۹۱ء کی شائع کردہ ہے ، بلا اجازت شائع کرنے کا مرض اب تو عام
ہوگیا ہے ، اس کو اب بُرا بھی نہیں سمجھا جاتا ہے ۔

ماہنامہ " دعوت و عزیمت " کا خاص نمبر متعلق وحید الدین خاں بھی
بہت خوب ہے ۔ غالباً " ندائے ملت " لکھنؤ نے بھی ایک مرتبہ خانصاحب
کے متعلق ایک معلوماتی مضمون لکھا تھا ۔

پاکستان میں خاں صاحب آئے تھے مگر کوئی اچھا تاثر چھوڑ کر نہیں گئے ۔

میں آپ کی مہربانی کا دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں ۔

احقر
محمّد سلیم

مولانا حبیب الرحمٰن ندوی

رجال السند والہند پر ایک طائرانہ نظر

"رجال السند والہند" قاضی اطہر مبارکپوری کی ایک شاہکار تالیف ہے اس کتاب نے قاضی صاحب کو شہرت دوام عطا کیا۔ اس کتاب کا خاص امتیاز یہ ہے کہ قاضی صاحب نے اس میں صرف ہندوستانی اکابرین کے حالات ہی اکٹھا نہیں کئے بلکہ انکی تحقیق بھی کی اور بتایا کہ تاریخ و تذکرہ کی کن کن کتابوں میں ان کا ذکر آیا ہے۔ اہل علم کے نزدیک اس کتاب کو اس حیثیت سے بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں مستند تاریخی حوالوں سے اسلام کی ابتدائی چند صدیوں کے ان ہندوستانی علماء فقہاء محدثین اور ارباب فضل و کمال کے حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں جنھیں بجا طور پر یہاں کے مسلمانوں میں "السابقون الاولون" کی حیثیت حاصل ہے کیونکہ شروع کے یہی وہ لوگ ہیں جنھیں پہلے پہل اسلام میں داخل ہونے اور اسلامی علوم و فنون میں مہارت حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی اسلام کے ابر کرم کے خوشگوار جھونکے انھیں کے ذریعہ ہندوستان تک آئے جس سے آج تک ہم لوگ فیضیاب ہو رہے ہیں۔ ان حضرات نے اسلام کو ان اولین معلمین سے حاصل کیا تھا جن کو صحابی رسول، تابعی یا تبع تابعی ہونے کا فخر حاصل تھا یا ان سے قریب العہد لوگ تھے جن کی بہت ساری خصوصیات ان کے شاگردوں کے اندر منتقل ہو گئی تھیں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ صدیوں پر صدیاں گذر گئیں مگر اس کے باوجود ان کے تذکرہ میں آج بھی قلب و روح کی تسکین کا بڑا سامان موجود ہے جو پڑھنے والے کے دل پر اثر کرتا اور اسے اپنی طرف کھینچتا ہے۔

قابلِ صد مبارکباد ہیں قاضی صاحب کہ انھوں نے ان اکابرین کے حالات جمع کیے اور انھیں کتابی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔

قاضی صاحب نے اس کتاب میں ساتویں صدی سے قبل کے ہندوستانی اور سندھی اصحابِ علم و فضل کے حالات جمع کیے ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۸ء میں بمبئی سے شائع ہوا۔ دوسرا بڑے اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں ۱۹۷۸ء میں قاہرہ سے شائع ہوا۔ پہلے حصہ میں ان حضرات کا ذکر ہے جو ہندوستان یا سندھ میں پیدا ہوئے اور یہیں وفات پائی یا جن کا اصل تعلق اسی سرزمین سے تھا مگر ان کی ولادت اور سکونت باہر ہوئی۔ دوسرے حصہ میں باہر سے یہاں آکر واپس چلے جانے یا باہر سے آکر قیام پذیر اور یہیں کی خاک کا پیوند ہونے والوں کا تذکرہ ہے۔

میرے سامنے اس وقت اس کا پہلا ایڈیشن ہے جو بڑی سائز کے سوا تین سو صفحات پر مشتمل ہے اس میں تین سو نو افراد کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

اس کتاب میں اپنے اکابرین کے حالات کو دیکھ کر اپنے ملک کی عظمت کا احساس ہوتا ہے کہ سمرقند و بخارا کی طرح ہمارے ملک کی سرزمین بھی کیسی زرخیز تھی کہ بڑے بڑے لوگ یہاں پیدا ہوئے اور انھوں نے علوم و فنون کی دنیا میں کیسی کیسی عظیم خدمات انجام دیں۔

محمد بن قاسم نے مظلوم عورتوں کی فریاد پر ۹۲ھ میں ہندوستان پر فوج کشی کی لیکن خود قاضی صاحب کی کتاب "العرب والہند فی عہد الرسالۃ" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کا شہرہ یہاں عہدِ رسالت ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ قاضی صاحب نے اپنی کتاب میں تاریخی حوالوں سے لکھا ہے:

"پھر جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ۶ھ ہجری کے

درمیان حدودِ عرب میں دعوت اسلام بھیجی اور صحابۂ کرام کی ایک جماعت کو اسلام کا مبلغ و داعی اور قاصد بنا کر عرب اور بیرونِ عرب کے رئیسوں حاکموں اور باحیثیت لوگوں کو خطوط بھیجے تو اس وقت عراق سے لیکر مشرقی سواحل اور یمن تک اسلام کی دعوت عام ہوئی اور ان اطراف کے عربوں کی طرح عجم فرس اور مجوس وغیرہ بھی اس کی دعوت سے تفصیلی طور پر واقف ہوئے انھیں کے ساتھ یہاں کے ہندوستانی باشندے بھی عام طور پر اسلام سے باخبر ہو کر یا تو مسلمان ہوئے اور اسلامی زندگی کا جزو بن گئے یا عام مجوسیوں کی طرح یہ لوگ بھی اپنے آبائی مذہب پر قائم رہ کر جزیہ ادا کرنے پر راضی ہو گئے اور انکو مجوس میں شمار کیا گیا ۔۔

(عرب و ہند عہد رسالت میں ص ۱۰۶ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی)

قاضی صاحب نے لکھا ہے، عہد رسالت میں جس طرح دیگر ممالک میں اسلام کا چرچا ہوا ہندوستان میں بھی اس کی شہرت ہوئی یہاں کے مذہبی لوگوں اور راجوں مہاراجوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام سے براہ راست تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی اور دعوت اسلام کو سمجھنا چاہا ۔

انفرادی طور پر جن لوگوں نے اسلام کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا وہ اسی وقت مسلمان ہو گئے تھے پھر عہد فاروقی اور عہد حضرت معاویہ تک نہ معلوم کتنے صحابۂ کرام اور تابعین عظام کے مبارک قدم یہاں آئے اور انکی تبلیغ سے کتنے لوگ اسلام سے واقف ہوئے اور انھوں نے اسلام قبول کر لیا اسی طرح ذرا تفصیل سے تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو پہلی صدی ہجری میں یہاں مسلمانوں کی تعداد دو چار دس نہیں بلکہ سیکڑوں سے بھی متجاوز ہو گئی [1]

---

[1] ان میں بہت سے اہل علم بھی ہونگے ۔

مگر قاضی صاحب نے چونکہ اپنی کتاب "رجال السند والہند" میں صرف انھیں لوگوں کے حالات لکھے ہیں جن کا ذکر تاریخ کی مستند کتابوں آگیا ہے ظاہر ہے ان کے علاوہ بھی مسلمان یہاں بڑی تعداد میں رہے جن کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں نہیں آیا اور نہ کہیں ان کے حالات لکھے گئے۔ قاضی صاحب نے اپنے اصول کے مطابق صرف انھیں لوگوں کے حالات لکھے جو خالص ہندوستانی تھے اور ان کا ذکر کسی نہ کسی کتاب میں موجود ہے۔

کتاب دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ قاضی صاحب نے اس کتاب کی تیاری میں کتنی محنت کی اور کتنی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، دو چار دس نہیں بلا مبالغہ سیکڑوں کتابیں انھوں نے پڑھیں اور نہ معلوم کتنے صفحات کے مطالعہ کے بعد انھیں صرف چند سطریں یا چند الفاظ اپنے کام کے ملے جن سے قاضی صاحب نے کام لیا اور اپنی کتاب مرتب کی۔

یہ البتہ ایک حیرتناک امر ہے کہ مسلمان یہاں آٹھ نو سو سال تک حکمراں رہے انھوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنایا اور نہ صرف یہیں زندگی بسر کی بلکہ اس ملک کو بنانے سنوارنے اور ترقی دینے کی ہر ممکن کوشش اور قربانی دی مگر اس عرصہ میں انھوں نے جامعیت کے ساتھ کوئی ایک کتاب بھی عربی یا فارسی میں نہیں لکھی جس سے یہاں کے علمار فضلار اور دوسرے ماہرینِ علوم سے واقفیت ہوتی۔ قاضی اطہر صاحب وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور ہندوستانی علمار فضلار اور اربابِ علم وفن کے جو حالات تاریخ کی کتابوں میں ادھر ادھر منتشر تھے ان کو پوری تحقیق کے ساتھ اکٹھا کیا۔

بلاشبہ قاضی صاحب کا یہ کارنامہ ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائیگا۔ علمی اور تحقیقی کام کرنے والے اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے

نمونہ کے طور پر صرف ایک مثال ملاحظہ ہو۔

قاضی صاحب اپنی کتاب میں احمد بن عبد اللہ کا تذکرہ لکھتے ہیں:

قال السمعانی فی کتاب الانساب:
احمد بن عبد اللہ بن سعید
ابو العباس الدیبلی من الغرباء
المتقدمین فی طلب العلم ومن
الفقراء والزهاد سکن النیسابور
ایام امام ابوبکر محمد ابن
اسحاق بن خزیمة وهو خانقاه
الحسن بن یعقوب الحدادی وتزوج
فی المدینة الداخلة وولد له
وکان البیت فی الخانقاه برسمه
ویادی الی اهله فی المدینة
بعد ان صلی الصلوٰة، الصلاة
فی المسجد الجامع وکان یلبس
الصوف وربما مشی حافیا،
سمع بالبصرة ابا خلیفة القاضی
وببغداد جعفر بن محمد
الفریابی وبمکة المفضل بن محمد
الجندی ومحمد بن ابراهیم
الدیبلی وبمصر علی بن عبد الرحمٰن
ومحمد بن زبان وبدمشق

سمعانی نے اپنی کتاب الانساب میں لکھا ہے۔
کہ احمد بن عبد اللہ بن سعید دیبلی متقدمین
علم کیلئے بہت زیادہ سفر کرنیوالوں
میں تھے روکھی سوکھی غذا پر قناعت
کرنیوالے بڑے عابد وزاہد تھے۔ ابوبکر
محمد بن اسحٰق بن خزیمہ کے زمانے میں
وہ نیساپور گئے اور وہیں ایک خانقاہ میں
ٹھہر گئے، وہ خانقاہ حسن بن یعقوب
حدادی کی تھی اندرون شہر انھوں نے
شادی کر لیا تھا صاحب اولاد تھے
وہ خانقاہ کے اندر ہی ایک مکان
میں رہتے تھے وہ جامع مسجد میں
عام نمازیں پڑھ کر گھر آتے تھے۔
اکثر ننگے پاؤں چلتے۔ بصرہ میں انھوں نے
ابو خلیفہ قاضی سے بغداد میں جعفر
بن محمد فریابی سے مکہ مکرمہ
میں مفضل بن محمد جندی اور محمد
ابراہیم دیبلی سے اور مصر میں علی بن
عبد الرحمٰن اور محمد عبد الرحمٰن سے
دمشق میں ابو الحسن احمد بن عمیر بن جوصا

ابا الحسن احمد بن عمیر بن جوصا وببیروت ابا عبد الرحمن مکحول، وبحران ابا عروبة الحسین بن ابی معشر وبتستر احمد بن زهیر التستری وبعسکر مکرم بن عبد الله بن احمد الحافظ وبنیسابور ابا بکر محمد بن خزیمة واقرانهم۔

وسمع منه الحاکم ابو عبد الله الحافظ وتوفی بنیسابور فی رجب سنة ثلاث واربعین وثلاثمائة ودفن فی مقبرة الحیرة۔

رجال السند والهند ص۵۰، ص۵۱

سے بیروت میں ابو عبدالرحمن مکحول سے حران میں ابو عروبہ الحسین بن ابی المعشر سے اور تستر میں احمد بن زہیر التستری سے۔ عسکر میں مکرم بن عبدالرحمن بن احمد الحافظ سے اور نیساپور میں ابوبکر محمد بن خزیمہ اور انکے ہمعصروں سے حدیثیں سنیں۔

ان کے شاگردوں میں حاکم ابوعبداللہ الحافظ تھے۔ نیساپور میں ۳۴۳ھ میں وفات پائی اور حیرہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

دیبل سندھ کے قریب ایک شہر کا نام ہے صاحب تذکرہ احمد بن عبداللہ یہیں کے رہنے والے تھے۔ حاکم نیساپوری نے کم عمری میں ان سے درس حدیث لیا تھا۔ احمد بن عبداللہ کے اساتذہ میں ایک نام محمد بن ابراہیم دیبلی کا آیا ہے جن سے انھوں نے مکہ مکرمہ میں حدیث کا درس لیا۔ علم حدیث پر پورا عبور حاصل تھا۔ بڑے محدثین میں شمار کئے جاتے تھے، وہ صاحب تصانیف بھی تھے انکی وفات ۳۲۲ھ میں مکہ مکرمہ میں ہوئی۔

خاص بات جو یہاں قابل غور ہے وہ یہ کہ اتنے قدیم زمانہ میں یہاں ایسے بلند مرتبہ عالم پیدا ہوئے جن سے خود مکہ مکرمہ میں لوگوں نے حدیث کا درس لیا۔ خود صاحب تذکرہ احمد بن عبداللہ کے حصول علم کا شوق بھی قابل غور ہے

باقی ص۱۱۲ پر

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری مرحوم

مکتوباتِ حجاز

سفرنامۂ حج

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ نے چار حج کیے، دوسرا حج ۱۹۶۵ء میں کیا "مکتوبات حجاز" کا تعلق اسی سفر حج سے ہے، کاغذ کی دو انچ چوڑی متعدد سلپوں پر یہ تحریر باریک قلم سے لکھی ہوئی ایک لفافہ میں ملی، روشنائی ہلکی پڑ گئی ہے، حروف مٹے مٹے سے ہیں جب ان سلپوں کو مرتب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ اسی سفر حج کا روزنامچہ ہے، زبان بہت سادہ، انداز بیان سہل، کسی طرح کی عبارت آرائی کی کوشش کہیں نظر نہیں آتی جو کچھ اس سفر میں گذرا اسکو سادہ لفظوں میں لکھتے گئے، آخر کا حصہ اس وقت لکھا گیا جب وہ سفر سے بمبئی واپس آگئے تھے پانی کے جہاز سے سفر کرنے کے دوران جو دشواریاں اور مشکلات حجاج کو پیش آتی تھیں اور دوران سفر جس طرح کی مصروفیات ہوتی تھیں اس کی پوری جھلک اس تحریر میں ملتی ہے جن اکابر اہل علم سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں ان کا بھی ذکر ہے۔

(اسیر ادروی)

مکتوب حجاز (۱)

آج ۱۱ مارچ (۱۹۶۵ء) کا دن مری زندگی کا دوسرا تاریخی دن ہے

اب سے دس سال پہلے ۱۹۵۵ء میں پہلی بار حج و زیارت کی سعادت نصیب ہوئی تھی، اب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دوسرے حج کی باری ہے، اب کے خالہ ظفر کی والدہ بھی ساتھ ہے، چونکہ درخواست جیبس بیس میں تھی اور یکبارگی ۱۰ مارچ کو جانا یقینی ہوگیا، اس لئے فوراً ایکسپریس ٹیلی گرام دیا، جو راستہ میں ہی ڈاک کی نذر ہوگیا اور دوسرا ایکسپریس ٹیلی گرام جو احتیاطاً دیا تھا وہ تیسرے دن مبارکپور پہونچا۔ اگر یہ بھی نہ پہونچتا تو ہم محکمہ ڈاک کا کیا بگاڑ سکتے تھے، ۱۴ مارچ کو رات میں عزیزم ظفر مسعود اپنی والدہ کو لواکر بمبئی پہونچ گئے، صبح کو مولانا محمد عثمان صاحب مبارکپوری صدر مدرس مدرسہ سراج العلوم دھولیہ بھی ملاقات کے لئے آگئے، بمبئی کے دوسرے چند احباب بھی آتے رہے۔ میں نے دیدہ و دانستہ اخبار "انقلاب" اس کی خبر نہیں دی، البتہ ۱۷ مارچ کے انقلاب میں مختصر سی خبر ناظرین کی اطلاع کیلئے دیدی، جسے دیکھ کر عزیزی محمد شمیم اور ان کی والدہ محترمہ وغیرہ والدہ ظفر مسعود سے ملاقات کے لئے آئیں نیز بھیمڑی سے محترم مولانا محمد افتخار صاحب اور مولانا محمد عارف صاحب اور الحاج عبد الغنی سیٹھ صاحب اور ان کے گھر کی عورتیں ملاقات کے لئے آئیں، اور دوپہر کا کھانا ساتھ لائے جسے کمرہ کے تمام حاضرین نے دوپہر کو تناول کیا، چونکہ آج آخری جہاز مظفری تھا اور ویٹنگ لسٹ کے حجاج آخری وقت تک آتے رہے اس لئے بہت دیر میں روانگی ہوئی، اور ۲ بجے کے قریب ظہر پڑھ کر ہم لوگ گودی آئے، ساتھ مولوی محمد عثمان صاحب مولوی محمد افتخار صاحب اعظمی اور مولوی محمد عارف صاحب اعظمی معلمان مدرسہ مفتاح العلوم بھیمڑی اور ظفر مسعود بھی گودی تک آئے مگر نئی پابندی کی وجہ سے اندر نہ آسکے، جہاز پر محترمی الحاج سیٹھ محی الدین صاحب ان کو لیکر ہم دونوں نے تمام قانونی مراحل طے کئے، اور ۲½ بجے

شب کو خدا حافظ کہہ کر جہاز پر سوار ہو گئے، سامان پہلے ہی عزیزم جلال الدین اور منور خان نے سیٹ پر لا کر رکھ دیا تھا اسلئے کسی قسم کی کوئی الجھن نہیں ہوئی، نیز محترمی الحاج محی الدین صاحب منیری اور فون ڈیا بی صاحب اور دوسرے احباب کرام نے سب کچھ کرا کر مطمئن کر دیا، جہاز پر آنے کے بعد ایک حاجی صاحب جو رانچی (بہار) کے رہنے والے تھے، پاگل ہو گئے ان کو مجبورًا اتارنا پڑا یہ منظر بڑا اندوہناک تھا، کہ ایک شخص حج کے لئے جہاز پر سوار ہو کر اتار دیا جائے اس کی قسمت میں یہ حج نہیں تھا ورنہ جہاز پر سوار ہو کر اترنے کا کوئی سوال نہیں۔ محب محترم منیری صاحب اور گرامی قدر ماسٹر محی الدین صاحب وغیرہ آخر وقت تک جہاز پر ساتھ ساتھ رہے، جہاز چھ بجے شام کو روانہ ہوا، چونکہ یہ اس موسم کا آخری جہاز تھا اس لئے بمبئی والے اپنی قدیم عادت کے مطابق آج بہت زیادہ آگئے تھے اور آخر میں گودی کے اندر آنے کی اجازت مل گئی تھی، اسلئے الوداع کا منظر بڑا دلچسپ رہا، نعرۂ تکبیر کی گونج ساحل اور جہاز سے اُٹھ رہی تھی اور دیر تک اللہ کی کبریائی کا کلمہ دونوں طرف سے بلند ہو رہا تھا، عصر کی نماز جہاز پر سوار ہونے کے بعد پڑھ لی تھی مغرب کی نماز پڑھ کر کھانا تقسیم ہوا اور عشاء کے بعد چونکہ سب لوگ دن بھر کے تھکے ماندے تھے اسلئے اپنے اپنے بستروں پر پہونچ گئے، اس جہاز میں ہر طبقہ کے اچھے لوگ تھے، علماء میں مولانا ابوالحسن صاحب حیدری غازی پوری، مولانا محمد سعید صاحب راندیری مولانا محمد عثمان صاحب جونپوری، مولانا شبیر احمد صاحب جونپوری اور ان کے ساتھی علماء، مولانا سید عبدالوہاب صاحب بخاری مدراس مولانا حامد صدیقی حیدرآبادی اور حیدرآباد کے کئی مشائخ مسلم یونیورسٹی کے فارسی کے لکچرر جناب مختار علی خانصاحب (مولانا حبیب الرحمن خان صاحب شیروانی کے

نواے) اس طرح اور بھی علمار اور مشائخ، شعرار، پروفیسر، مدرس، آفیسرس، اور صاحب حیثیت افراد تھے، ۱۸ر مارچ کی صبح کو ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا، صبح ہی ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ مسلم یونیورسٹی کے کوئی پروفیسر مجھے رات ہی سے تلاش کر رہے ہیں، میں صبح کو فرسٹ کلاس کی نشست گاہ میں گیا تو وہ صاحب خود ہی پتہ چلا کر اپنے کمرے سے تشریف لائے، یہی جناب ممتاز علی خاں صاحب تھے جنھوں نے گذشتہ سال تیرہویں صدی میں ہندوستان کی فارسی تصنیفات پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے اور اب مسلم یونیورسٹی میں فارسی کے لکچرار ہیں، صالح جوان ہیں، شکل وصورت سے پکے مسلمان اور افکار وخیالات میں نہایت روشن خیال ہیں، اور چہرے بشرے سے خاندانی شرافت ودیانت کا ظہور ہوتا ہے انھوں نے بتایا کہ میں بمبئی ہی سے آپ کی تلاش میں تھا کیونکہ میں نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ میں آپ کے علمی وتحقیقی مقالات وکتب سے کام لیا اور انکے حوالے بھی دیئے ہیں، جب میری کتاب چھپے گی تو آپ دیکھ کر خوش ہوں گے، ان کی اس سعادت مندی پر رشک ہوا اور ان کے مطالعہ کے لئے میں نے اپنی کتاب "عرب وہند عہد رسالت میں" دی اس کے بعد ان سے بار بار ملاقات ہوتی رہتی ہے۔

یوں تو سمندر بالکل خاموش، جوتے ہوئے کھیت کے مانند ہے مگر آج ہوا تیز رہی جس کی وجہ سے بعض لوگوں کو دوران سر کی شکایت رہی اور بعض معمولی طور سے بیمار بھی پڑے، اچھی خاصی ٹھنڈی ہے، ڈیک کلاس کے مسافر اپنی جگہوں پر نہایت آرام سے سوئے ہیں، اکثر کام پر حیدرآباد والوں کا قبضہ ہے، مشاعرہ وغیرہ ترتیب دیا جاتا ہے اور مخصوص رنگ کی تقریر کی جاتی ہے

مکتوب حجاز (۲)

آج ۱۹ر مارچ ہے، افغانستان کی پارلیمنٹ کے ممبر عالیجناب محمد اسلم کریمی بھی اسی جہاز سے سفر کر رہے ہیں، بڑے خلیق سیدھے سادے مسلمان آدمی ہیں اور اس تواضع و فروتنی سے پیش آتے ہیں کہ ندامت ہوتی ہے، ان کی خواہش پر میں نے حج و مناسک کے چند ضروری مسائل کو فارسی زبان میں بیان کیا، جن کو انھوں نے لکھ لیا، وہ اُردو نہیں جانتے اس لئے ان سے ساری گفتگو فارسی ہی میں ہوا کرتی ہے، انھوں نے مسلمانان ہند اور اہل بمبئی کو دیکھ کر اپنی بے انتہا مسرت کا بار بار اظہار کیا، میں نے ان کو پورے سفر میں اور جدہ وغیرہ میں اپنے ذرائع سے آرام پہونچانے اور ضروری امور میں رہنمائی کرنے کا وعدہ کر لیا ہے جس سے ان کو بڑا اطمینان ہے، خدا کرے میں ان کی خدمت کر دوں۔

آج صبح صبح مغل لائن کے اسسٹنٹ منیجر عالیجناب ... صاحب محترم موسیٰ قتال صاحب جو امیر الحجاج ہیں اور بعض دوسرے حضرات میری تلاش میں آئے اور کہا آپ ہمارے یہاں آ کر حج و مناسک کے مسائل بتائیے اور اپنا وقت اسی طرف گذاریئے۔ محترم ہاشم دادا نائب صدر انجمن خدام النبی کے ساتھ جہاز کے اسپتال کے ڈاکٹر جناب زری والا کے کمرے میں گیا وہ جوان ہونے کے باوجود بہت شریف اور با مروت معلوم ہوتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ سرکاری ملازمت سے وقت نکال کر اس سال حج و زیارت کی سعادت حاصل کریں، چونکہ وقت کم ملے گا اسلئے چند ضروری مسائل دریافت کرنے کی اجازت چاہی میں نے کتابوں کو دیکھ کر ان کو مسائل بتا دیئے، جن کی روشنی میں اگر موقعہ ملا تو وہ اس سال حج و زیارت کا انتظام کریں گے۔

فرسٹ کلاس کے حجاج جو زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ اور مالدار لوگ ہیں چاہتے ہیں کہ میں ان کے پاس زیادہ آیا جایا کروں مگر یہ صورت اہل علم کے لئے مناسب نہیں ہے، اس لئے کتراتا رہتا ہوں، پھر بھی آنا جانا رہتا ہے اور جہاں تک ہوسکتا ہے ان کو مسائل سے واقف کرتا ہوں۔ ویسے کچھ لوگ اسے اعزاز سمجھتے ہیں مگر درحقیقت یہ علم دین کی توہین ہے کہ علمار کو بلا کر ان سے مسئلہ پوچھا جائے، یہ دوسری بات ہے کہ اہل علم ان لوگوں کو صحیح مسئلہ بتانے کی خدمت اپنے ذمہ لیں اور ان کی رہنمائی کر کے اپنی ذمہ داری پوری کریں اسی وجہ سے میں کبھی گاہے گاہے جاتا رہتا ہوں۔

محترم منیری صاحب نے بار بار تاکید فرمائی تھی کہ تمہارے لئے اونچے درجے کے کھانے کا انتظام کرا دیا ہے آپ اسے منظور کرلیں۔ میں نے کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے ویسے آپ فرمائیں تو میں اس کا پیسہ ادا کروں مگر انھوں نے منظور کرنے سے انکار کیا اس کے باوجود میں نے اس سے بچنا چاہا، جہاز کے اسسٹنٹ مینیجر نے بھی جہاز میں کہا مگر میں نے انکار کردیا۔ البتہ جناب مجید کشمیری صاحب (جو جہاز کے مطبخ کے ذمہ دار ہیں) کے بے تکلفانہ اصرار بلکہ پرخلوص جبر کی وجہ سے مجھے مجبور ہونا پڑا۔ وہ برابر اونچے درجہ کا کھانا دونوں وقت مع چائے اور ناشتہ کے بھجواتے رہتے ہیں۔

۲۰ر مارچ کا دن بھی معمول کے مطابق نہایت اچھا گذرا، پورے جہاز میں سب خیریت ہے، تبلیغی جماعت والے فضائل کے ساتھ بعض اوقات مسائل بھی بیان کردیتے ہیں اس لئے دوسرے علمار کو جو اونچے قسم کے ہیں ہم سفر ہیں کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی وہ اپنے اصول کے مطابق یا غلطی سے کسی دوسرے عالم کو اس کا موقعہ ہی نہیں دیتے ہیں۔

امیر حجاج جناب موسیٰ قتال صاحب اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں

دس بجے دن میں جہاز کے عملہ کے ساتھ گشت لگاتے ہیں، پھر بارہ بجے تک اپنے طور پر حجاج کی خبر گیری کرتے ہیں، ویسے زبان خلق سے کون بچ سکتا ہے، محترم ہاشم دادا صاحب انجمن خدام النبی کے ذمہ دار ہونے کی حیثیت بڑی تندہی سے حجاج کی خدمت کرتے ہیں اور جب دیکھو کسی نہ کسی خدمت میں لگے رہتے ہیں ویسے خادم الحجاج کا بیج لگا کر بہت سے لوگ گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں، کھانا مناسب ہوتا ہے مگر بعض لوگ شکایت کرتے رہتے ہیں، اور کھانے سے زیادہ کھانے کی شکایت میں لذت پاتے ہیں، البتہ اس سلسلے میں دو باتیں قابل غور ہونی چاہئے، دوپہر کو عام طور سے صرف چاول دیا جاتا ہے، اچھا خراب کی بحث سے اٹھ کر صرف چاول دینا ہمارے نزدیک مناسب نہیں ہے، صرف چاول کھانا بہت سی لوگوں کی عادت میں نہیں ہے بلکہ یا تو وہ روٹی کے عادی ہیں یا چاول کے ساتھ روٹی کے بھی عادی ہیں، اس لئے ایسے لوگوں کو ایک وقت صرف چاول کھانے سے تکلیف ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ صبح کو ناشتہ میں عام طور سے صرف ایک توس سینکا ہوا دیا جاتا ہے یہ ناشتہ بقدر بادام عام حجاج کے لئے بہت ناکافی ہے، تیسرے درجے کے حجاج عام طور پر محنت کش اور کام دھندے والے ہوتے ہیں وہ صبح کو ناشتہ کے نام پر اچھی خاصی غذا کھانے کے عادی ہوتے ہیں ان کو روٹی کا ایک ٹکڑا بالکل ناکافی ہے دونوں کھانوں میں جو سخاوت کی جاتی ہے اس کا ایک حصہ بچا کر ناشتہ میں زیادہ کھانا دے دیا جائے تو اچھا ہو۔

امیر الحجاج اگر مذہبی امور کی براہ راست معلومات زیادہ نہیں رکھتا تو اسے چاہئے کہ جہاز میں سفر کرنے والے ہر خطہ کے علماء کو جمع کرکے ان سے دینی خدمت لے اور ان کے لئے حلقہ مقرر کرائے، اسی طرح نماز وغیرہ کے

انتظام میں ان سے کام لے ۔ جہاز کا عملہ اور ملازمین حجاج کے ساتھ نہایت اخلاق سے پیش آتے ہیں ۔

مکتوب حجاز (۳)

۲۰ مارچ ۔ افغانستان کے دو حاجیوں کے علاوہ اسی جہاز سے نیپال کے ۴۹ حاجی جا رہے ہیں جن کو پہونچانے کے لئے نیپال پارلیمنٹ کے ایک مسلمان ممبر بمبئی آئے ہوئے تھے ۔ ان میں بعض لوگ اچھے خاصے تعلیمیافتہ ہیں ، آج ان سے ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ نیپال کے مسلمان ادھر دس بارہ سال سے تعلیمی اور اقتصادی و ثقافتی معاملات میں ترقی کر رہے ہیں اور کئی مسلمان طالب علم امریکہ ، روس ، چین اور ہندوستان وغیرہ میں حکومت نیپال کی طرف سے اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں اور حکومت میں ملازم بھی ہیں ، ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نیپال میں قصاب ہندو ہی ہوتے ہیں ، البتہ اب کچھ مسلمان قصاب ہندوستان سے جا کر آباد ہو گئے ہیں ، یہ بھی معلوم ہوا کہ وہاں کے غیر مسلم بھینس بھینسا کا گوشت عام طور سے کھاتے ہیں ، دسہرے پر مندروں میں لا کر جانور (سوائے بیل گائے کے) ذبح کئے جاتے ہیں اس دن بھینس اور بھینسے کا گوشت سڑکوں پر اس طرح بکتا ہے جیسے بھاجی ترکاری کا ٹھیلہ ہوتا ہے اور غیر مسلم اپنی اپنی استطاعت بھر خوب خریدتے اور کھاتے ہیں ۔ مسلمانوں کو بھی گائے اور بیل کے علاوہ ہر قسم کے جانور کی قربانی اور ذبیحہ کی اجازت ہے ، یہ بھی معلوم ہوا کہ وہاں پر یورپ و ایشیا کے مختلف ممالک کے سامان بکثرت و بکفایت آتے ہیں اور سستے بکتے ہیں ، نیپال کے مسلمان مجموعی طور سے اقلیت میں ہونے کی وجہ سے پسماندہ ہیں الا کہ اپنے لئے کچھ کرتے ہیں یا کر رہے ہیں

۲۱ مارچ کو امیر الحجاج جناب قنال صاحب نے جہاز کے کپتان اور افسران

کے اعزاز میں ایک ٹی پارٹی دی جس میں تقریباً پچاس افراد شریک ہوئے ان میں پروفیسر، انجینیر، تاجر، تعلیم یافتہ زیادہ تھے، شام کو ساڑھے پانچ بجے یہ تقریب منعقد ہوئی، خورد و نوش کے پہلے قتال صاحب نے کپتان کی خدمت حجاج اور ہر قسم کے تعاون پر اظہار اطمینان کیا اور مختصر سی تقریر میں بتایا کہ موصوف اور ان کے عملے نے ہمارا پورا تعاون کیا اور اپنی ہر قسم کی خدمت پیش کی، اس کے جواب میں کپتان نے بھی تقریر کی اور ان کی اس قدر دانی اور ہمت افزائی کا شکریہ ادا کیا، نیز امیر الحجاج صاحب نے چند حضرات کی طرف سے مغل لائن کو بمبئی ایک ٹیلی گرام روانہ کیا جس میں جہاز کے عملہ کی خدمات کو سراہا گیا ہے، یہ جلسہ بہت خوب تھا جو امیر الحجاج کی طرف سے جہاز کے عملہ و افسران کی خدمات کو سراہنے کیلئے کیا گیا۔

۲۲ مارچ کو جہاز عدن میں رکا، کئی دنوں کے بعد خشکی نظر آئی، پہلے ہی سے تیل بردار جہاز نظر آنے لگے، حجاج ذوق و شوق میں ادھر اُدھر آنے جانے لگے، دیار پاک کے آثار نظر آنے لگے اور عرب کا ملک شروع ہو گیا، جہاز دن میں دو بجے عدن کے ساحل سے کچھ دور کھڑا ہوا، تیل اور پانی اور دوسری ضروری اشیاء لینی ہیں، ابھی جہاز رُوز ہی تھا کہ ساحل عدن سے ایک لانچ پر سوار ہو کر وہاں کا افسر آیا اور لکڑی اور رسی سے بنی ہوئی معمولی سیڑھی کے ذریعہ جو پہلے سے لٹکا دی گئی تھی نہایت صفائی سے اوپر چڑھ آیا۔

عدن تاریخ کے قدیم زمانہ سے یورپ اور ایشیاء کے درمیان بہت بڑا تجارتی مرکز رہا ہے۔ ہندوستان اور چین کے ساتھ مشرق کے سامان یہاں لائے جاتے تھے اور پھر یہاں سے عرب ہو کر خشکی یا بحری راستہ سے یورپ تک جاتے تھے اس کے باوجود یہ مقام بہت ہی مختصر بظاہر

بے حیثیت اور غیر آباد رہا مگر انگریزوں نے اس کو ترقی دے کر بڑا اہم مقام
بنادیا ہے، عدن کے کئی نواحی ہیں نواحی شیخ عثمان اور عدن گریٹر وغیرہ
ساحل سے متصل ہیں، عدن بالکل جدید طرز کا شہر ہے جس میں دنیا بھر کی
قومیں آباد ہیں برطانوی پالیسی نے اس علاقہ کو بالکل غیر عرب بنانے کی
کوشش کی تھی، آس پاس کے امراء وشیوخ کو لیکر ایک اتحاد الجنوبی العرب
کے نام سے ایک پارلیمنٹ بنائی ہے مگر اب یہ جادو بھی لوٹ رہا ہے اور آزادی
کی تحریک کا زور ہے۔ چنانچہ اس وقت عدن میں شدید نگرانی ہے اور ہر جگہ
پولیس کا سخت پہرہ ہے عدن کے پیچھے پہاڑوں اور صحراؤں میں قدیم قبائل
آباد ہیں، قوم عاد اسی نواحی میں تھی جس میں شداد نامی بہت بڑا نافرمان ظالم
اور صاحب اقتدار گذرا ہے اس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس نے یہاں
کے پہاڑوں میں اپنی جنت بنائی تھی ساحل کے قریب انگریزوں نے شداد کی
جنت بنادی ہے، جہاز رات کے ایک بجے کے بعد وہاں سے نکلا تو یہاں
کے شہر اور ساحل کی قسم قسم اور رنگ برنگ کی روشنیاں عجب نظر نواز منظر
پیش کر رہی تھیں بہت دیر تک یہ منظر دیدنی تھا، دو ایک کشتی والے سامان
فروخت کرنے آئے مگر زیادہ کامیاب نہیں رہے کیونکہ اب ہندوستانی حجاج
کے پاس روپیہ پیسہ بہت کم ہوتا ہے ورنہ پہلے یہاں جب جہاز ٹھہرتا تھا
تو خوب خرید و فروخت ہوتی تھی، جب جہاز ساحل عدن سے نکل کر کچھ دور
گیا تو پھر اسی سیڑھی سے عدن والا افسر بڑی صفائی سے اُتر کر ساحل سے آکر
جہاز میں لگ جانے والی موٹر کشتی میں بیٹھ گیا۔

عام خیال تھا کہ بحر احمر میں جہاز داخل ہونے کے بعد گرمی زیادہ ہوگی مگر
معاملہ اُلٹا ہوگیا، سردی، ہوا، اور جہاز کی حرکت زیادہ ہوگئی جو ۲۳ کی صبح
تک باقی رہی، پوری رات تند و تیز ہوا چلتی رہی اور جہاز ہچکولے کھاتا رہا۔

بہت سے حجاج جو اب تک خوش و خرم چلتے پھرتے تھے بستر پر سر رکھنے پر مجبور ہو گئے مگر مجموعی اعتبار سے یہ زیادہ پریشانی نہیں ہے۔

مکتوب حجاز (۴)

۲۲ر مارچ کو جہاز بحر احمر میں چل رہا ہے اور خلاف معمول اس سال اس سمندر میں سردی، ہوا اور موج زیادہ ہے، حالانکہ اس میں ہر طرف سکون اور گرمی ہوتی ہے، عورتوں کو عام طور سے دوران سر کی شکایت پیدا ہو گئی کچھ کمزور دماغ مرد بھی اس میں مبتلا ہیں، خالد و ظفر کی والدہ آج بستر پر رہی حالانکہ بمبئی سے ابتک کوئی شکایت نہیں پیدا ہوئی تھی اور نہایت صحتمندی کے ساتھ ہر طرف آنا جانا تھا مگر یہ صورت حال وقتی ہے، صرف دوران سر ہے، رات ایک حاجی صاحب جو پہلی مرتبہ حج کو جا رہے ہیں اور معمر ہیں اپنے ملاقاتی کو اس طرح ہدایت دے رہے تھے جیسے انھوں نے بار بار حج فرمایا ہے اور وہاں کے حالات سے بخوبی واقف ہیں، ان کی گفتگو ہدایات لئے ہوئے تھی مگر شکایات سے پُر تھیں معلم ایسا کرتے ہیں، یوں لوٹتے ہیں، قربانی کا جانور پیسہ لے کر نہیں دیتے، دلالی کرتے ہیں اور جہاز پر تیسرے درجہ کا کھانا نہایت خراب ملتا ہے اور مغل لائن کمپنی ان سے روپیہ لے کر اچھا کھانا نہیں دیتی، میں ایک طرف بیٹھا ہوا ان کی باتیں سُن رہا تھا، انھوں نے شاید مجھے دیکھا نہیں تھا اس لئے کہنے لگے کہ ہمارے قریب ہی ایک مولوی صاحب ہیں جن کا کھانا فرسٹ کلاس سے دونوں وقت آ رہا ہے اور ناشتہ چائے الگ سے آتا ہے، وہ ٹھاٹ سے کھاتے پیتے ہیں اس پر دونوں نے کہا کہ یہ مولوی صاحب مغل لائن اور جہاز والوں سے کھانے کی شکایت کیسے کر سکتے جبکہ ان کو وہاں سے کھانا مل رہا ہے اسی قسم کے لوگ اپنا فائدہ کر کے حجاج کی تکلیف کا باعث بنتے ہیں وغیرہ وغیرہ

زبان خلق کو کوئی روک نہیں سکتا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو بد گمانی سے بچائے۔
اس سفر میں میرے لئے بڑی سرد سامانی رہی بر وقت منظوری کی وجہ
سے ساتھی بھی نہ مل سکے مگر جناب شیخ محمد خاں صاحب ضلع گونڈہ والے
کا ہاتھ رہا جن کی وجہ سے مجھے کافی آرام رہا، یہ صاحب بڑی عقیدت
سے ہم لوگوں کی خبر گیری کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔
ایک تکلیف بڑی شدید یہ رہی کہ حاجی اپنے ہمراہ تمام ہندوستانی
نوٹ نہیں لاسکتے بلکہ اگر کچھ ملتا ہے تو حج نوٹ کی شکل میں، تاکہ جہاز
پر اپنی ضروریات پوری کر سکیں، مگر جہاز پر صورت یہ ہے کہ عام ہندوستانی
نوٹ لیا نہیں جاتا اور حج نوٹ کیلئے یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ دس
روپیہ جمع کر کے آخر تک اس کا سودا خرید کر کے ختم کر دیں یہ نہیں کہ اسے
بھنا کر دو چار روپے کی چائے وغیرہ پی سکیں اسلئے یا تو حج نوٹ ویسا
ہی رکھے رہیئے یا پھر اس طرح خرچ کیجیئے کہ سب کا سب جہاز کی دکان
پر ختم ہو جائے اس وجہ سے سخت پریشانی رہی اور حج نوٹ لینا بالکل بیکار
ثابت ہوا حالانکہ حجاج کو ان کے حساب میں اگر دس پانچ روپیہ چاہیں عام
ہندوستانی نوٹ دینا چاہیئے، مغل لائن ہندوستانی کمپنی ہے اس میں
غیر ملکی زر مبادلہ کا چلن خلافِ اصول ہے بلکہ ایک ہزار کے علاوہ دس پانچ
روپیہ جہاز میں خرچ کرنے کے لئے دینا چاہیے کیونکہ یہ رقم باہر نہیں جاتی جس
طرح کہ غلہ کپڑے کی رقم ہندوستان میں رہ جاتی ہے اس طرح یہ رقم ہندوستانی
جہاز میں رہ جاتی ہے آئندہ اس طرف خصوصی اور فوری توجہ کی ضرورت ہے،
حاجی جہاز میں یا تو دس روپیہ خرچ کر دیں یا ایک پیسہ بھی نہ خرچ کریں، یہ
طریقہ نہایت پریشان کن اور غلط ہے یا پھر جہاز میں کسی قسم کی خرید و فروخت
کا معمول ہی ختم کر دیا جائے۔

۲۴ مارچ کی صبح کو ناشتہ کے بعد جہاز کے وقت سے ۱/۲ ۹ بجے میری تقریر جہاز کے انٹر کام سے ہوئی، مائک پر ایک خاص حلقہ کا قبضہ ہے، حالانکہ اور بھی بہت سے اچھے اچھے اہل علم اس جہاز میں چل رہے ہیں مگر ان کی خدمت نہیں حاصل کی جاتی، البتہ دو تقریریں مولانا سید عبدالوہاب بخاری اور آج میری ایک تقریر ہوئی، چونکہ آج احرام بندھنے والا ہے اسلئے میں نے احرام کے مسائل پر زور دیا ایسے ہفتہ بھر سے فضائل بیان کئے جاتے تھے اور مسائل پر توجہ کم تھی اسلئے ضرورت تھی کہ فضائل کے بجائے مسائل بیان کئے جائیں، چونکہ گذشتہ تقریریں ایک خاص طبقہ مشائخ سے تعلق رکھتی تھیں اور زبان و محاورہ کے لحاظ سے مخصوص رنگ کی تھیں اسلئے میری تقریر میں لوگوں کو نیا پن محسوس ہوا اور زبان کے اعتبار سے بھی تبدیلی معلوم ہوئی پھر بر وقت مسائل تھے اسلئے الحمدللہ مجموعی اعتبار سے اچھی رہی اور حجاج سے مسرت آمیز تاثر معلوم ہو رہا تھا۔ سطور ہذا کی تحریر کے وقت دنیا میں جہاز کے وقت سے ساڑھے دس کا وقت ہے ہندوستان میں تو ۱۲ سے زیادہ ہوگیا ہوگا آج سویرے کھانا تقسیم ہو رہا ہے اور لوگ کھانے پینے میں مصروف ہیں تاکہ جلد فارغ ہوکر نہانے دھونے اور احرام باندھنے میں لگ جائیں، آج شام کو پانچ بجے تک یلملم کا سامنا ہوگا اس سے پہلے احرام بندھ جائے گا میں نے صبح چار بجے ہی اٹھ کر کھاری پانی ہی سے غسل کر لیا ہے کیونکہ دن میں میٹھے پانی پر بڑی بھیڑ رہیگی حالانکہ فرسٹ کلاس والے متعارف اور قدر داں حضرات بار بار کہہ چکے ہیں کہ آپ دونوں ہمارے یہاں آکر غسل کریں مگر وہاں بھی بھیڑ بھاڑ ہے اس لیئے ان کے شکریہ کے ساتھ وہاں نہیں گیا۔

مکتوب حجاز (۵)

جہاز مظفری تقریباً دس گھنٹے تک عدن میں رکا رہا جس کی وجہ سے جدہ دیر میں پہونچا۔ ۲۵ر مارچ جمعہ کو دس بجے کے قریب جدہ کے سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ اس کی چھوٹی سی گودی پر دونوں طرف دو جہاز لنگر انداز ہیں جن میں سے ایک اسلامی تھا جو ۱۲ر مارچ کو بمبئی سے چلا تھا قاعدہ سے اُسے دو روز پہلے پہونچنا چاہئے تھا، کچھ دن کے بعد بحر احمر میں تموج کی وجہ سے لیٹ ہو گیا، مظفری جہاز کو گودی خالی ہونے کے انتظار میں ساحل سے دور ٹھہرا رہا یہاں تک کہ تقریباً تین بجے اسلامی جہاز اپنے حجاج کو اُتار کر باہر نکلا تو مظفری داخل ہوا اور چار بجے کے قریب تمام مسافر اُترے، معمولی اور مختصر سامان تو خود اپنے ہاتھ میں لیا اور بڑے بڑے سامان جہاز ہی پر چھوڑ دیا تاکہ سعودی عرب کے قلی ان کو اُتار کر کسٹم میں پہونچا دیں، یہاں کے اصول کے مطابق حجاج اترتے ہی موٹر پر سوار کئے جاتے اور کسٹم ہاؤس سے متصل نقابہ میں پہونچا دیے جاتے ان کے پیچھے لاری میں ان کے سامان پہونچائے جاتے تھے۔ اسی طرح حجاج اور ان کے سامان الگ الگ جاتے تھے، نقابہ میں پاسپورٹ کی جانچ اور معلم کی تعیین ہو گی اس سے باہر متصل ہی کسٹم ہاؤس ایک وسیع و عریض ہال کی شکل میں ہے جس میں چبوترے بنے ہوئے ہیں انھیں پر حجاج کے سامان اس طرح ایک ساتھ رکھ دیئے گئے کہ نہ حجاج کا پتہ چلتا ہے اور نہ سامان کی خبر لگتی ہے پہلے سے بتایا گیا تھا کہ جہاز کے فلاں نمبر کے درجہ یا ڈیک کا سامان کسٹم ہاؤس کے فلاں حصہ میں رکھا جائے گا تو حاجیوں کو اپنا سامان تلاش کرنے میں مشکل نہ ہوتی، مگر ایسا نہ ہوا، بلکہ ایک طرف سے موٹریں گودی سے سامان لاد لاد کر یہاں گراتی جاتی تھیں، تمام سامان

کسٹم ہاؤس میں بکھرا ہوا تھا، کسی حاجی کو دو سامان یک جگہ نہیں ملتے وغیرہ
یہ کہ رات کے آٹھ بجے تک سامان آتے رہے اسی میں حجاج بے حال اور کسٹم
افسران سب کے سب ایک رنگ میں نظر آنے لگے۔ عرب کے قلی اردو قسم
کے ہوتے ہیں اور زبان نہیں سمجھتے، غیر حاجی کے اندر جانا ممنوع ہوتا ہے
یہ وقت بڑی پریشانی کا ہوتا ہے۔ دس سال پہلے جو پریشانی اس موقع پر
ہوتی تھی اس میں ذرا بھی کمی نہیں آئی حالانکہ کسٹم ہاؤس میں کافی تبدیلی
ہوئی ہے اگر سعودی حکام اس کی طرف معمولی توجہ کریں تو حجاج کو سرزمین حجاز
پر اترتے ہی پریشان کن بدنظمی سے نجات مل جائے اور سعودی حکام کو بھی
اطمینان حاصل ہو۔

عزیزم مولوی خالد کمال مبارکپوری سلمہٗ دو دن پہلے جدہ آ گئے تھے
بلکہ مسلم زین العابدین کالو اور عزیزی ممتاز احمد جاوید کو بھی میرے آنے کی ٹیلیگرام
سے اطلاع دے چکے تھے چونکہ وہ کسٹم ہاؤس سے باہر تھے اسلئے ملاقات
نہ ہوسکی عزیزی ممتاز احمد جاوید سے ملاقات ہوئی جو جدہ میں ڈیکن حسن
نظار کے معتمد ہیں اور اسی حیثیت سے کسٹم ہاؤس کے پاس موجود تھے انھوں
نے خالد کمال کو خبر دی نیز جامعہ اسلامیہ کے بعض طلبہ سے یہیں ملاقات
ہوئی اور اس پریشانی کے ہنگامہ میں بڑا سکون حاصل ہوا اسی دوران میں
ہندوستانی سفیر محترم مدحت کامل قدوائی صاحب سے ملاقات ہوئی اور وہ
بغیر کسی سابقہ تعارف و تعلق کے بڑی خندہ پیشانی اور اخلاق سے ملے،
انھوں نے رک کر باتیں کیں اور پان پیش کیا پھر رات میں کافی دیر تک
مدینۃ الحجاج میں ان سے گفتگو رہی بڑے شریف النفس آدمی معلوم ہوئے
ہیں۔ اور اپنے فرائض کے ساتھ حجاج کی خدمت حتی الامکان کرتے ہیں
اسی نقابہ میں حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب (رفیق دیوبند) سے

ملاقات ہوئی. جو ہندوستانی سفارت خانے میں مترجم کی حیثیت سے رہتے
ہیں، معارف، البلاغ، ثقافۃ الہند اور میری تصنیفات کے ذریعہ
مجھے پہلے سے جانتے تھے اور ملاقات کے متمنی تھے، بڑے تپاک اور اخلاق
سے ملے اور اسی لقاء میں علمی وتحقیقی گفتگو ہونے لگی، رجال السند والہند
اور ۔ ہند وعرب عہد رسالت میں، کا تذکرہ آیا اور اس کے بعض مباحث کا
عربی ترجمہ جو ثقافۃ الہند حکومت ہند کے سرکاری پرچے میں چھپا وہ
اس کی افادیت واہمیت پر گفتگو کرتے رہے اور بتایا کہ اس کی اہمیت
کے پیش نظر حکومتِ ہند سے مزید پرچے طلب کئے گئے ہیں عصر کی نماز
کسٹم ہاؤس میں پڑھی گئی اور چار بجے دن سے لے کر دس بجے رات تک اسی
جنجال میں رہے خدا کے فضل سے سب سامان مل گئے، مگر نئے بکس کا کچومر
اس طرح نکل گیا کہ اس کی صورت نہیں دیکھی جاتی تھی، حالانکہ جہاز سے
آتے وقت اصلی حالت میں حفاظت سے رکھ دیا تھا مگر جہاز سے کسٹم ہاؤس
تک ہی آنے میں اس کا حلیہ بگڑ گیا اب رہی سہی کسر مکہ میں پوری ہوگی دس
بجے رات میں جدہ کے مدینۃ الحجاج پہونچے جو آفاقیوں سے بھرا ہوا تھا، اب
اس میں بہت زیادہ توسیع اور تعمیر ہوگئی ہے، کمرے نہایت آرام دہ،
پانی بہ افراط، پیشاب خانہ اور پاخانہ کا بہترین انتظام ہوگیا ہے، روشنی
اور پنکھے بھی ہیں، الغرض مدینۃ الحجاج کی عمارتیں بہترین اقامتگاہ بن گئی
ہیں، یہاں آنے پر بمبئی کے پرانے مخلص رفیق مسٹر رفیق مسٹر عبدالرحیم
انصاری صاحب سے ملاقات ہوئی جو پہلے ہندوستانی سفارت خانے
سے وابستہ تھے اور اب ایک اور ادارہ سے وابستہ ہیں، الحمدللہ کہ
عبدالرحیم انصاری بہت مطمئن ہیں اور اخلاق وشرافت میں اپنا وہی
پرانا معیار قائم کئے ہوئے ہیں ۔ عزیزی مختار احمد جاوید تو کہنا چاہیے کہ

میرے گھر کے ایک فرد ہی ہیں انھوں نے بہت آرام پہونچایا، خالد کمال اور مختار احمد جاوید دونوں ہماری خدمت میں یکساں تھے، تکلیف اور پریشانی سے بچنے کے لیے جدہ سے مکہ کا بس کا تمام کرایہ بھر کر واپس لے کر دوسرے دن تیس ریال پر ٹیکسی کرکے مکہ مکرمہ آئے اور مغرب کی نماز پڑھ کر طواف وسعی کرکے عمرہ ادا کیا۔

مکتوب حجاز (۶)

دن میں شہر جدہ میں جانا ہوا، دس سال پہلے ہی جدہ جدید طرز کا خوبصورت شہر بن چکا تھا اس مدت میں اس کی ترقی کہیں سے کہیں پہونچ گئی، تاریخوں اور سفر ناموں میں جدہ کے بارے میں جو پڑھا تھا افسانہ معلوم ہو رہا تھا اب اس کی کوئی علامت نظر نہیں آتی، سر بفلک عمارتیں لمبی چوڑی سڑکیں اور غیر ملکی سامان تجارت سے پٹے ہوئے بڑے بڑے بازار اور دکانیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی افسانوی شہر ہے غیر ملکی کمپنیوں کے دفاتر اور شہر کی چہل پہل قابل دید ہے، اور اس میں خاص بات یہ ہے کہ فٹ پاتھوں اور سڑکوں کے درمیان ہرے بھرے درخت اور پھول پتے ہر طرف نظر آتے ہیں جگہ جگہ پارک ہیں قیمتی موٹریں سنکتی پھرتی ہیں اور لوگوں کے چہروں پر بے نیازی اطمینان اور سکون کی لہر دوڑتی ہے، دولت و ثروت کی بہتات کا عالم یہ ہے کہ جس دکان اور سامان کو دیکھئے تو جی چاہتا ہے کہ دیکھتے رہیے یہ بات ضرور ہے کہ سارا کھیل غیر ممالک کا مرہون منت ہے اور عربوں کی دولت ایک طرف سے آتی ہے تو دوسری طرف چلی جاتی ہے مگر سکون و اطمینان میں یہ تصور ذرا بھی مخل نہیں ہے، جو ممالک اسی چکر میں ہیں ان میں سے اکثر کا حال نہایت خراب و خستہ رہتا ہے اور وہ ضروریات زندگی تک کیلئے ترستے رہتے ہیں، تواریخ در حالات

کی کتابوں میں جدہ میں حضرت حوا کے مزار کا تذکرہ ملتا ہے مگر تاریخی اعتبار سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور ہو بھی نہیں سکتا ہے، حضرت آدم و حوا کی تاریخ قرآن و حدیث میں جو کچھ ہے اس کے علاوہ ظن وتخمین کی بات ہے بہرحال ہم لوگ بھی حضرت حوا کے مزار کی جگہ پر گئے جو شہر جدہ کے کنارے ایک گھیرے ہوئے علاقہ میں ہے دروازہ بند تھا۔ باہر نذرانہ یا بخشش وصول کرنے والے بیٹھے تھے، مصری مرد اور عورتیں باہر سے جھانک جھانک کر دیکھتے تھے اور نذرانہ پیش کرتے تھے۔

ہمیں محافظ نے دروازہ کے سوراخ سے قریب کی ایک جگہ کی طرف اشارہ کیا کہ اس جگہ حوا کی قبر تھی اب وہاں کوئی علامت نہیں ہے بلکہ میدان ہے، ہم نے ایک نظر ڈالی اور بغیر کچھ نذرانہ دیے اپنی راہ لی، ترکوں کے دور کو بدنام کیا جاتا ہے کہ وہ ہر متبرک مقام محفوظ کر کے نذر و نیاز وصول کرتے کراتے تھے اور وہاں کے نگراں اس مقام کی فضیلت اور اہمیت بیان کر کے زائرین کو زیارت کراتے اور نذرانے وصول کرتے تھے مگر آج بھی تقریباً یہ عمل جاری ہے، ایسے تمام آثار کو ختم کر کے ان کی جگہ پولیس متعین کر دی گئی ہے، تاکہ کوئی شرک و کفر نہ کرنے پائے، مگر یہ پولیس والے عام طور سے رشوت اور بخشش کے نام پر پیسے وصول کرتے ہیں، اور زیارت کا خصوصی موقع دیتے ہیں، حتیٰ کہ حجر اسود کے استلام کیلئے بھی اب یہ طریقہ کھلم کھلا جاری ہو گیا ہے، ایک دو ریال لیکر سروں کو پکڑ پکڑ کر بوسہ دلایا جاتا ہے جبکہ عام لوگوں کے اژدحام کو بیدردی سے ہٹایا جاتا ہے۔

مکہ مکرمہ دس سال کے بعد مکہ مکرمہ میں داخلہ ہوا تو پورا شہر بدلا ہوا نظر آیا اور یقین نہیں ہوتا تھا کہ یہ وہی مکہ مکرمہ ہے جو وادی غیر ذی زرع کے نام سے موسوم ہے، کئی میل تک شہر پھیل گیا ہے، کئی کئی طبقہ کی شاندار جدید طرز کی عمارتوں کا سلسلہ لمبی چوڑی سڑکوں کا جال، چوڑی خوبصورت فٹ پاتھ

دوردیہ آمد و رفت کا انتظام، جگہ جگہ حسین و جمیل ہرے بھرے پارک، پانی کے فوارے، قسم قسم کے پھول پتے الغرض شہر کا نشیب و فراز اپنے اندر جدت پسندی کا پورا سماں لئے ہوئے ہے مکہ کی آبادی پہاڑیوں پر زیادہ ہے۔ راتوں کو رنگ برنگ کی روشنیاں عجیب معلوم ہوتی ہے، ان دنوں سارا مکہ انسانوں کیلئے گود بنا ہوا ہے، کئی لاکھ کی اسکی آبادی کے ساتھ ساتھ کئی لاکھ انسان باہر سے آگئے ہیں، حالانکہ حکومت نے ترکی، شام، اردن، ایران اور دوسرے قرب و جوار کے ممالک کے موٹروں پر آنے والے حجاج کیلئے، شہر کے باہر قیام کا انتظام کیا ہے، جہاں وہ اپنی سیکڑوں ہزاروں موٹروں پر رہتے ہیں، اور شہر میں نماز و طواف کیلئے آتے ہیں پھر بھی بھیڑ کا یہ حال کہ ہفتوں تک گلی کوچوں کی تمیز نہیں ہو سکی ہر مکان اور ہر میدان صحن معلوم ہوتا تھا۔

جدید حرم حرم محترم کی جدید توسیع و تعمیر کا کام بغیر دیکھے ہوئے صحیح طور سے نہیں سمجھا جا سکتا پوری دنیا میں اب کوئی عبادت خانہ اس سے بڑا نہیں رہ گیا ہے، حکومت سعودیہ نے پچاس کروڑ ریال سے زائد صرف کرکے اسلامی تاریخ میں اپنا الگ باب ثبت کر دیا ہے۔ عقل و نظر دونوں ہی اس عمارت کو دیکھ کر مبہوت ہو جاتی ہیں، پرانے حرم کا اکثر حصہ باقی ہے اسکے بعد سے حرم کی تعمیر ہوئی ہے، کام جاری ہے اس کے بارے میں بعض ارباب دل کا کہنا ہے کہ ترکوں کے قدیم حرم میں جو جاذبیت اور روحانیت نماز میں محسوس ہوتی ہے وہ بات جدید حرم میں نہیں ہے۔ حرم کی تیسری منزل پر نماز پڑھتے وقت کعبہ شریف اسکے نیچے معلوم ہونے لگتا ہے جو بجائے خود نامناسب بات ہے چنانچہ راقم ایک مرتبہ سب سے اوپر کی منزل میں نماز پڑھنے گیا تھا پھر اسکے بعد نہیں گیا۔ بہر حال حرم اور مسلم سلاطین کی تاریخ میں حرمین شریفین کی تعمیر و توسیع اور تجدید کا یہ کارنامہ صرف حکومت سعودیہ ہی کا حق ہے۔

عمرہ کی ادائیگی

جیسا کہ کہا گیا، ہم لوگ اپنے طور پر شام کو مکہ مکرمہ پہنچے اور مغرب پڑھ کر عمرہ ادا کیا گیا۔ اللہ اکبر، انسانوں کے سمندر میں اپنا گذر بڑا مشکل معلوم ہوتا تھا ڈھائی ہزار میل پانی کا سفر طے کر کے نہایت آسانی سے یہاں آ گئے تھے مگر یہ انسانی سمندر اتھاہ معلوم ہوتا تھا خدا خدا کر کے بیت اللہ شریف کا طواف کیا اور بڑی مشکل سے زمزم شریف پی سکے اور جب سعی میں پہونچے تو وہاں اس سمندر میں شدید روانی تھی، دنیا بھر کے مختلف ممالک کے مسلمان طواف اور سعی میں دوش بدوش معروف عبادت تھے اور بلا کسی تمیز کے تمام چھوٹے بڑے امیر و غریب حاکم و محکوم اور عالم و جاہل عبدیت و بندگی کے اظہار میں ایک دوسرے پر سبقت لے جا رہے تھے، جوں ہی صفا سے سعی شروع کی تو معلوم ہوا کہ پیچھے کا ریلا ہمیں بہ جور چور کر دیگا اس وقت اپنے کو خوب سنبھالا اور یہ دھکا رگئے اس کے بعد پھر ایسے شدید دھکے سے واسطہ نہیں پڑا سعی کا پورا وقت بچنے بچانے میں گذرا مگر ان حالات میں نہ تکلیف معلوم ہوتی تھی نہ ناگواری کا احساس ہوتا نہ دھکا دینے والے کے خلاف جذبہ پیدا ہوتا تھا بلکہ ایک خاص مزا ملتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ اس طرح لوگ ایک دوسرے پر گرتے رہیں یہ دھکم دھکا بالکل بے اختیاری اور اضطراری ہوتا تھا کوئی کسی کو جان بوجھ کر زحمت میں مبتلا کرنا اس مقام کی عظمت اور عبادت کے خلاف سمجھتا تھا۔

مدینہ منورہ کے شب و روز

راقم ۲۲ ذوالقعدہ (۱۳ اپریل) سے ۲۱ صفر (۱۱ جون) تک حج و زیارت کے سفر میں رہا۔ دیار مقدس میں پہلی حاضری ۱۹۵۵ء میں ہوئی تھی اس وقت جذبات و احساسات کا معاملہ کچھ اور تھا اور اب کی بار کچھ اور ہی بات تھی، ہر مقام روشناس، ہر منزل متعارف، ہر معاملہ جانا پہچانا تھا البتہ مکہ مکرمہ میں تعمیری

تبدیلیاں بالکل نئی تھیں، حرم محترم کی توسیع و تعمیر، نئے طرز کی سر بفلک عمارتیں لمبی چوڑی سڑکیں، ہرے بھرے پارک اور فوارے، دور جدید کے تمدن کی فراوانیاں بڑی حیرتناک تھیں، حرم شریف کے آس پاس کے علاقے پہچانے نہیں جاتے تھے، عزیزم مولوی خالد کمال مبارکپوری سلمہ اللہ تعالیٰ متعلم جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ مسلسل چار سال سے حجاز مقدس میں رہ کر حج و زیارت کی تمام راہوں سے اور آسانیوں سے بھی واقف ہو گئے ہیں اسلئے انھوں نے اپنے والدین کی خدمت بڑے اچھے انداز میں کی اور دیار مقدس کے یہ تین ماہ بڑی عافیت و آرام سے گذرے ۹ ر محرم سے ۱۰ ر صفر تک مدینہ منورہ میں قیام نصیب ہوا، سابقہ تعارف و تعلق کے ساتھ انکی موجودگی نے اس میں بڑی وسعت اور گہرائی پیدا کر دی تھی۔

مکہ مکرمہ میں "رابطہ عالم اسلامی" کے عہدیداران میں شیخ حسین سراج مدیر عام شیخ مالودی مدیر مجلہ رابطہ عالم اسلامی۔ اور دوسرے اہل علم سے مسلسل ملاقاتیں اور تبادلہ خیالات کے مواقع ملے کر بے تکلفی کے ساتھ ملے اور تنقید و احتساب کے انداز میں گفتگو میں رہیں، بار بار رابطہ عالم اسلامی میں آنا جانا ہوا اور اسکے اجلاس میں شرکت ہوئی، اپنے سلسلہ علمی و روحانی کے ملکی مرکز مدرسہ صولتیہ میں بار بار آنا جانا ہوا اور اس کے ارباب کار سے مخلصانہ ملاقاتیں رہیں مکہ مکرمہ کے علماء و مشائخ خصوصاً شیخ سید علوی مالکی اور الاستاد عبد العال عقبادی سے ملنا جلنا رہا، مدینہ منورہ تو کہنا چاہیے کہ بالکل گھر بن گیا تھا۔ شاید ہی کوئی علمی و دینی حلقہ ہو جس میں گذر نہ ہوا ہو، اور مختلف موضوعات پر بات چیت نہ ہوئی ہو۔ جامعہ اسلامیہ کے اساتذہ و شیوخ بڑے خلوص و محبت سے پیش آئے، حضرت شیخ عبد القادر شیبۃ الحمد استاد جامعہ محترم ڈاکٹر حلمی، استاد جامعہ شیخ سعد الدین ملہاری مدرس جامعہ اور دوسرے حضرات

نہ صرف محبت واخلاص سے ملتے رہے بلکہ اپنے حسن اخلاق سے بڑے
کریمانہ انداز میں پیش آتے رہے مذکورۃ الصدر تین حضرات نے بڑے
اعزاز کے ساتھ کھانے پر بلایا اور کئی کئی گھنٹوں تک علمی و دینی مجلسیں
ہوا کرتی تھیں اسی طرح ہند و پاک کے طلبار نے اپنے اخلاص و محبت کا اظہار
کیا بڑی عقیدت سے ملتے رہے اور ساتھ بیٹھتے تھے ان میں اکثر نے یہ اصرار انکار
کے باوجود کھانے، ناشتے اور چائے کی دعوتیں کیں، ان سب میں سنجیدگی، شرافت
اور ذمہ داری کا احساس بدرجہ اتم موجود ہے اللہ تعالیٰ ان کو اسلام اور علوم
اسلام کی سچی تڑپ دے اور مدینہ منورہ کے یہ طالب علم مدینہ کی برکتوں سے
مالا مال ہوں، کمتبہ شیخ الاسلام عارف حکمت کے محترم اراکین اور مکتبہ محمودیہ کے
مدیر ذاتی طور سے بڑے خلوص و محبت سے پیش آتے تھے، مطالعہ، کتب بینی
کے کافی اوقات ان بزرگوں سے تبادلہ خیالات میں گذر جاتا۔ جامعہ اسلامیہ
متعدد بار جانا ہوا، اسباق میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا اس کے مختصر مگر گرانقدر
کتب خانے سے استفادہ کا موقعہ ملا، یہاں کے اساتذہ کا طرز تعلیم ہمارے
یہاں سے بالکل مختلف ہے۔ ہمارے یہاں عموماً کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور یہاں
پر فنون کی تعلیم دی جاتی ہے اور کتاب سامنے رکھ کر فن سمجھایا جاتا ہے اسلئے
باشعور طلبہ کیلئے یہ تعلیم بہت ہی مفید ہے وہ کسی ایک فن کی ایک کتاب پڑھ کر اس
فن کو سمجھنے لگتے ہیں اور اس کی حقیقت ان پر منکشف ہوجاتی ہے، اسلئے یہاں
کے تعلیمی معیار میں بعض لوگوں کے کلام کرنے کے باوجود بڑی افادیت ہے اس کا صحیح
اندازہ درس میں بیٹھنے اور طرز تعلیم پر غور کرنے سے ہوا، واپسی کے موقعہ پر جدہ میں
تین دن قیام رہا اس مدت میں جدہ میں مقیم ہندوستان کے نوجوان، ارباب ذوق
کے ساتھ بڑی پرلطف مجلس رہی، جناب عبدالرحیم انصاری (بمبئی) نے بڑے
خلوص و محبت کا اظہار فرمایا اور اپنے حلقہ شعر وادب میں بڑے پرتکلف انداز

میں پہونچایا، ایک رات کھانے کے بعد کئی گھنٹے تک پُرلطف علمی و ادبی محفل
رہی اور آخر میں محترم سید شہاب الدین صاحب فرسٹ سکریٹری ہندوستانی
سفارت خانہ جدہ نے اپنے مکان پر نہایت پُر تکلف عشائیہ کا انتظام کیا اور
سعودی عرب کے جرائد و مجلات کے ایڈیٹروں، ادیبوں اور مصنفوں کو بھی
مدعو کیا یہ تعارفی محفل بہت اہم اور مفید رہی، خاص طور سے شیخ حسین سراج
شیخ محمد احمد باشمیل اور سب سے بڑھ کر الاستاذ عبدالقدوس انصاری مدیر مجلہ
"المنہل" بڑے خلوص و محبت سے پیش آئے انھوں نے فرمایا کہ وہ بہت
پہلے سے ملاقات کے خواہاں تھے، خاص بات یہ تھی کہ وہ مدرسۃ العلوم الشرعیہ مدینہ
منورہ کے طالب علم رہ چکے ہیں اور حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی اور ان
کے بھائی مولانا سید احمد صاحب سے شرف تلمذ رکھتے تھے اس لئے انکو اپنے سلسلۂ
علم کے علماء سے جذباتی تعلق ہے، دوسرے راقم کے عربی تاریخی مقالہ "من الارجیل
الی النخیل" کو انھوں نے اپنے جریدہ "المنہل" میں مسلسل چار نمبروں میں
شائع کیا تھا۔ اور راقم کی کتاب "رجال السند والہند" پڑھی تھی ان علمی
وجوہ سے ان کا جذبہ خلوص بہت ہی نمایاں اور فراواں تھا، وہ تو چاہتے
تھے بلکہ اصرار کرتے تھے کہ میں کل ۲ رجون کے آخری جہاز سے نہ جاؤں بلکہ
ماہ دو ماہ کے بعد کسی جہاز سے واپس ہوں۔

ان تمام علمی و دینی ملاقاتوں، محفلوں اور گفتگوؤں کی سب سے بڑی
وجہ عربی زبان میں بات چیت تھی کئی مشائخ اور علماء نے حیرت سے بار بار دریافت
فرمایا کہ عربی زبان آپ نے کہاں سے سیکھی ہے؟ راقم نے کہا کہ مجھے یقین
ہے کہ میں پورے طور پر صحیح عربی زبان میں بات چیت نہیں کر رہا ہو کیونکہ
ہمارے یہاں اس کا موقعہ نہیں ملتا پھر بھی کچھ کچھ زبان کھل گئی ہے،
ہمارے ہندوستانی علماء و فضلاء اگر ذرا سی جرأت دکھا کر اپنی زبان مکمل

باقی ص۱۱۲ پر

قاضی اطہر نمبر کے بارے میں

پروفیسر احتشام احمد ندوی
صدر شعبۂ عربی کالی کٹ یونیورسٹی کالی کٹ

ترجمان الاسلام کا قاضی اطہر مبارکپوری نمبر ملا۔ رسالہ معلومات سے پُر ہے، مقالات میں تنوع ہے۔ آپ کے قلم نے بھی خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔ بڑا حصہ تو آپ ہی کے قلم کا مرہون منت ہے یا اس میں آپ کی محنت شامل ہے۔

پیشہ اپنا تنقید نگاری ہے اسلئے چند امور کی طرف اشارہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔

میں تو قاضی اطہر مبارکپوری کو بحیثیت مقالہ نگار جانتا ہوں، معارف کے صفحات پر برسوں سے ان کے مقالات شائع ہو رہے ہیں۔ ان کے مقالات پر مقالہ بھی ہونا چاہئے تھا اور ایک فہرست مقالات جس سے ان کی کاوشوں کا ایک نقشہ سامنے آجاتا۔

آجکل یہ رواج ہے کہ زندگی کو سنہ وار مرتب کر دیا جاتا ہے تاکہ ایک نظر میں مصنف کی پوری تصویر نگاہوں میں آجائے۔

آئینہ در آئینہ میں آپ نے قاضی کے متعلق غیر معمولی معلومات ترتیب سے جمع کرکے انکی عظمت کو نمایاں کر دیا ہے۔ ۵۴ صفحات پر مشتمل یہ مقالہ درحقیقت قاضی صاحب کی عظمت کو واضح کرتا ہے۔

ترجمان الاسلام اور وہ بھی اہل علم و فضل کی زبان سے۔ سچ تو یہ ہے

قدیم برہان کا نعم البدل ہے ۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

فقط والسلام — نیازمند : احتشام

ڈاکٹر شمس تبریز خاں

شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ

کل ہی آپ کے موقر مجلہ ۔ ترجمان الاسلام کا ۔ مورخ اسلام قاضی اطہر مبارکپوری نمبر، موصول ہوکر باعث مسرت و تشکر ہوا ۔ فجزاکم اللہ خیرالجزاء

قاضی صاحبؒ کے تعلق سے اور آپ کی نسبت سے دو نشستوں میں ذوق و شوق کے ساتھ پورا نمبر پڑھ گیا، اور آخیر میں آپ کا اعلان دیکھ کر کہ بقیہ مضامین پھر شائع ہوں گے، تشنگی برقرار رہی بہتر ہو کہ کم از کم اسی ضخامت کا دوسرا نمبر بھی شائع ہو جائے تاکہ قاضی صاحبؒ کا کچھ حق ادا ہو سکے آپ کے مفصل ، حدیث یار ، نے بھی طلب اور بڑھا دی ہے

وحدثتني يا سعد عنهم فزدتني
شجونا فزدني من حديثك يا سعد

مضامین سب اچھے اور ضروری ہیں، مولانا ظفر احمد صدیقی، مولانا ضیاءالدین اصلاحی مولانا اعجاز اعظمی ، مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی ، مولانا نور عالم امینی ، صاحبزادہ قاضی ظفر مسعود صاحبان نے بہت اچھا لکھا ہے اور مفتی ابوالقاسم صاحب نے حضرت مفتی محمود صاحبؒ پر لکھ کر ایک فوری ضرورت کی تکمیل کردی ہے ، آئینہ در آئینہ میں بھی قاضی صاحب کی زندگی کے بڑے دلکش جلوے نظر آتے ہیں۔

اس اچھے نمبر پر آپ اور ادارہ قابل مبارکباد ہیں ۔ آپ لوگوں نے مبارکپوری نمبر کو ایک مبارک یادگار بنادیا ہے ۔ والسّلام مع الاکرام

مخلص شمس تبریز خاں۔

پروفیسر بدرالدین الحافظ
جامعہ نگر نئی دہلی

ترجمان الاسلام کا خاص نمبر ملا۔ یادآوری کا تہہ دل سے شکریہ!

ازاول تا آخر دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ خصوصی مجلہ مرحوم قاضی صاحب کے نصف صدی سے زائد پر محیط تاریخی اور تحقیقی خدمات کے شایانِ شان تو نہیں ہے لیکن پھر بھی کافی حد تک آپ نے قاضی صاحب کے تحریری سمندر میں غواصی کر کے کچھ موتیوں کو منظر عام پر لا کر سجادیا ہے اور اب صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے۔

دل صد پارہ کے قاش فروش نے خطہ اعظم گڈھ کے تاریخ سازوں کا ذکر چھیڑ کے خود میرے قلم کا رُخ موڑ دیا کہ پہلے گذشتہ بیس پچیس سال کے عرصہ میں صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے اعزاز پانے والے اعظم گڈھ بشمول مئو ناتھ بھنجن کے ان جیالوں ایک فہرست ہی یکجا کردوں جو میرے خیال میں ہندوستان کے طول و عرض میں واحد ضلع ہے جس میں مندرجہ ذیل تقریباً نو علماء، فارسی، عربی اور علوم اسلامیہ کو راشٹرپتی نے ادبی ایوارڈ سے نوازا ہے، یہ حضرات ہیں محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ مولانا شاہ معین الدین ندویؒ، مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ، جناب صباح الدین عبدالرحمنؒ، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، پروفیسر نورالحسن انصاری، پروفیسر راشد ندوی پروفیسر شعیب اعظمی اور ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری۔ اس کے بعد بات آتی ہے مضامین کے مشمولات کی تو کیا کہوں حدیثِ یار ہی نے دل موہ لیا۔ باتیں ہوں قاضی صاحب کی اور پھر بیاں ان کا۔ قاضی صاحب کا کام پہاڑوں کو کاٹ کر اپنی عظمتوں کا اہرام کھڑا کرنا نہیں تھا بلکہ وہ سخت چٹانوں کا کلیجہ چیر کر لعل و جواہر نکالنے کے قائل تھے اس کیلئے تیشۂ فرہاد کی ضرورت تھی خسرو پرویز کے شاہی فرمان کی نہیں۔ ان دو سطروں نے تبصرے کی جو گرہیں کھولی ہیں وہ دو صفحات میں بھی ممکن نہیں۔ اس مضمون میں قاضی صاحب کے سفر حیات و مصروفیات کی داستان ساغروں میں چھلکتی ہوئی

شراب، رندان بلانوش کے استقبال اور شعر ساقی ہوتی فضا کے بولتے جملوں
کے سہارے ایسی رواں دواں چلی ہے کہ شروع کرنے کے بعد زندگی کے نشیب و فراز
کام کا آغاز و انداز ۔ تاریخ کے جملوں سے گھلتا ہوا اسلوب، کھلتی آرہی ہے جہاں
ایک طرف معلومات کا ساغر لبریز ہوتا جاتا ہے وہاں اس گل افشانی کے ختم ہونے
کا ملال بھی پکار اٹھتا ہے ؎

یارب اسی طرح سے کہے جائے نامہ بر
یارب نہ اختتام کو پہونچے پیام دوست

قاضی صاحب بحیثیت مورخ و مصنف، میں فاضل مضمون نگار نے قاضی صاحب
کے کام کی خصوصیات سلسلہ وار بیان کر کے ان کی شخصیت اور تحریری انفرادیت کو
چھان پھٹک کر الگ کر دیا ہے اور یہی نہیں بلکہ نزہۃ الخواطر اور رجال السند
کا موازنہ کرنے کی ایک جرأت مندانہ کوشش نقد و نظر کا اہم قدم ہے۔

قاضی صاحب کا امتیازی وصف، میں مرحوم کی تلاش و جستجو اور بنیادی
مراجع سے موضوع کا تعین پھر اس کے لئے جد و جہد اور منزل مقصود تک پہونچنا
اس مضمون کی ایک ندرت ہے۔ محض بیانیہ وصف نگاری پر اکتفا نہیں ہے پھر
آخر میں مراجع کے تعارف نے اس کی قدر و قیمت کو اور بڑھا دیا ہے۔ آئینہ آخر
کے مختصر اور جامع قطعات و مکتوبات کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اس شخصیت
پر ایک ایک کر کے قندیلیں روشن کی جا رہی ہیں اور جوں جوں ضیائیں بڑھتی جاتی
ہیں اُجالا ہوتا جاتا ہے۔ تدوین سیر و مغازی میں فاضل مضمون نگار نے ایک اہم
کتاب پر اجمالی تعارف پیش کر کے تعارف کا معلوماتی سرمایہ فراہم کیا ہے۔ علمی کارنامہ
کی فہرست بھی قاضی صاحب کے کارہائے نمایاں رہنما اور گائڈ ہے۔ منتظمین نے بر وقت اس نمبر
میں شامل کر کے اس گوشے و شخصیت کا موقع فراہم کیا ہے ورنہ یہ قارئین سے نا آشنا ہی تھا۔
شذرہ پر ڈاکٹریٹ کے لفظ نے مضمون نگار کے وزن کو ہلکا کر دیا ہے ورنہ

مضمون کوئی ایسا بے وزن نہیں ہے۔
مجموعی لحاظ سے ادارہ ترجمان الاسلام کی یہ کوشش قابلِ ستائش ہے۔

بدرالدین
جامعہ نگر نئی دہلی

ص ۸۲ کا بقیہ :

کہ نیسا پور بغداد دمشق بیروت اور مصر جیسے دور دراز مقامات کا تنہا سفر کیا اور وہاں کے علمی خزانوں سے اپنا دامن بھرا۔

اس طرح کتاب حیرتناک مگر مستند معلومات تاریخی حوالوں سے ہمارے سامنے پیش کرتی ہے اور اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے اپنی امتیازی خصوصیات رکھتی ہے۔ کتاب کے مطالعہ کے بعد اس کی عظمت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا، ہندوستان کے تذکرہ نگاروں کے لئے یہ کتاب بنیادی اور مستند ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ص ۱۰۰ کا بقیہ

کرلیں تو عرب علماء کی محفلوں میں بہت جلد اپنا لوہا منوا سکتے ہیں کیونکہ وہ اہل علم کے بہت قدرداں ہوتے ہیں ان کی طبیعت میں بڑا سلجھاؤ ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض ہندوستانی علماء عربی میں بات چیت اور تقریر کی وجہ سے کافی مقبولیت حاصل کئے ہوئے ہیں جب کہ ان سے اونچے حضرات اپنی خاموشی کی وجہ سے احساس کمتری میں مبتلا ہیں اور وہاں کے اہل علم سے ملنے جلنے سے کتراتے ہیں۔